

29  
22  
15

61

لحم

سلا کتول

11

۳ "محترمہ مس سیمیں گل صاحبہ کہاں تشریف فرما ہو۔؟"

"جی آئی۔"

"بھئی ذرا جلدی سے آنا۔"

"بس ابھی آئی دو منٹ میں۔"

وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ لان میں بڑے خوبصورت رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ سیٹی بجا بجاکر انہیں دیکھنے لگا اور سیمیں کا انتظار کرنے لگا۔

"کیا بات ہے محترمہ کیپٹن عاطف محمود صاحب۔ مجھے کیوں یاد فرمایا ہے؟"

عاطف مکراتے ہوئے پیچھے گھوما۔

"بدلہ بہت جلد آتا رہی ہو۔"

"تو کیوں نہ آتا رہوں۔" سیمیں شوخی سے بولی۔

"آپ ہی کی بہن ہوں۔"

"پکی بات ہے ناکہ میری بہن ہو۔"

"تو اس میں شک ہے کوئی۔؟"

"شک اس لیے پڑ جاتا ہے کہ جب لڑائی ہوتی ہے تو تم سب ناٹے توڑ لیتی

ہو۔" عاطف نے مہین سی آواز نکالتے ہوئے اس کی نقل اتاری۔

"جائیے میں کوئی نہیں آپ کی بہن۔"

"اور آپ بھی تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ آج سے دوستی ختم۔!"

”آپ کے اعزاز میں دوپہر کے کھانے پر لچھ چیزیں میں آج اپنے ہاٹھے  
تیار کر رہی ہوں۔“  
”اوتے ہوئے مارے گئے پھر تو۔!“  
”کیا مطلب۔؟“

”مطلب صاف ظاہر ہے۔“ عاطف گردن جھکا کر سر کو کھٹانے لگا۔  
”کسی ہٹل کو رونق بخشنا پڑے گی۔“  
”یہ بات ہے۔ تو بس پھر ٹھیک ہے۔“ حلیم، شامی کباب اور مرغ منٹو  
آج شام میں اپنی سہیلیوں کو دعوت میں یہ سب کھلا رہی ہوں۔ آپ جانیں ہٹل میں  
سیمیں بازو چھڑا کر جھاگی۔  
”ارررے۔! سنو تو۔“  
”بائی بائی۔ ٹا۔ ٹا۔ ٹا۔“ سیمیں  
ہو گئی۔

”اب کیا کیا جائے۔؟“ عاطف سوچنے لگا۔  
آج توجہ کا بڑا ہی بور ہو رہا تھا۔ کتنی بار سیمیں سے کہا تھا کہ اتوار کو ایسے  
پروگرام نہ رکھا کرے۔ مگر وہ باز ہی نہیں آتی تھی۔  
اور سیمیں بیچاری بھائی کی محبت سے مجبور اپنی اتوار ضائع کر ڈالتی تھی۔ میس  
کے کھانے کہاں گھر جیسے ہوتے ہیں۔ مال اور بہن کو اس کا بہت احساس تھا۔  
اتوار کو سیمیں باورچی خانہ سنبھالتی اور باقی دن مال اپنے بیٹے کے لیے خود کھانا  
بناتی۔ حالانکہ گھر میں خانا مال موجود تھا۔ مگر مانتا کے جذبے کو تب ہی تسکین ملتی  
جب اس کے لیے خود کچھ تکیف اٹھاتی۔ کتنی راحت بخشی تھیں یہ اولاد کے لیے

”ذرا بھائی جان کو سمجھائیں۔ دیکھئے کیا کیا کیے جا رہے ہیں۔“  
”منذوع ہو گئی نا لڑائی بھڑائی۔ ارے سیمیں تم ہی بڑے بھائی کا کچھ لحاظ کرو  
لیا کرو۔ چند دن سکون کے گزارنے کے لیے وہ گھر آتا ہے اور تم اسے ایک پل  
سکھ کا سانس نہیں لینے دیتی۔“  
مال کی بات سنئے ہی عاطف سیمیں کی جانب دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔  
”ہائے امی! آپ بھی مجھے ہی دوش دینے لگیں۔“ سیمیں رو دھانی ہوتے ہوئے بولی  
”بیچاری لڑکیاں بڑی ہی بڑبڑاتی ہوتی ہیں۔“ اور پھر خفا ہو کر دھپ دھپ  
پاؤں پٹختی مھرے سے باہر چل دی۔ کلف نے بھاگ کر پیچھے سے اسے تھام لیا۔  
”اونہول! میدان چھوڑنا۔! ام ہے۔ ہم فوجی یہ برداشت نہیں کر سکتے۔“  
”میں آپ کے مقابلے میں پوری نہیں اتر سکتی۔“ سیمیں نے اسی  
روٹے روٹے انداز میں کہا۔

”اس لیے اپنی عزت برقرار رکھنے کے لیے میدان چھوڑنا ہی بہتر ہے۔“  
عاطف نے سچ سچ سیمیں سے دیکھا تو خود ہی ہتھیار ڈال دیے۔  
”اچھا بھئی اب لڑائی نہیں کروں گا۔ یہ دیکھو کانوں کو ہاتھ لگا کر اعتراف کرتا  
ہوں کہ تم اتنی حسین ہو۔ اتنی حسین و جمیل کہ عالمی مقابلہ حسن میں شامل ہو جاؤ تو مرس  
عالم آرا کہلانے لگو۔“

سیمیں کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔  
”صلح ہو گئی نا۔؟“ عاطف نے پوچھا۔  
”ہاں۔ اور اب ذرا بیٹھے جانے دیجئے۔“  
”کہوں۔؟“

”دوستی ہی ختم کرتا ہوں نا۔ خون کا رشتہ تو نہیں۔ اور دوستی تو ہوتی ہی ہے

وقت موقع پڑنے پر دشمنی میں بدلنے کے لیے۔“

”چھی۔ چھی۔ ایسی دوستی کے ہم قائل نہیں۔ دوستی تو اتنا پیارا اور پاک رشتہ ہے کہ کوئی اور ہوگا نہیں۔“ سمیں عاطف کے قریب چلی گئی۔ ”اگر دوستی کے متعلق آپ کے خیالات یہی ہیں تو آج سے ہم دونوں صرف بہن بھائی ہیں دوستی دوستی ختم!“

”سمیں! عاطف! یہ تم دونوں شاید پھر کوئی بحث چھیڑے بیٹھے ہو۔“

برآمدے سے امی کی آواز آئی۔

”ابھی پھر لڑا پڑوگے۔ میں نے چھوٹے چھوٹے بے سمجھ بچوں کو ہر وقت

لڑتے دیکھا تھا مگر ہمارے گھر کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ بچپن میں لڑے نہیں اور اب جوان ہو کر ساری کسریں نکال رہے ہیں۔“

”امی! بحث نہیں کر رہے اور نہ ہی اس کے بعد آج میرا کوئی لڑائی کرنے کا

ارادہ ہے۔“ عاطف مکرراتے ہوئے بولا۔

سمیں بھی مکرراتی اور دھیرے سے بولی۔

”سچ کہہ رہے ہیں۔؟“

”ہاں۔“

”تو لائیے ہاتھ۔“ سمیں نے بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔

”اور اب مجھے یہ بتائیے کہ مجھے کیوں اتنے زور شور سے بلایا جا رہا تھا۔؟“

”تمہیں معلوم ہے میں کتنے دنوں کے لیے گھر آیا ہوں۔؟“

”پورے تیس دن کے لیے۔“

”اور کتنے دن گزر گئے۔؟“

پانچ اوپیس دن ابھی باقی ہیں۔ جلد ریس بہت ہیں۔  
”ساتھ ماشاء اللہ بھی کہو۔ تمہاری نظر بڑی خراب ہے۔ بہت جلد ملتی ہے۔“  
”دنوں کو بھلا کیسے نظر لگ سکتی ہے۔؟ کوئی چوری کر لے جائیگا کیا۔؟؟“  
”بے شک چوری نہیں ہو سکتے مگر پڑ لگا کر تو اڑ ہی سکتے ہیں نا۔ اور میں چاہتا ہوں یہ مہینہ طویل سے طویل تر ہو جائے کتنے کتنے عرصے بعد تو کہیں جا کر اپنی امی کی پیاری پیاری شکل اور تم چڑیل کی بھیانک صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔“  
”آں بھیانک۔! آپ سے تو کہیں اچھی ہے۔ آئینہ دیکھ لیجئے بے شک۔“  
”میں کیوں دیکھوں۔ تم دیکھو۔ مجھے تو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کیا ہوں۔؟“  
عاطف زیر لب مسکرا رہا تھا۔

”جب دروی پہناتا ہوں تو تم ہی بے اختیار ماشاء اللہ اور انشاء اللہ اور بخانے کیا کیا کہ اُٹھتی ہو۔“

”بڑا مان ہے اپنی شکل و صورت پر۔؟“

”مان کیا ہوگا۔ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ قدرت کی تخلیق کی تعریف کرنا بھی ایک عبادت ہے۔“

”واہ وا۔ کیا کہنے۔!!“ سمیں بڑے میٹھے انداز میں بولی۔

”تو یہ عبادت قدرت کی دوسری تخلیقات کی تعریف کر کے بھی کبھی کبھی کر لیا کیجئے۔“ ساتھ ہی اس نے اپنی جانب اشارہ کیا۔

”تم چڑیل کی۔؟ کیوں گناہگار کر رہی ہو۔“

”امی! امی!!“ عاطف تو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ سمیں نے نچر ہو کر ماں کو مدد کے لیے پکارا۔



اٹھائی گئی چھوٹی چھوٹی تکلیفیں — !!

عاطف سوچ سوچ کتھک گیا۔ وقت گزارنے کا کوئی اور طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔  
کتنا سارا انگٹنا بھی چکا تھا۔ بے شمار گرہٹ بھی پی ڈالے تھے۔ تھوڑی سی راک این بول  
کی پکٹس بھی کی تھی۔ پھر قالین پر کچھ قلا بازیاں بھی لگائی تھیں کہ چھٹیاں گزارنے کے  
بعد جب فوج کی کمپن ڈیوٹی پر واپس جائے تو بالکل ہی سست نہ ہو چکا ہو۔

اچانک کچھ سوچا۔ آنکھیں چمکیں۔ ہنٹوں سے بے اختیار سیٹی بچ اٹھی۔  
آج سیمیں کو باورچی خانے میں تنگ کیا جائے۔! گھر آکر اس کا سب سے پسندیدہ  
مشغلہ سیمیں کو تنگ کرنا ہوتا تھا۔

وہ بے پادوں باورچی خانے میں پہنچ گیا۔

”ارر رے! اتنی گرمی کہ چھوڑی ہے۔ کہو تو تمہارے لیے یہاں ایرکٹڈ شیئر

لگوا دوں۔ دیکھو تو کیسے پسینہ پسینہ ہوتی جا رہی ہو۔“

سیمیں مکرانی۔ جانے کیا بات تھی۔ اتنا تنگ کرتا تھا مگر پھر بھی جب سامنے  
آ جاتا تو دل دماغ روشنی سے ہلٹتے۔ اس کا دراز قد، چوڑا چکلا سینہ اور سانولی  
سانولی سی پرکشش صورت دیکھ کر گردن فخر سے تن سی جاتی۔

وہ اس کا بھائی تھا۔! اس کا اپنا خون۔! اتنا سمارٹ اور اتنا لائق۔!!

قابل فخر ہی بات تھی۔

”یہ سوچنے اس کے لیے اٹھا رکھیے۔ ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں۔“ مکرانے ہوئے بولی۔

”کس کے لیے۔؟“

”مہی۔ جس بے چاری کی قسمت آپ کے ساتھ پھوٹے گی۔“ سیمیں

نے ٹھنڈی آہ جہری۔

”بیچاری! مجھے بڑا ترس آتا ہے اس پر۔“

”اور مجھے اس بچے کے پر ترس آتا ہے جسے اکثر و بیشتر ایسے بد واقفہ کھلنے

پڑا کریں گے۔“

یہ بچپنوں پر سے ڈھکنے اٹھا اٹھا کر ان کے اندر جھانکتے ہوئے اور لمبے لمبے

سانسوں کے ذریعے ان کی اشدنا انگیز خوشبو تھنوں میں چڑھاتے ہوئے بولا۔

”بائے بیچارا۔!“

”بھائی جان! مہربانی فرما کر یہاں سے تشریف لے جائیے۔“ سیمیں!

بازو سے پکڑ کر باہر کی جانب دھکیلتے ہوئے بولی۔

”اچھا اچھا بھئی اب ایسے نہیں کہوں گا۔ یوں بے آبرو کر کے تو نہ نکال

لگاتے ہیں کانوں کو ہاتھ۔؟“

”ہاں۔ اور اب یہ کہوں گا کہ مجھے اس پر بالکل ترس نہیں آتا۔“

”عاطف! کہاں ہو عاطف۔؟“ ماں کی آواز پر بات اڑا

سیمیں مکرانے لگی۔

”جی امی۔!“

”تم باورچی خانے میں کیا کر رہے تھے۔“

”کچھ نہیں امی۔ سیمیں کہتی تھی کہ اکیلی کام میں لگی ہوئی ہے۔ لایا۔

سے ہواؤ۔“

”مگر بیٹے! وہاں گرمی ہے۔“

”گرمی ہے تو کوئی بات نہیں۔ سیمیں کی باتیں اللہ کے فضل سے کافی ٹھنڈی

پہنچانے والی ہوتی ہیں۔“

اتنی مسکرا پڑا اور وہ واپس باورچی خانے میں چلا گیا۔

”اتنی کیا کہتی تھیں؟“ سیمیں نے پوچھا۔

”کہتے تھیں۔ اس نمک پڑھی چڑیل کے پاس نہ جاؤ۔ مزاج بھی گرم اور باورچی خانہ گرم۔ جل جاؤ گے۔ جھسم ہو جاؤ گے۔ کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔“

”توبہ! توبہ!! توبہ!!!“

”یہ بھلا کوئی جواب ہے میری بات کا۔“

”ہم ایسی دراز زبان کہاں سے لائیں جو آپ کی بات کا جواب دے سکے۔ ایسے توبہ ہی بھلی۔“

”تمہاری زبان کی درازی کا مجھ سے زیادہ کسے علم اور تجربہ ہو گا۔ ناپ بتاؤ؟“

”بھرتاتے رہیے گا۔ پہلے ذرا حلیم کا نمک تو چکھیے۔“

لگوادوں گا ضرور۔ مگر نمک و مک کا پتہ مجھے نہیں چلتا۔“ جلدی سے پلٹ

سیمیں کو چٹخارے لے لے کر کھانے لگا۔

”آجانا تو دل ہے؟“

”سانو لیو۔ ویسے جیسا بھی ہے لوجھا ہے۔“

وہ از رنگی میں پہلی بار اس نے اس کی کسی چیز کی تعریف کی تھی۔ سیمیں حیران

قابلِ فخر ہوئے دیکھنے لگی۔

”جوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو۔ کوئی عجب نہیں ہوں۔“

”اس وقت تو مجھے عجب ہی لگے ہیں۔“

”پتنی غلطی ہے دوست۔ اچانک ہی زبان پھسل گئی تھی۔“

بیلٹ خالی کرتے ہوئے زندیوں کی طرح دوسری چیزوں کو دیکھنے لگا۔

”باقی کھانے کی میز پر۔ ایسے بھوک غراب ہو جائے گا۔“

”اتنی اچھی اور اتنی ڈھیر ساری چیزیں بنائی ہیں تم نے۔“ وہ ہنٹول ہی

ہی کر لیتیں۔ کسی پر احسان تو پڑھتا۔ اور یوں بھی کچھ دیتا۔

گھما گھمی ہو جاتی۔ تم زری بدھو ہو۔ گھر گرہتی کے ار

”سچ بھائی جان! آپ کی بات سے یاد آیا۔“

”مجھ سے پارٹی ٹانگ رہی ہیں۔“

”کیا انہیں اپنے گھر کچھ کھانے کو نہیں ملتا۔ بد نہیں۔“

”نہیں۔ یہ بات نہیں۔“ سیمیں جھجھکے

”وہ۔ آپ کیسٹیں ہو گئے ہیں نا۔“

”انہیں کس نے بتایا۔؟“

”میں نے خود بتایا تھا۔ کیا کم خوشی کی بات۔ میرے سے بولا۔“

”سیمیں! کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے کہ یہ لگائی بچھاؤ

اکثر خراب کرتی ہے۔“

”ہائے بھائی جان! آپ بات تو نہیں۔“

”ناؤ۔ سناؤ۔ عورتوں کا کام ہی ہے سنانا

سننے کے لیے ہی بنے ہیں۔ اللہ ان کے کانوں کی خیر۔

”پلیز! ذرا سنجیدہ ہو جائیے۔“

”کیا بالکل ہی فاقول مر رہی ہیں۔“

”اُن میرے خدا۔!“ سیمیں جھنجھی

”سے کر اندر بلا لیا۔“

”کے کالج سے ہوا۔“

”اب دیکھو نا

”نہ میں تو ایسا

”آپ تو بھائی جان! بالکل ہی اس قابل نہیں کہ آپ سے کوئی دُکھ در

یہ نام ہے اس کا؟

”لالہ —!“

”ماں کا بھی لالہ اور بیٹی کا بھی — کتنی عجیب بات ہے —“ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا —

”شاید نیفاشن رکھا ہے — لالہ کی بچی — لالہ —!“

”یہ میں نے کب کہا کہ اس کی ماں کا نام لالہ ہے —؟“

”خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ لالہ کی بچی کی امید نہیں —“

”خدا آپ کو سمجھے بھائی جان! آپ تو دوسرے کو پاگل کر کے رکھ دیتے ہیں۔“ وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی —

”مہربانی فرما کر اب یہاں سے تشریف لے جلیے۔“

”اچھی بات —“ باہر جاتے جاتے دھیرے سے بولا —

”اور وہ دعوت —!“

”وہ تو اب ہوگی — اور کل ہی — آپ زبان دے چکے ہیں —“

”یہاں اس کھجنت زبان کا —!“ عاطف اپنی زبان کو کوتاہا ہوا باورچی خانے

سے باہر نکل گیا —

اتنی کے حجرے کے سامنے سے گزرا تو انہوں نے آواز دے کر اندر بلا لیا۔

”عاطف! تمہیں پرسوں سے کہہ رہی ہوں کہ کسی دن ندیم کے کالج سے ہواؤ۔

تمہارے ابا اکثر دوسرے پر رہتے ہیں اور ندیم عادتاً ذرا منچلا ہی ہے۔ اب دیکھو نا

تقریباً ہر اتوار کو اس کی پینک پارٹی ہونے لگی ہے۔ تمہارے زمانے میں تو ایسا

نہیں ہوتا تھا۔ مجھے خدشہ ہے کہیں جھوٹ تو نہیں بول دیتا —“

”اتنی مسکرا پڑیں —“

”اتنی کیا کہتی؟ باراض نہ ہو — بتاؤ کیا پرابلم ہے —؟ یہی نہ کہ اتنی دعوت نہیں

”کہا کہ کتنی تھیں — اس کی طرح کھل گیا — ہمیشہ ایسے ہی ہوا کرتا تھا — ماں تو اس کی

”کرم — جل جاؤ گے — جسم ہو — سے تنگ آپہنچی تھی — اس لیے اجازت نہ دیتیں۔

”تو بہ! تو بہ!! تو بہ!!!“ میں گھر آتا، سمیں کی موج ہو جاتی — اگر ایک ہفتے

”یہ بھلا کوئی جواب ہے میں میں ہی، دیتیں بارائیں مدعو کر ڈالتی —

”ہم ایسی دراز زبان کہاں سے کی جیب میں ہوتا — جانے کیوں سمیں کو دعوتیں کئے

”تو بہ ہی بھلی —“

”تمہاری زبان کی درازی کا مچھی بھی کسی کے ہاں نہیں جاتی تھی — اسی لیے اتنی چڑ

”بھرتا تے رہتے گا — پیدائی کی کھانی فالتو نہیں تھی —

”لگو اوول — کا ضرور —“ گرنک — اری تھی کہ ایک بار منہ سے جو نکال دیتی دوسری

”سیمپل کر پٹھارے لے دیتا —“ وہ لٹتی جاتی اور یہ منس منس کر لٹتا جاتا!!

”سیمپل کر پٹھارے لے دیتا —“ وہ لٹتی جاتی اور یہ منس منس کر لٹتا جاتا!!

”آج اتنا تو دل ہے —؟“

”وہ لڑنگی میں پہنچے —“

”وہ لڑنگی میں پہنچے —“

”قابل فخر ہوئے دیکھنے لگاں کی سب تو نہیں —“

”جوں دید —“

”اس وقتے طلب —؟“

”اپنی غیر طلب ہے — سب کی سب ہی آئیں گی —؟“

”اپنی تو ابی جائیں گی مگر اس لالہ کی بچی کی مجھے امید نہیں —“

”اچھا اتھی! کل ضرور جاؤں گا۔“

”ہاں بیٹے! ضرور جانا۔ ایسا نہ ہو آوارہ لڑکوں کے ساتھ یا رانہ کاٹھ لیا ہو اور پھر ان پکنک پارٹیوں کا نتیجہ نکلے۔“  
 ”توبہ! اولاد کی ذمہ داریاں نبھانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔“

”ویسے ندیم کی پچھلی رپورٹ کیسی رہی تھی۔“

”بس درمیانی تھی۔ اور مجھے تمہارا سپکا پڑا ہوا ہے۔ اسی لیے تو کہتی ہوں جا کر

معلوم کرو۔“

”آپ فکر نہ کریں اتھی! ان شاء اللہ ٹھیک ہی رہے گا۔“

”یہ تم دونوں نے گول گھرے میں کیا طوفان مچایا ہوا ہے سیمیں اور عاطف۔“

”امی! ہم صفائی کر رہے ہیں۔“ جواب میں عاطف بولا۔

”تم صفائی کر رہے ہو۔!“ امی متحیر سی ہو گئیں۔

”اور سب ملازم کہاں چلے گئے۔؟“

”ان کے کام سے سیمیں کو تسلی نہیں ہوتی۔ اس لیے آج کے دن اس

نے مجھے ملازم رکھ لیا ہے۔“

سیمیں بھائی کی جانب دیکھ کر مسکراتی۔

”مگر آج خاص بات کیا ہے۔؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔“

عاطف نے سیمیں کی جانب دیکھا۔ مال کے اس سوال سے وہ کچھ سہم گئی تھی

وہ مسکرایا۔ ”آج میں نے اپنے کچھ دوستوں کو کھانے پر بلایا ہے امی۔“

”تو آج تمہیں کی گدی پر تم بیٹھ گئے ہو۔“ اب ماں کا لہجہ نرم تھا۔

”ارے! آپ نے اپنے دوستوں کا کیوں کہہ دیا۔ امی نے کہیں چلے تو جانا نہیں

پھر جب میری سہیلیوں کو دیکھیں گی تو زیادہ ناراض ہوں گی کہ جھوٹ کیوں بولا۔ یہ

آپ نے کیا کر دیا۔؟“

”فکر کیوں کرتی ہو۔ امی سے کہ دوں گا کہ آج میرے دوست فینی ڈریس

میں آئے ہیں۔“ دونوں بہن بھائی زور سے ہنس پڑے۔

”ویسے تمہاری سہیلیاں آتی بھی تو عجیب و غریب حلیوں میں ہیں۔ لباس پہنتی

ہیں تو وہ عجیب عجیب اور شکلیں ہوتی ہیں تو وہ عجیب عجیب۔!!“

”میں نے کتنی بار آپ کو کہا ہے کہ کسی کی شکل میں عجیب نہیں ڈالا کرتے۔ اللہ بڑا

ناراض ہوتا ہے۔“

”توبہ! توبہ!! میں کوئی کسی کی شکل میں عجیب ڈال رہا ہوں۔“ کانوں کو چھوتے

ہوتے عاطف بولا۔

”آپ نے کہا نہیں کہ شکلیں عجیب ہوتی ہیں۔“

”میرا مطلب تھا کہ شکلیں تو ٹھیک ہوتی ہیں البتہ انہوں نے بانی بڑی عجیب ہوتی

ہیں۔ کسی نے سرمہ اس انداز میں لگایا ہوتا ہے کہ بالکل چڑیل ناکوئی چیز لگ رہی ہوتی ہے۔ پھر

مسکرایا۔ ”اور کسی نے بالوں کا سٹائل یوں بنایا ہوتا ہے جیسے سر پر کسی بے کا گھونسلہ

کرا آئی ہو۔ اور کوئی باتیں ہی یوں منہ پیڑھا کر کے کرتی ہے کہ اچھی بھلی صورت بگڑ

کر رہ جاتی ہے اور پھر یوں سب ہی چڑیا گھر کی غنوق معلوم ہوتی ہیں۔“

”کبھی اپنے دوستوں کو بھی آپ نے غور سے دیکھا ہے۔؟“ سیمیں بڑا مانتے

ہوئے بولی —

۱۶

”ان دوستوں کو جو آج فیمنی ڈریس میں ہمارے ہاں آرہے ہیں —“  
عاطف کی بات پر سیدہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اور پھر دونوں بہن بھائی قہقہے لگانے لگیں۔  
”آپ باتوں میں لگ کر بڑی ٹھیک طرح ترتیب نہیں دے رہے۔ وہ دیکھئے  
اس صوفے کا کونہ ذرا ٹیڑھا ہے۔“

”ابھی ٹھیک ہوا جاتا ہے بی بی جی —!“ عاطف جاکر اسے ٹھیک کرنے لگا۔  
اور سیمیں ہنسنے لگی —

”سیمیں —!“ ٹھیک کرتے کرتے وہیں سے بولا —

”کیا وہ لالہ کی کچی لالہ بھی آرہی ہے —؟“

”اس کا نام صرف لالہ ہے بھائی جان! لالہ سُرخ!!“ سیمیں زیر لب مکرانی۔  
— ”شادی آہی جائے — میں نے تاکید تو بہت کی تھی۔ مگر امید کم ہے۔“

”کیوں — امید کیوں کم ہے —؟“

”کالچ کے وقت کے علاوہ وہ کبھی کبھی نہیں جاتی —“

”اور کالچ کے وقت میں جہاں دل چاہے گھومتی پھرے —؟“

”نہیں تو —“ سیمیں پھول دان سجا کر سیدھی ہوئی اور تنقیدی نگاہ سے سائے

گھرے کا جائزہ لینے لگی —

”بلکہ دوسری لڑکیاں خالی گھنٹے میں کہیں چلی جاتی ہیں — گردہ اس وقت

کہیں نہیں جاتی۔ بس گھر سے کالچ اور کالچ سے گھر —!“

”سٹرل ہوگی —؟“

”ایسے ہی سٹرل ہوگی — اس کی طبیعت تو بے حد پیاری ہے۔ شرمیلی

سی اور ہر دم مسکراتی ہوئی۔“ پھر چوٹی —

”لیکن آپ کیوں اتنی تفصیل سے پوچھ رہے ہیں —؟“

”بھئی اس لیے کہ جوان ہوں — شادی کی عمر ہے۔ اب تک ماں بہن نے کچھ

یانہیں — خود ہی ہاتھ پاؤں نہ ماروں تو اور کیا کروں —!“

”ہوں! تو یہ بات ہے —“ سیمیں نے قہقہہ لگایا مگر دوسرے ہی لمحے ایک دم

بغیدہ ہو گئی —

”ارے بھائی جان! سچ تو ہے۔ لالہ ہے کچی اسی قابل کہ آپ جیسا نالائق شخص

س کے پتے باز دیا جائے۔ جوڑی اچھی رہے گی۔“

”خواہ خواہ ہی —“ عاطف بخندگی سے بولا —

”خیر وار! ایسی کوئی بات نہ کر بیٹھنا۔ ابھی میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

تھک کر قالین پر لیٹ گیا —

”تو جناب کب شادی کریں گے۔؟ جب بوڑھے ہو جائیں گے۔؟“

سیمیں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی —

”عاطف!“ اُمی اسے پکارتے ہوئے اندر آگئیں۔ ”ہو چکی صفائی؟“

”جی اُمی —!“ عاطف جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا —

”میں نے نہیں کل بھی کہا تھا کہ ندیم کے کالچ جانا۔ مجھے اس کا بڑا فکر رہتا ہے۔“

”اُمی! میں آج گیا تھا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ٹھیک ٹھاک جا رہا ہے۔“

”اللہ تیرا شکر ہے۔ ورنہ مجھے تو بڑا فکر تھا۔ یہ عمر بڑی نازک ہوتی ہے۔“

”جانے کیوں والدین اولاد کے معاملے میں اتنے کم حوصلے کے مالک ہوتے ہیں۔“

سیمیں دھیرے سے بڑبڑاتی —

”تمہارا وقت آئے۔ سب سمجھ جاؤ گی۔“ ماں نے سن لیا تھا۔

سیمیں خفیہ سی ہو گئی اور عاطف اسے سنا سنا کر کچھ گلگانے لگا۔

”کب ہے دعوت تمہارے دوستوں کی؟“ انی نے عاطف سے پوچھا

”تم بتاؤ سیمیں!“ عاطف مسکرایا۔

”جی۔ جی۔“ سیمیں ہرکلا کر رہ گئی۔

”دعوت تمہارے دوستوں کی اور بتائے سیمیں!“

”اوہ! ہاں۔ آج ہی ہے۔“

”صحیح بات انی کو بتا دیجئے پھانی جان۔!“ سیمیں عاطف کے پاس ہی بیٹھی

تھی بہت دھیرے سے کہنے لگی۔

”وہ انی۔!“ عاطف بولا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ آج کی دعوت میں

میرے دوست خود نہیں آرہے بلکہ ان کی سہیلیاں آئیں گی۔“

سیمیں کا قہقہہ چھوٹ پڑا۔ ہمیشہ عجب بے مکی بات کیا کرتا تھا۔!

”کیا۔؟“ انی کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ ”دوستوں کی سہیلیاں۔ کیا مطلب؟“

وہ کچھ حشاشی ہو گئیں۔

”تم مجھ سے سیدھی طرح بات کیا کرو۔“

”انی! سیدھی ہی تو بات کر رہا ہوں۔“

”یہ سیدھی بات ہے۔؟ دوستوں کی سہیلیاں۔!“ پھر کچھ سوچ کر چونگیں

”میں کہے دیتی ہوں عاطف! کہ اس گھر میں ایسی کوئی فضول حرکت نہ ہوگی۔

یہ میرا گھر ہے۔ شریفوں کا گھر۔ کوئی کلب یا ہوٹل نہیں ہے۔ کہ اب فوجیوں کی

سہیلیاں منہ اٹھانے چلی آئیں گی مجھے اسی لیے تمہارا فوج میں جانا پسند نہیں تھا۔

وہ تو تمہارے باپ نے۔۔۔۔۔“

”مگر امی! پہلے میری پوری بات تو سن لیجئے۔“

”میں کچھ نہیں سنا چاہتی۔“ وہ اٹھ کر ٹپڑاتے ہوئے باہر چل دیں۔

”جرحی میں آتا ہے کرتے ہیں۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں جاتا۔ یہ تو میں کہتی

بھی نہ ہونے دوں گی۔“

”امی!“ سیمیں سہمی سہمی سی جا کر ان کا راستہ روک کھڑی ہو گئی۔

”وہ تو آج میں نے اپنی سہیلیوں کو مدعو کیا ہوا ہے۔“

”کیا۔؟“

”ہاں امی۔! بھائی جان کے کیپٹن ہونے کی خوشی میں۔“

”تو پہلے ہی کہہ دیتا تھا۔“ انی ہنستے ہوئے پھر بیٹھ گئیں۔

”تم بہن بھائی ملی کر مجھ سیدھی سادی کو بہت تنگ کرتے ہو۔“

”امی! آپ سے سیمیں ڈر رہی تھی اس لیے میں نے اپنے دوستوں کے سر

سب کچھ تھوپ دیا۔“

اسی اشارہ باہر بہت سارے قدموں کی چاپ ہوئی۔

”اسلام علیکم۔!“ پھر کورس کے انداز میں آواز گونجی۔

”یا وحشت۔!“ عاطف ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سیمیں دروازے کی سمت پلکی۔

رفوعلہ کی لڑکیوں نازی، جبین اور صانعہ نے دیں اسے دبوچ لیا۔ عاطف

حیرت سے دیکھ ہی رہا تھا کہ انظر آکر اس سے پٹ گیا۔

”رفیعہ کہاں ہے نازی۔؟ کیا وہ نہیں آئی۔؟“ انی نے پوچھا۔

”وہ کیسے نہ آئیں۔ ہر وقت تو رفیعہ آپا! رفیعہ آپا ہوتی رہتی ہے۔ باہر سامان



۲ وغیرہ اترا رہی ہوں گی۔“ بہن کی چاہرت نے اور بھی بے چین کر دیا۔ اٹھ کر باہر بھاگیں۔

صاحفہ اور جین سمیں کو چھوڑ کر عاطف کے گرد ہو گئیں۔

”پرے ہٹو چڑیلو! اوپر ہی لدی آ رہی ہو۔“

”مائے بھائی جان! آپ کی چھٹی اکٹن کر تو ہم آتے ہیں پر س! بڑی مشکل سے اتنی کوراضی کیا ہے۔ اور پھر دو مہینے کی چھٹیاں بھی ہو گئیں۔“

”تو گویا پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ ہے۔“

”ماشاء اللہ زبان پر بھی فوجی اثر غالب ہے۔“ اظفر ادھر ادھر ٹپٹی ٹپٹی کر آرائش کی چیزیں دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم اظفر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ کچھ خراب نہ کرنا۔ آج شام میری سیلیوں کی دعوت ہے اور ابھی ابھی ہم اس کمرے کو ٹھیک کر کے بیٹھے ہیں۔“

”آہا! پھر تو ہم بڑے وقت پر آئے۔ آج کی دعوت کا مینو کیا ہے؟“

”کچھ بھی ہو۔ تم شہر کو تو میں کبھی بھی نہ بتاؤں۔“

”چلو اچھا مینو نہیں بتاتیں تو یہ تو بتا دیں کہ دعوت کس سلسلے میں ہے۔؟“

”وہ اس لیے۔“ سمیں کے جواب دینے سے پہلے ہی عاطف جلدی سے بولا۔

”کہ اس کی سیلیاں بیچاری اتنی غریب ہیں۔ اتنی غریب کہ کبھی کبھی ان کے گھر میں کھانا بھی نہیں پکنا۔ پھر سمیں کو ان فاقہ زدوں کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔“

”تو پھر تو ذال روٹی ہی کتنی چاہئے۔ میں ابھی جا کر خانہ ماں کو کہہ کے آتا ہوں۔“

”خبردار اظفر! باورچی خانے میں نہ جانا۔“ سمیں نے بھاگ کر اس کا بازو

تھام لیا۔

”بھیا! تم نے آتے ہی پھر میں آپنی کوتنگ کرنا شروع کر دیا۔ میں جا کر اتنی کو بتاتی ہوں نا۔“ صاعقہ اٹھ کر بھاگی۔

”تم چنل خور کا اور کام کیا ہے۔؟ ادھر ادھر سوکھتی پھرتی ہو۔ جہاں کہیں چنل ملی۔ لے کر بھاگیں۔“

”ارے! رفوخالہ کو تو میں ابھی تک ملی ہی نہیں۔ وہ بھی ادھراتی کے پاس ہی بیٹھ رہیں۔ آؤ نازی۔! ہم ادھر چلیں۔“ سمیں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جاؤ۔ جاؤ۔ سب بھاگو یہاں سے۔ پھر مجھے اور بھائی جان نے بھی دعوت کے لیے کوئی پروگرام بنانا ہے۔“

سمیں جاتے جاتے چونک کر ٹھٹک گئی۔

”کیا پروگرام بنانا ہے تمہیں۔؟“

عاطف، نازی اور جین ہنس پڑے۔

”کوئی بھی ہو۔ آپ کو کیا۔ آپ اپنا مینو تک تو ہمیں بتاتی نہیں۔“

”سنو اظفر! ایک بات تمہیں کہ دوں۔ اگر تم نے میری سیلیوں کی دعوت میں گرت کر کرنے کی کوشش کی تو تم سے ہم سب بائیکاٹ کر دیں گی۔ کیوں نازی اور جین ٹھٹیک کہہ رہی ہوں نا۔؟“

”ہاں۔ بالکل ٹھیک۔! نازی نے اس کی پرزور تائید کی۔

”اور سمیں آپنی! اس اظفر کے بچے کو تو ضرور کوئی سزا ملنی چاہئے۔ سارا راستہ ہمیں بہت تنگ کرنا چاہئے۔“ جین روہانسی سی ہو کر بولی۔

”اتنی اور ابو کے بے جا لاٹ پیار نے اسے بے حد بگاڑ دیا ہے۔“

”تین بہنوں کا ایک اکیلا بھائی ہوں۔“ اظفر سینے پر ہاتھ مار کر اڑتے ہوئے بولا۔

"لاڑکیوں نہ ہونگے اور بڑوں کا کیوں نہیں۔ بگڑے بچے بڑے ذہین ہوتے ہیں۔" ساتھ ہی عاطف کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھ مار کر مسکرایا۔  
 "ہو نہ ہو! ذہین ہوتے ہیں۔" نازی منہ بگاڑ کر طنز سے بولی۔ "اس کی ذہانت کی باتیں تو میں تمہیں سناؤں گی سمجھیں۔!"

"دیکھو نازی! اس وعدے پر میں تم سب کو لایا ہوں کہ وہاں کی کوئی بات یہاں نہیں کی جائے گی۔"

"کیوں نہیں کی جائے گی۔؟" جیمین تنک کر بولی۔  
 "ہم پہنچ تو گئے۔ اب جو جی چاہے گا کریں گے۔ وہاں تم اپنی دھونس جما لیتے تھے۔ امی ابا جو تمہارے طرفدار تھے۔ یہاں ہماری خالہ اتی ہیں۔ اب ہی تو سب بدلے اُتریں گے۔"

"تو یہ بات ہے۔! اسی لیے محترمت کی تشریفیں اتنے زور شور سے یہاں آئی ہیں۔!"

"ہم تو عاطف بھائی کا سن کر آئے ہیں۔ ویسے اگر خالہ اتی سے تمہاری مشکلیں کسوائیں تو پھر آؤں گے۔ امی اور گھٹیلوں کے بھی دامن مل جائیں گے۔" نازی نے کہا۔  
 "ہوں۔!" انظر نے بڑے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

"تو پھر اعلان جنگ ہو گیا نا۔؟"

"ارے نہ بابائے! میری چھٹیاں عافیت سے گزر لینے دو۔" معاملہ سنجیدہ ہونے سے پہلے ہی عاطف نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی۔  
 "سمجھیں! اتنے عرصہ بعد اور اتنی دور سے سب آئے ہیں۔ کوئی چائے پانی کوئی کھانا دانا۔ ارے بھئی! کوئی خاطر تواضع کرو ان کی۔!"

"زمانہ بڑا خراب آگیا ہے عاطف بھائی! وہ مہمان نوازی کی پرانی قدیں جلنے لگیں چلی گئیں۔!" ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے انظر بولا۔  
 "اب تو نہ وہ لوگ رہے نہ وہ باتیں۔!"

"جب تم جیسے لوگ آجائیں تو آپ ہی آپ قدیں بدل جایا کرتی ہیں۔" نازی مسکرائی۔

"چھوڑو اسے۔ آؤ ہم اُتی اور رنو خالہ کے پاس چلیں۔"

سیمین کے ساتھ نازی اور جیمین بھی کمرے سے باہر نکل گئیں۔  
 "ہم دونوں کے لیے گرم گرم چائے بھجوا دینا۔" انظر نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ پھر مسکرا کر عاطف کی جانب دیکھا۔

"یہ ندیم کب آئے گا بھائی جان! اس کے بغیر بے جوڑ سا ہو رہا ہوں۔"

"فکر نہ کرو ابھی جوڑی پوری ہوئی جاتی ہے۔" عاطف کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"آہی رہا ہوگا۔"

"ہوگا نہیں۔ بلکہ آگیا۔ اور سو فیصد آگیا۔" ندیم باہر سے ہی بازو پھیلا کر اندر داخل ہوا۔

انظر مچھٹ کر اٹھا اور ندیم سے پیٹ گیا۔ عاطف دونوں کی گرم جوشی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

"یار! بڑی دیر کر دی تم نے۔ اتنے میں ہی آن چڑھوں نے مل کر میرا بڑا تیرا دیا۔"

"فکر نہ کرو۔" ندیم اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ "سب بدلے آجائیں گے۔" تمہیں معلوم ہے نا۔ آج سیمین آپنی کی سیلیوں کی دعوت ہے۔" انظر نے

سرشتی گی۔

”ایمان سے۔؟“ ندیم نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ دے مارا۔

”ہاں سچ۔!“

”تو بس پھر ٹھیک ہے۔ آؤ اپنے کمرے میں چل کر پروگرام بناتے ہیں کہ ہمیں

کونسا رول ادا کرنا ہے۔“ ندیم نے اظفر کا بازو تھام لیا۔

”سوری بھائی جان! ہم کچھ دیر کے لیے آپ کو داغ مفارقت دے رہے ہیں۔“

”شکریہ۔! میں خود بھی چاہتا تھا۔“ حاطف نے وہیں قالین پر لیٹتے ہوئے

آنکھیں موند لیں۔

”ایک اچھی کتاب ہاتھ لگ گئی تھی۔ رات بہت دیر تک پڑھتا رہا۔ اب

نیند آ رہی ہے۔ کوشش کرنا کچھ دیر کے لیے ادھر کوئی نہ آئے۔“

”اچھی آپ فکر نہ کریں۔ مجال ہے کسی کی کوئی اور آجائے۔ گھنٹے ٹخنے تڑوانا

میں کیا انہوں نے۔“ اظفر ہوا میں مکا لہرا کر بولا۔

حاطف بے اختیار مسکرا دیا۔ اور وہ دونوں دروازہ بند کرتے ہوئے کمرے

سے باہر نکل گئے۔

”کچھ نہیں۔ صرف باتیں ہو رہی ہیں۔“

”خواتین کا اور کام ہی کیا ہے۔“ پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتی۔

”وہ ندیم اور اظفر کہاں ہیں۔؟“

”معلوم نہیں۔“ نازی بے نیازی سے بولی۔

”ان دونوں سے ہمارا بائیکاٹ ہے۔“ صاحبہ پیٹ کی بڑی ہلکی تھی۔

”کیوں۔؟ بائیکاٹ کیوں ہو گیا۔؟؟“ حاطف ہنسا۔

”آپ ہی کی ہشہ سے وہ اتنا سر چڑھے ہوئے ہیں۔“ سیمیں کو حاطف کی

ہنسی بے موقع معلوم ہوئی۔ بڑی چڑکر بولی۔

”یقینی کر دیمیں! اس معاملے میں میں نے ان کی کوئی حمایت نہیں کی۔ میں تو

رات بھر کا جگا ہوا تھا۔ ساری سہ پرویں پڑا سوتا رہا اور تم سب خواہ مخواہ ہی

دو دن سے مجھ سے بھی منہ پھلائے پھلائے پھر رہی ہو۔“

”تو آپ کی یونیفارم انہوں نے کہاں سے لی تھی۔؟“

”انہوں نے خود ہی میرے کمرے میں سے نکال لی ہوگی۔“

”اور آپ اس تمام کہاں تھے۔؟ کیا اپنے کمرے میں نہیں تھے۔؟“

”نہیں تو۔ سوکراٹھا تو ندیم کے پرنسپل صاحب کے پاس چلا گیا۔“

”پرنسپل صاحب کے پاس! سیمیں وکیل کی طرح جرح کر رہی تھی۔

”وہ تو آپ اسی دن صبح کے وقت گئے تھے۔“

”صبح کب گیا تھا۔؟“

”اُمی کو آپ نے کہا تو تھا کہ گئے تھے۔“

”وہ تو اپنی سستی کو جھوٹ کے پردے میں چھپایا تھا۔ اور پھر اس جھوٹ

کمرے میں اودھم مچا تھا۔ شور کی آواز سن کر حاطف اندر چلا گیا۔ سب باتوں

میں مصروف رہیں۔

”آرڈر! آرڈر پلینز!!“ چاروں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ ”کیا ہو رہا ہے۔“

کو سچ بنانے کے لیے شام ہی کو پرنسپل صاحب کے پاس بھاگا چلا گیا۔  
”سچ کہہ رہے ہیں نا۔؟“

”یقین کرو۔“ عاطف بخیدگی سے بولا۔

”اور پھر تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ زبان سے میں جو چاہے کہہ لوں۔ مگر کبھی کسی لڑکی کے ساتھ میں نے عملی شرارت نہیں کی۔“ کتنی بار اپنی سیلیوں کی دعوتیں کچلی ہو۔

کبھی پہلے ایسا ہوا۔ جو میں اب ایسی ذلیل حرکتیں کر دل کا۔

”تو یہ ساری شرارت انظر اور ندیم ہی کی تھی۔“

”ہوا کیا آخر؟ کچھ مجھے بھی تو تفصیل سے بتاؤ۔“

”ہم تینوں تو ان سب کے گول کرے میں چھوڑ کھانے کی میز رگھنے چلی گئی تھیں۔“

سیمیں نے اپنے اور نازی اور جبین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بہر صفحہ وہاں موجود تھی۔ بتاؤ ذرا صاف صاف کہ ان دونوں نے کیا کیا۔؟“

صاف صاف جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر عاطف کے پاس آکھڑی ہوئی۔

”مائے بھائی جان! کیا بتاؤں۔؟ اب بھی خیال آجاتا ہے تو شرم سے پانی

پانی بہ جاتی ہوں۔“

عاطف کو اس کے انداز بیان پر بے اختیار ہنسی آگئی مگر اس نے بڑی کوشش

سے ضبط کر لی۔

”دیکھو جبین! صحیح صحیح بات بتانا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

”تمہاری عادت ذرا ٹھک، مرج اور صائمہ لگانے کی ہے۔“

”خواہ خواہ ہی۔“ صاف صاف روٹھ گئی۔ ”جلیے میں نہیں بتاتی۔“

”ارے نہیں نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ پھر مجھے ان سے بھی پوچھ کچھ کرنا ہے۔“

صحیح بات معلوم ہوگی تو اچھی طرح ان کے کان کھینچوں گا۔“

”جبیں، سیمیں، آبی اور نازی آبی کھانے کی میز لگانے چلی گئیں تو سیمیں آبی کی سیلیوں

کے پاس صاف صاف رہ گئی۔“ صاف صاف نے رقت بھری آواز میں اس طرح فرما

واقعہ کی تفصیل بتانا شروع کر دی۔

سیمیں، نازی اور جبین حالانکہ کتنی ہی بار سچی تھیں مگر یہ قصہ کچھ ایسا دردناک

اور دلگداز تھا کہ ایک بار پھر سب اپنی اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر پورے غم سے

بہمن گوش ہو گئیں۔

”انظر صبیحہ اور ندیم بھائی شاید اسی موقع کی تاک میں تھے۔ فوجی بوٹوں والے

پاؤں زور زور سے زمین پر مارتے ہوئے اندر آگئے۔ دونوں نے آپ کی مڑیاں

پھنی ہوئی تھیں۔“ پھر تھوک ٹھک کر جلدی سے بولی۔

”ویسے آپ جیسے شاندار بالکل نہیں لگ رہے تھے۔“

بے اختیار سب قہقہہ لگا اٹھیں۔

”جب بھی اس نے پورا واقعہ سنایا بھائی جان۔!“ جبین ہنستے ہوئے بولی۔

”مہربان یہ فقرہ اس نے ضرور ساتھ کہا کہ آپ جیسے شاندار نہیں لگ رہے تھے۔“

بالکل بالکل ہے۔“

”تو میں نے کوئی جھوٹ کہا ہے۔؟“ صاف صاف گھبرا گھبرا کر ایک ایک کو دیکھنے لگی۔

”ایسے نازک موقع پر ہمیں یہ جاننے کا ہوش رہا۔؟“ عاطف نے مکرر پوچھ

”ہوش تو سچ کچھ کوئی نہیں رہا تھا۔“ مگر نجانبہ کیوں اس وقت بار بار ذہن میں

یہی آئے جا رہا تھا کہ ایسے ہی انہوں نے دریاں پہننے کی تکلیف گوارا کی۔ آپکا

”اچھا یہ بات چھوڑ دو۔“ عاطف نے اس کی بات کاٹ دی۔

”مجھے اصل قصہ سناؤ۔ جس نے تم سب کو اتنا غمگین کر رکھا ہے۔“

”مجھے وہاں دیکھ کر ندیم بھائی تو سیدھے میرے پیچھے آکھڑے ہوئے اور۔“

اور۔“ صاعقہ کی آنکھوں میں بے شمار آنسو اُٹھ آئے۔

”کیا ہوا؟“

عاطف گھبرا گیا۔ ”پستول میری پشت سے لگا کر مجھے خاموش رہنے کو کہا۔“ پھر صاعقہ کے

آنسو واقعی بہ نکلے۔ رونے ہوئے بولی۔

”اب بھی خیال آتا ہے تو روح کا پٹھنٹی ہے کہ اگر اچانک میری آواز نکلی

جاتی یا گھبرا کر میں چیخ پڑتی تو ندیم بھائی نے تو مجھے کوئی مار دینا تھی۔ ہائے بھائی! کے پیچھے بھاگیں۔

کسی نے جوتی پہنی، کسی نے نہیں۔ صاعقہ کو تو اپنے دوپٹے

پھر میں سچ مچ مر جاتی۔!“ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

”جینیں اور نازی ہتھ پھرتے دھری ہو گئیں۔“ جبین نجدی سے بولی۔

”بھئی کتنی بار سمجھایا ہے کہ تم خواہ مخواہ ہی ڈر گئیں۔“ جبین نجدی سے بولی۔

”تم بڑے شوق سے شور مچا دیتیں ندیم نے پیرچہ کوئی نہیں مار دینا تھی۔“

”اس وقت اس کی سانس روک کے کسی متوقع حادثے کی منتظر تھیں۔“

”نہیں جبین نہیں۔“ صاعقہ لوزنہ ہوتے ہوئے بولی۔

”اس نے بالکل مار دینا تھی۔“

”اس کے پاس۔“ عاطف نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں سے آیا۔؟“

”آپ ہی کا ہو گا۔!“ سیمیں جھٹ بولی۔

”آپ کی وردیاں اگر لے سکتے ہیں تو پستول نہیں لے سکتے کیا۔؟“

”مگر پستول ہوں کھلم کھلا تو کبھی نہیں رکھتا۔“

”کیا۔؟“ تینوں حیرت سے سمجھیں۔

”میں ہمیشہ تالے کے اندر رکھتا ہوں اور چابی اپنے پاس۔“

”پھر انہوں نے تالہ توڑا ہو گا۔“ نازی نے قیافہ لگایا۔

”ہاں۔“ سیمیں، جبین اور صاعقہ نے تائید کی۔

”یہ تو پھر بہت غلط بات ہے۔“ عاطف گھبرا ہوا سا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔“ انظر اور ندیم سے مجھے اتنی کمینگی کی توقع نہیں تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ نازی، سیمیں، جبین اور صاعقہ

پسے چنلے دیں بیٹیں ایک دوسری کو دیکھتی ہیں پھر وہ بھی اٹھ کر پستل پستل عاطف

کی بھی خبر نہیں تھی۔!

وہاں پہنچیں تو عاطف اپنا چھوٹا بس کھول رہا تھا۔ چاروں ہانپتے ہوئے ارد گرد

اکھڑی ہوئیں اور جھک کر متحسس نگاہوں سے اس کے اندر جھانکنے لگیں۔

کچھ چیزیں ادھر ادھر کر کے، کپڑے ہٹا کر سب نیچے عاطف نے ہاتھ ڈالا۔

”اس وقت اس کی سانس روک کے کسی متوقع حادثے کی منتظر تھیں۔“

”لو پستول تو نہیں ہے۔“ عاطف نے ہاتھ لکال کر سب کے سامنے پستول نکال دیا

”یہی تو تھا۔“ صاعقہ زور سے چیخی۔

”میں نے پہچان لیا ہے بالکل یہی تھا۔“

”حیرت ہے۔“ قفل بھی نہیں توڑا گیا۔ چابی بھی میرے پاس ہے۔ پھر پستول

ہلکے لکھتا ہے۔“

”مجھے ایک خیال آیا ہے۔“ سیمیں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”بھائی جان! تالے کو دوسری چابی تو لگ سکتی ہے نا۔؟“

”ہاں —“ صاحبہ نے ”ہاں“ بڑا لمبا کر کے کہا — ”ان سے کچھ بھی بعید

نہیں۔ پستول ہی تھا —“  
”تو پھر آج ندیم اور اعظم کی خیر نہیں —“ عاطف غصے سے بولا —

”کہاں ہیں دونوں؟“

”معلوم نہیں۔ صبح کے ہی کہیں غائب ہیں —“

”میرے ہاتھ آجائیں نا تو اسی پستول کی گولیوں سے دونوں کے پیچھے نکال دوں“  
”ہائے نہ نہ۔ بیچارے مرجائیں گے۔ دونوں کے دونوں ہی مرجائیں گے۔“  
صاحبہ ان کے فراق میں بڑے غلوں سے رونے لگی۔

”پھر ہمارا دل کون لگایا کرے گا —“

سیمیں، نازی اور جبین صاحبہ کی اس مصحوم حرکت پر بے اختیار ہنس دیں۔

عاطف، جو ابھی بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا اپنی مسکراہٹ چھپانہ سکا۔

”چلو آؤ مجھے باقی بات تو سناؤ کہ پھر انہوں نے کیا کیا۔“ عاطف نے مسکراہٹ  
کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے پستول واپس رکھا اور بکی بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ”جلد آؤ  
اور پھر قافلہ کا قافلہ اسی طرح واپس سیمیں کے کمرے میں جا چھپا۔“

”ہاں تو صاحبہ پھر —؟“ عاطف نے آرام کرسی پر بیٹھ کر پشت پیچھے ٹیک لی۔

صاحبہ اسی انداز میں اس کے پاس آئی تھی۔

”پھر مجھے تو پستول سے ڈرا کر بٹھا دیا اور سیمیں اپنی کی سیمیلوں پر رعب ڈال ڈال کر  
کسی سے گانا سنا۔ کسی سے ڈانس کرایا۔“ صاحبہ ایک ہی سانس میں بوجی چلی گئی  
”ایک ٹکی کا دوپٹہ پٹنا ہوا تھا جو ایسے لگ رہا تھا جیسے گے میں رسہ لٹکا رکھا ہو  
وہ اس سے کھلوایا۔ ایک نے بال بڑے عجیب طرح کے بنائے ہوئے تھے۔“

اسے کہا کہ کھول کر انسانوں کی طرح چوٹی کرے۔“ صاحبہ مسکراتی —  
”ویسے بھائی جان! اس کے بال تو مجھے بھی ذرا اچھے نہیں لگ رہے تھے۔“

اعظم بھائی نے اس کے جب بال کھولائے تو اندر ہی اندر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔  
”مطلب یہ کہ پھر تم بھی ان کے جرم میں برابر کی شریک ہو۔“ نازی نے بڑے  
رعب سے کہا۔

”نہیں تو۔“ صاحبہ ایک دم ڈر گئی۔ ”وہ تو میں ایسے ہی کہہ رہی تھی۔“  
عاطف ان کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔

”ویسے نازی اپنی ایہ صاحبہ بھی بڑی چالاک ہے۔“ جبین نے بھی غصے سے  
صاحبہ کو دیکھا۔ ”چپ چاپ بیٹھی ان کی شرارتیں دیکھتی رہی اور مزے لیتی رہی۔“  
”دیہن بھائی جان! اب سارا الزام مجھ پر دھر رہی ہیں۔“ صاحبہ لمبوری  
”اچھا ہوتا مجھے ندیم بھائی پر سچ ہی گولی مار دیتے۔“

”اس ندیم کے بچے کو تو میں گولی ماروں گا۔“ عاطف کو پھر اپنا پستول یاد آگیا۔  
کیا خطرناک کھیل کھیلا تھا انہوں نے۔!

”پگلی! تم کیوں روتی ہو۔؟ جب تک تمہارا عاطف بھائی زندہ ہے۔ تم پر بھلا  
کوئی الزام دھر سکتا ہے۔“ عاطف کی تسلی سے صاحبہ کے آنسو ختم گئے۔ اور آنسو  
تھے تو وہ پھر جلدی جلدی بولنا شروع ہو گئی۔

”اور بھائی جان! اعظم بھائی نے انہیں یہی بتایا تھا کہ وہ کیپٹن عاطف ہیں۔ جانے  
ہاں سے بالکل آپ جیسی مونچھیں لے کر انہوں نے لگائی ہوئی تھیں۔ اور ندیم بھائی نے  
خود کو آپ کا ایک فوجی دوست بتایا۔ پتہ نہیں کیا نام بتایا تھا انہوں نے۔“ صاحبہ  
پوچھنے لگی۔ ”ہاں یاد آیا۔ آصف! کیپٹن آصف!“



بات نہیں ہوتی —

”یہی تو سب سے بڑی بات ہوتی —“ سمیں رو دہانسی ہو کر بولی —  
”میں نے ان کے سامنے آپ کی اتنی تعریفیں کی ہوئی تھیں —“

”بھائی جان! سب ہی تو ان دونوں سے بڑی تھیں —“ صاحبہ معصومیت سے بولی —

”پھر کیا ہوا —؟“

”بے شک بڑی تھیں — مگر یہ حرکت ہے سخت قابل اعتراض — کم از کم مجھے تو ان کی یہ شرارت بالکل پسند نہیں آئی — ندیم سولہ سال کا ہے اور اظفر سترہ کا — اتنے بھی چھوٹے نہیں — اب انہیں کچھ باشعور ہونا چاہیئے اور میرا پستول —“  
عاطف اٹھ کھڑا ہوا —

”پستول کی بات تو ابھی ان سے کرتا ہوں —“ مگر سے باہر جانے لگا تو دروازے میں خانہ سال کے چھ سالہ لڑکے کو دیکھ کر رک گیا —  
”کیا بات ہے بیٹے —؟ یہاں کیوں کھڑے ہو —؟“

”وہ — وہ —“ وہ ہرکلانے لگا اور خوف سے تھر تھر کانپنے لگا —  
حالانکہ عاطف ہر ایک سے بڑی نرمی سے پیش آیا کرتا تھا مگر جانے کیوں ہر کوئی اس سے خوف ہی کھاتا — خصوصاً یہ ملازم پیشہ تو سب ہی اس کے سامنے سے بھی گھبراتے تھے — شاید فوج میں ملازمت کی دہر سے —!!  
وہ تھر تھر کانپ رہا تھا — سمیں کو اس پر ترس آگیا —  
”بلو! کیا بات ہے؟ میرے پاس آکر بتاؤ —“

بلو عاطف کے پاس سے بھاگ کر گزرا اور سمیں کے پاس جا کھڑا ہوا —  
”چھوٹے بھیا کہاں ہیں —؟“  
”ندیم کو پوچھ رہے ہو —؟“

عاطف سیدھا ہو کر بیٹھ گیا —  
”تو کیا وہ اسی دھوکے میں رہیں کہ یہ سب حرکتیں میں نے اور میرے ایک دست نے کیں —؟“ عاطف غصے میں گرج اٹھا —  
”مطلب یہ کہ وہ آئندہ اس گھر میں نہیں آئیں گی کہ یہاں ان کی عزت محفوظ نہیں — ندیم اور اظفر کو میرے نام سے ایسی ذلیل حرکات کرنے کا کوئی حق نہیں —“  
”نہیں بھائی جان! آپ کا نام میں بھلا بدنام ہونے دیتی ہوں —“ سمیں

جلدی سے بولی —  
”بعد میں میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ اظفر اور ندیم بہت شرارتی ہیں —“  
”وہ ناراض ہو کر تو نہیں گئیں —؟“

”نہیں —“ نازی جلدی سے بولی — ”البتہ پہلے بڑی خفا تھیں — اور کھانا کھائے بغیر ہی جانا چاہتی تھیں —“

”اور پھر جب انہیں معلوم ہوا —“ جبین بے تحاشا ہنستے ہوئے بولی —  
”کہ یہ ندیم اور اظفر کی شرارت تھی تو پھر ہنس ہنس کر ایک دوسرے کی تقلید اتارنے لگیں کہ فلاں نے ڈکر یہ کیا اور فلاں نے ایسے — خوب خوب ایک دوسرے کی باتیں کیں —“

نازی اور سمیں بھی ہنسنے لگیں —  
”چلو خیر اب تو معاملہ رفع و دفع ہو گیا —“ عاطف سنجیدگی سے بولا —  
”مگر انہیں منع کرنا چاہیئے کہ ایسا مذاق آئندہ نہ کریں — لڑکیوں کو چھیڑنا اچھی

”ہاں۔“

”اتنی نے بتایا ہے۔“

”جی نہیں۔ خود مجھے ان سے ایک ضروری کام ہے۔“

”سب ہنس پڑیں۔ اتنے لمبے تونگے ندیم کے ساتھ اس ننھی مٹی چیز کو کیا کام ہو سکتا تھا۔ عجیب ہی تو بات تھی۔“

”کیا کام؟“ بیسین نے سب کو آنکھ کے اشارے سے خاموش کرا لیا۔

ہوئے پوچھا۔

”بتو نے سہم کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر بہت راز دارانہ بولا۔“

”انہوں نے کہا تھا کہ کسی کو نہ بتاؤں۔“

عاطف نے سنا تو مھن دچھی کی خاطر اس کے پاس واپس آکھڑا ہوا ننھے بلو کا انداز ہی ایسا تھا۔

”مجھے بتانے میں کیا حرج ہے۔؟“ بیسین سکرانی۔ کچھ جذبہ تجسس نے سب کو

ندیم کی اکثر حرکات کسی نہ کسی شرارت پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔

”وہ۔ وہ۔“ جھجک جھجک کر بلو کہنے لگا۔

”دو تین دن ہوئے میرا پستول، جو مجھے یگم صاحبہ نے دیا تھا وہ مجھ سے

ادھار لے گئے تھے۔ کہتے تھے چڑیوں کا شکار کرنا ہے۔ اور شکار کی دوجڑ

انہوں نے مجھے بھی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ گرا ب تک نہ میرا پستول واپس دیا

چڑیاں۔“

”ہوں! تو یہ بات ہے۔“ عاطف معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے پھر

بیٹھ گیا۔

”میں بیسین۔ برے بھیا! میں نے کچھ نہیں کیا۔“ بلو نے لرز کر دونوں ہاتھ عاطف کے سامنے جوڑ دیے۔

”او بیٹے! تمہیں تو میں نے کچھ نہیں کہا۔“ عاطف نے اُسے قریب کھینچ کر پکایا۔

”تم جاؤ۔ ہم ابھی ندیم سے تمہارا پستول واپس لے دیتے ہیں۔“

”اور وہ دو چڑیاں۔“ وہ سہا سہا سا بولا۔

”ہاں ہاں۔ چڑیاں بھی۔“

جو ننھی بلو کمرے سے نکلا۔ عاطف تھتھے پر تھتھے لگانے لگا۔

”پستول اور چڑیوں کا شکار۔! دو چڑیاں بلو کے لیے۔“ عاطف ہنسنے جا رہا تھا۔

چاروں لڑکیاں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

”بھائی جان! آپ کو کیا ہوا۔؟“

”مجھے افقر اور ندیم سے تلے کو چابی لگوانے والی اتنی کمینہ اور ذلیل حرکت کی توقع نہیں تھی۔“ عاطف بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”اور شکر ہے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچی۔“

”یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔؟“ بیسین تنک کر بولی۔

”بلو کی پستول اور شکار۔۔۔۔۔ چڑیاں۔!“ عاطف پھر ہنسنے لگا۔

”یعنی تمہاری سہیلیاں۔ بھی حد ہو گئی ان کی ذہانت کی۔“

”اور صاف حقہ ایسے ہی اپنی موت پر آپ ہی داویلا چھائے دے رہی تھی۔“ نازی ہنس کر بولی۔

اور پھر سب کا مشترکہ تھتھے کمرے میں گونج اٹھا۔ صاعقہ بڑی خفیف سی تھی۔

”جے! اگر پہلے معلوم ہو جاتا کہ میری پشت کے ساتھ جو لگا ہے وہ مصنوعی پستول

”چلو پھر۔ ابھی آزمائش ہوئی جاتی ہے۔“ عاطف نے پتے پھینے۔  
 اور پھر چاروں بڑی سنجیدگی سے کھیل میں مصروف ہو گئے۔ صاعقہ کو اوپر والا  
 کام سونپ دیا گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سب کے لیے کب گرم چائے بنانا کبھی کافی  
 اور بسکٹ وغیرہ پیش کرنا۔!

وہ اسی سے بہت خوش تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا کھیل میں گرمی  
 پیدا ہو رہی تھی۔

”بھائی جان!“ انظر کا چہرہ دروازے میں نمودار ہوا۔

”کیا ہے۔؟“ عاطف کی نگاہ اسی طرح اپنے ہاتھ والے تپوں پر گڑھی تھی  
 ”ادھر آئیے۔“

”میں نہیں آ سکتا۔“ انظر کو کورا جواب ملا اور عاطف کھیل میں مگن رہا۔

”جو کچھ کہنا ہے میں آ کر کہ دو۔“

”بڑی ضروری بات ہے۔“

”تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ غیر ضروری ہے۔ اگر تبادو۔“

”بھائی جان! معاملہ بڑا سنجیدہ ہے۔“ انظر کا لہجہ بھی بڑا سنجیدہ تھا اور کچھ

لہجہ پایا ہوا بھی تھا۔ ”جلدی آئیے۔“

”جانتا تھا تم مجھے اٹھا کر ہی دم لو گے۔“ عاطف نے اٹھتے ہوئے نازی  
 اور سمیں کو تنبیہ کی۔ ”بے ایمانی نہیں ہوگی۔“ اور خود انظر کے پاس چلا گیا۔

”کیا بات ہے۔؟“ قدرے جھنجھلا کر پوچھنے لگا۔

”آپ کی ”وہ“ آئی ہیں۔“ انظر نے سرگوشی کی۔

”وہ کون۔؟“ عاطف متحیر سا ہو گیا۔

”ہے تو دونوں کو مزہ چکھا دیتی۔“  
 ”ہونہہ!“ جبین طنز سے بولی۔ ”تم مزہ چکھا دیتیں۔ تم۔ جو اپنی  
 بزدلی کی وجہ سے ہر ایک سے خود مزے چکھتی پھرتی ہو۔ بیوقوف کہیں کی!“

نازی اور سمیں بھی جبین کے ساتھ ہنسنے لگیں۔

”دیکھئے بھائی جان! یہ جبین ہر وقت مجھے بیوقوف کہتی رہتی ہے اور پھر ہمیں

آپنی اور نازی آپنی بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتی ہیں۔“

”یہ خود تینوں کی تینوں بیوقوف ہیں۔“ عاطف نے صاعقہ کے سر پر پیار

سے ہاتھ پھیرا۔

”میری صاعقہ تو بے حد عقل مند ہے۔“

صاعقہ خوش ہو گئی۔

”کیوں صاعقہ رانی! ذرا ایک گرام گرم چائے کی پیالی اپنے بھائی جان کو پلا رہی

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ آپ کے لیے تو بھائی جان سب کچھ کر سکتی ہوں۔“

”ثاباش! ثاباش!! جیتی رہو۔“ عاطف نے مسکاکر سب کی جانب

دیکھا۔ سبھی عاطف کی چالاکی پر ہنس رہی تھیں۔

”کیوں بھی لگتی ہے تاش کی بازی۔؟“

”ضرور۔ ضرور۔“ جبین جلدی سے عاطف کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”بھائی جان! آپ کی پارٹنر میں بنوں گی۔“

”پھر ذرا دھیان سے کھیلنا۔ آج ہم جیت کر اٹھیں گے۔“

”ہماری پارٹنر شپ کے مقابلے میں کوئی نہیں جیت سکتا۔“ سمیں نازی  
 کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”آپ کی گرل فرینڈ —!“  
 ”میری —“ عاطف سٹپٹایا — پھر ایک دم چونکا اور زور سے ہنس دیا۔

”ندیم نے آج کوئی دوسرا بہروپ بھرا ہوگا۔“  
 یہ کہہ کر واپس مڑا۔ اظفر نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا۔

”نہیں بھائی جان! خدا کی قسم میں سوچ رہا ہوں۔ وہ آپ ہی کی گرل فرینڈ ہے۔“  
 ”مگر میری تو کوئی گرل فرینڈ ہے ہی نہیں۔“

اظفر کی قسم اور تنبیہ چہرے نے عاطف کو حیران سا کر دیا تھا۔  
 ”میں اور ندیم کالج سے آئے تو وہ باہر صدر دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ ہم  
 پاس سے گزرے تو آپ کا نام لے کر پوچھنے لگی۔“

”بھئی آئیے بھی۔“ نازی نے عاطف کو پکارا۔  
 ”آتا ہوں۔“ عاطف پھر اظفر کی طرف مڑا۔ ”کیا پوچھنے لگی۔؟“  
 ”کہ کیپٹن عاطف کا گھر یہی ہے کیا۔؟“ اظفر بہت مدھم آواز میں اسے بتا۔  
 ”لگا۔“ پھر میں اور ندیم نے جلدی سے اسے لیجا کر آپ کے کمرے میں بٹھا دیا کہ کہیں  
 خالہ امی یا لڑکیوں میں سے کوئی دیکھ لے تو اور آفت کھڑی ہو جائے۔ جلدی چلیے۔“

عاطف حیران پریشان سا پہلے اظفر کو دیکھتا رہا پھر صاحبہ کو آواز دے کر اپنی  
 جگہ کیلینے کے لیے پتے اس کے ہاتھ میں تھمائے اور خود اظفر کے ساتھ ساتھ اپنے  
 کمرے کو چل پڑا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ فوجی لوگوں کی گرل فرینڈز ہوا کرتی ہیں مگر یقین کیجئے آپکا

راز ہمارے سینوں میں دفن رہے گا۔“ اظفر رازدارانہ انداز میں بولا۔  
 ”کیا بک بک کیے جا رہے ہو۔!“ عاطف نے اسے تھوڑک دیا۔

”جائے کیوں تم سب لوگوں نے فوجیوں کو اساطط مجھ رہا ہے۔ میری ہی  
 کے ساتھ دوستی دوستی نہیں۔“

”مگر وہ تو آپ ہی کا پوچھ رہی تھی۔“ اظفر کے ہونٹوں پر معنی نیزہ بستم بکھرا۔  
 جیسے عاطف کی زبان پر اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔“ اظفر کا بستم عاطف کو زہر لگا۔ بڑی تلخی سے بولا۔  
 اور تیز تیز قدم اٹھا کر پوری راہداری طے کر گیا۔ اظفر بھی ساتھ ساتھ تھا۔ عاطف  
 کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور ندیم بلبوں میں ہاتھ دیے باہر اٹل رہا تھا۔

پھر سے پر بڑی تنجیدگی اور احساس ذمہ داری نمایاں تھا۔ جیسے اسے کسی  
 گراں مایہ خزانے کی حفاظت سونپی گئی تھی اور وہ بڑی احتیاط سے یہ فرض نبھا  
 رہا تھا۔ عاطف کو آتے دیکھا تو جلدی سے دروازے کی پچھنی کھول دی۔

عاطف آگے بڑھا۔ ساتھ ساتھ ندیم نے بھی اندر جانا چاہا تو اظفر نے تیچھے  
 سے اس کا بازو تھامتے ہوئے سرگوشی کی ”تم کیوں کباب میں ہڈی جنتے ہو۔؟“  
 ”یہ کیا بکواس ہے اظفر۔؟“ عاطف نے سن لیا تھا۔ بڑی تلخی سے بولا۔

مگر اظفر اور ندیم معنی خیز انداز میں عاطف کو دیکھتے ہوئے اور زیرب مسکراتے  
 ہوئے کان پیٹے وہاں سے ہٹ گئے۔

عاطف ان کے اس انداز سے چین بچیں ہوتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ یا منہ  
 ہی کرسی پر وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سفید سلوار قمیض میں بڑی سادہ سی لگ رہی تھی۔

”خاتون! آپ مجھے پوچھ رہی تھیں۔؟“

عاطف کی آواز پر چونکتے ہوئے اس نے سر اٹھایا۔

”آپ کو۔؟ نہیں تو۔“ وہ بے حد سہمی ہوئی تھی۔ چہرہ پیدا ہو رہا تھا۔

جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”آپ نے کیپٹن عاطف کو نہیں پوچھا تھا؟“

”جی ہاں۔ انہیں تو پوچھا تھا۔“

”وہ میں ہی ہوں۔“

”اوہ۔!“ وہ گھبرائی گھبرائی سی کہنے لگی۔

”دراصل میں سیمیں سے ملنے آئی تھی۔ مجھے سیمیں کے ابو کے نام کا علم نہیں تھا اور اس کے منہ سے اکثر اس کے بھائی کا نام سنا تھا۔ اسی لیے ہی آپ کا نام احتمال کر لیا کہ کہیں غلط جگہ نہ چلی جاؤں۔“

”آپ سیمیں کی کلاس فیلو ہیں؟“

”جی ہاں۔ میرا نام لالہ رخ ہے۔“

”اوہ! اچھا!“ غیر ارادی طور پر عاطف کے منہ سے نکل گیا ”وہی لالہ کی بچی!“

”جی۔ کیا فرمایا آپ نے؟“

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔“ عاطف ہنسیا گیا۔

”تشریف رکھتے ہیں ابھی اسے بلاتا ہوں۔“

عاطف جلدی سے کمرے سے باہر نکلا۔ اظفر اور ندیم تھوڑے فاصلے پر چوکنے کھڑے تھے۔ جیسے پہرہ دے رہے ہوں۔ عاطف کو دیکھا تو بھاگ کر قریب آگئے۔

”کوئی چائے پانی وغیرہ چاہیئے؟“

”بدمعاشو! بھاگ جاؤ یہاں سے۔“ عاطف بے اختیار مسکرا پڑا۔

”وہ سیمیں کی سہیلی لالہ ہے۔“

”تو آپ کا کیوں پوچھ رہی تھی؟“

”صرف سیمیں کے گھر کا پتہ معلوم کرنے کے لیے۔ جاؤ ندیم سیمیں کو بلا لاؤ۔“

”اوتے ہوئے!“ اظفر نے ایسی سے سر ہلایا۔

”میں خوش ہوا تھا کہ ہمارے بھائی جان کی بھی کوئی گرل فرینڈ ہے۔ مگر آپ نے

تو فوج کا نام ڈبو دیا۔“

”اظفر! تمہاری بیٹائی کسی دن میرے ہاتھوں ہو جائے گی۔“ عاطف نے

مکاتنا۔

”ویسے وہ ہے کیسی؟“ اظفر نے عاطف کے تنہ ہونے کے کو نظر انداز

کر کے پوچھا۔

”تم نے نہیں دیکھی؟“

”چھوٹے ہی اُس نے آپ کا نام لے دیا۔ اس لیے آپ کا مال سمجھ کر آنکھری

نہیں اٹھائی۔“

”استغفر اللہ! اظفر تم سچ پوچھ رہے ہو تو خراب ہوتے جا رہے ہو۔ اس چھوٹی سی عمر میں

طبیعت کی جولانی کا یہ عالم ہے تو آگے چل کر کیا نکلے گا۔!“

”آپ جیسا انسان۔!“ بڑی بنجیدگی سے بولا۔

”اس بھول میں نہ رہنا بیٹے۔!“

”لیجئے۔ سیمیں آپ کی لگیں۔“

”کون آیا ہے بھائی جان؟“

”تمہاری لالہ کی بچی۔!“

”سچ۔!“ سیمیں بیچن مار کر اندر بھاگی۔

”آؤ ندیم اور اظفر! ہم نازی، جبین کے پاس چلیں۔ بڑا اگر مار کم کھیل ہو رہا تھا۔“

عاطف واپس مڑا۔ مگر اظفر نے اس کا بازو تھام لیا۔

”ذرا دیکھیں تو سہی، کیسے ہلٹی ہیں دونوں سیلیاں۔“

رودازہ چوٹ کھٹا تھا۔ اظفر اور ندیم وہیں اوٹ میں کھڑے ہو کر سر نکال نکال کر اندر جھانکنے لگے۔ سمیں اندر جاتے ہی لالہ سے لپٹ گئی۔ ارے! تم۔؟“

”تو بے چارے سمیں! تم تک پہنچنا تو مجھے شیر لانے کے مترادف ہو گیا۔“

”کیوں۔ کیا ہوا۔؟“

”پہلے بڑی مشکل سے تمہارا گھر تلاش کیا۔“

”روحی کو ساتھ لے لیا تھا۔“

”کہا تھا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ کہتی تھی تمہارے گھر میں دو لڑکے ہیں۔ ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بالکل ایسے ہی خائف تھی جیسے چوکیداری کرنے والے کتوں سے کوئی فقیر ڈرے۔“

عاطف واپس چلا تھا۔ لالہ کی بات سن کر وہیں ٹھٹھک گیا اور اس کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔ اظفر اور ندیم حقیقت سے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”سمیں اپنی نوکھتی تھیں۔ بڑی بھولی بھالی لڑکی ہے۔“ اظفر دانت پکچپا کر بولا۔

”ہو نہ! بھولی! ندیم بھی بڑبڑایا۔ ”عورت ذات تمہیں کبھی کوئی بھولی نہیں میرے یار!“ عاطف دونوں کی باتیں سن کر سر کرانے لگا۔

”میں تو حیران ہوں کہ تم آج آ کیسے گئیں۔؟“ و فوہر مسرت سے سمیں کا چہرہ سُرخ ہوا جا رہا تھا۔ اور بڑے جذباتی انداز میں ہاتھوں کو سل رہی تھی۔

”سچی! مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔“

”تین چار دن تم بغیر کسی اطلاع کے کالج سے غیر حاضر رہیں تو میرا دل ڈوبنے سا

لگا۔ بے حد محکوم ہو گیا۔ چنانچہ تمہاری محبت سے مجبور ہو کر یہ روزہ توڑنا پڑا۔“

”خیریت سے تو تھیں۔؟“

”لاہور سے میری خالہ اور ان کی لڑکیاں آئی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کالج جانے ہی نہیں دیا۔“

”اور لڑکے کا نام ہی نہیں۔“ اظفر کچھ ناراضگی سے بڑبڑایا۔

”نجانے یہ لڑکیاں لڑکوں کو اتنا حقیر کیوں سمجھتی ہیں۔“ ندیم اس کی حمایت میں بولا۔

عاطف نے بڑھ کر دونوں کی گردنوں میں ایک ایک ہاتھ ڈالا اور دبوچ کر ذرا پیسے لے گیا۔ ”چلو یہاں سے بھاگو۔“

”اور آپ اس کے پاس جا کر بیٹھیں گے۔؟“ اظفر نے سر ادخا کر کے پوچھا۔

”ہاں۔“ عاطف مسکرایا۔ ”اس کے پاس جا کر بیٹھو نہ لگا۔ وہ میری کیا لگتی ہے۔؟“

”گرل فرینڈ!“ ندیم نے اظفر کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”او لالہ۔! تمہیں اپنی اتی، خالہ اور ان کی لڑکیوں سے ملو اداں۔“

”اور لڑکے سے نہیں۔؟“ اظفر بہت دھیرے سے بولا۔

”ارے ارے! بھاگو اظفر! وہ ادھر ہی آرہی ہیں۔“

ندیم نے اظفر کا ہاتھ پکڑا اور دونوں دہانوں سے نود دو گیارہ ہو گئے۔

”ارے بھائی جان! آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔؟“

”میں۔؟ ہاں میں۔۔“ عاطف سہٹایا۔ اظفر اور ندیم نے کیا خوب

اسے پھنسیا تھا اور خود پرچ نکلے تھے۔! پھر کچھ پوچ کر جلدی سے بولا۔

”اپنے گھر سے میں جانا تھا۔“

”اسی لیے میں لالہ کو لے کر ادھر نازی جبین کے پاس جا رہی ہوں۔ او لالہ۔“



جبین وغیرہ کے سمیں دے دے کر پھر۔ پھر اور پھر اے پر مجبور رویا تھا۔  
ان چند دنوں میں ہی وہ سب میں کافی کھل ل گئی تھی۔ اظفر اور ندیم تو  
اسے اپنی ہی ملکیت سمجھتے تھے۔ سمیں، نازی اور جبین وغیرہ سے بچپن سے  
ہی ان کی لگتی تھی۔ لالہ کے ساتھ خوب دوستی ہو گئی۔

جب وہ آجاتی تو دو پارٹیاں بن جاتیں۔ پھر خوب خوب بحث مباحثے ہوتے۔  
ادٹ ٹانگ قسم کے کھیل کھیلے جاتے۔ ان ڈور بھی اور آڈٹ ڈور بھی۔ لودو سے  
لے کر کرکٹ تک۔ سب کھیلا جاتا۔ پھر مقابلہ بازی ہوتی۔ اور ریفری  
کے فرائض اکثر عاطف کو انجام دینا پڑتے۔

وہ مسکرا مسکرا کر سب کو دیکھتا رہتا۔ محفوظ ہوتا رہتا۔ اور آخر میں؟  
اس کے ریفری ہونے کا ایک فائدہ ہوتا تھا کہ مار کبھی بھی کسی کو گلے سے نہ لگانا  
پڑتی تھی۔ ہمیشہ ہر مقابلہ برابر چھوٹتا۔

ان معصوم معصوم دلوں میں سے کوئی ایک بھی توڑنا اسے گوارہ نہ تھا۔  
اوریوں یہ دن پر لگا کر بھی نہیں بلکہ کسی راکٹ میں بیٹھ کر اسی رفتار سے  
اڑ گئے تھے۔ جس رفتار سے اپلاو گیارہ یا بارہ نے چاند کا سفر طے کیا تھا۔ !!  
بڑی دیر یہی کچھ سوچتا رہا۔ پھر صاعقہ اس کے لیے چائے لے کر آگئی۔

”واہ بھئی واہ۔! جیتی رہو صاعقہ رانی۔!“ عاطف اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
”تاؤ تو دوسرے کمروں میں کیا کیا ہو رہا ہے۔؟“

”ہونا کیا ہے۔ سمیں اپنی، نازی اپنی اور جبین تو لمبی تان کر سوئی ہوئی ہیں۔  
اور اظفر بھائی اور ندیم بھائی کا کمرہ اندر سے بند ہے۔“  
”وہ بھی ابھی سو رہے ہوں گے۔؟“

جانے کیا بات تھی۔؟ آج آٹھ کھلتے ہی موڈ پر کچھ سنجیدگی سی طاری تھی۔  
نہا لیتا تو شاید کچھ تر و تازہ ہو جاتا۔ مگر طبیعت ہی نہیں چاہی۔ کچھ دیر اسی طرح سستی  
سے لیٹا چائیاں لیتا رہا۔ اور ان بھاگتے دنوں کے متعلق سوچتا رہا۔  
واقعی سمیں بڑی بد نظر تھی۔ کیسے منہ بھر کے کہہ دیتا تھا کہ اس کی چھٹی کے ابھی  
پورے پچیس دن باقی تھے۔! ایسی نظر لگی۔ ایسی نظر لگی۔ کہ دیکھتے ہی دیکھتے  
بارہ دن اور کچھ اتنی تیزی سے گزر گئے کہ پتہ ہی نہ چلا۔ اب صرف تیرہ دن باقی  
رہ گئے تھے۔ انہوں نے بھی ایسے ہی گزر جانا تھا۔!

ان محفلوں کو چھوڑ کر واپس ڈیوٹی پر جانے کو ذرا بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔  
سارا سارا دن تانش چلتی تھی۔ ہر گھنٹے بعد صاعقہ گرم چائے یا کافی پیش کرتی تھی  
ساتھ ساتھ جبین اور صاعقہ کی نوک جھونک اور اظفر اور ندیم کی نت نئی  
مزاحمتیں۔! زندگی میں کچھ ایسے حسین رنگ بھر گئے تھے کہ دوسری ہر چیز  
دل اچاٹ سا ہو کر رہ گیا تھا

دوسرے تیسرے لالہ بھی آجاتی تھی۔ اس دن اس کا روزہ ایسا ٹوٹا  
اسے اس گناہ کا ایسا چبکا لگا کہ اکثر ویشتر توڑنے پر مجبور ہو گئی۔

کچھ خود اپنے دل سے ہوئی کہ اپنے گھر میں ایلی تھی۔ نہ کوئی بہن نہ بھائی  
اور یہاں ایک دم اتنی ساری ہم عمر بہنیں یا سہیلیاں اور اظفر اور ندیم جیسے  
شرارت کے پتے ہر دم ہنسانے والے مل گئے تھے۔! کچھ سمیں یا نازی اور

”میرا خیال ہے جاگ رہے ہیں۔ کوئی کھٹاک کھٹاک کی آواز نہ رہی ہے۔  
نجانے کیا کر رہے ہیں۔ حالانکہ روز تو اس وقت سو رہے ہوتے ہیں۔“

”امی اور رفو خالہ کیا کر رہی ہیں۔؟“

”وہ نماز پڑھ کے بیٹھی ہیں۔ پھر میں نے انہیں چائے دی۔ پی رہی ہوں گی اور  
باتیں کر رہی ہوں گی۔“

”اور تم اتنی صبح صبح کیا کرتی پھر رہی ہو۔ تم بھی سو جاتیں۔“

”آپ کے لیے چائے بنا نا تھی۔ اٹھا پڑا۔ در نہ نیند تو مجھے ابھی تک بہت

آئی ہوئی ہے۔“ صاعقہ نے کسل مندی سے جوابی لی۔

”صرف میری چائے کی خاطر تم روز اتنی صبح اٹھتی ہو۔؟“ عاطف نے

حیران سا ہوتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

”تم نہ اٹھا کر صاعقہ! خالہ ماں کس لیے ہے۔؟“

”آپ کو میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے اچھی لگتی ہے نا۔“ اور پھر آپ

اور ہیں ہی کتنے دن یہاں۔ آٹھ دس دن تک آپ کی چھٹی ختم ہو جائے گی اور آپ

چلے جائیں گے۔“ صاعقہ ادا سی سے بولی۔

عاطف نے بڑے پیار سے اس ننھی سی غصے لڑکی کی جانب دیکھا۔ جسے

سارا دن سب ہی بے وقوف بناتے رہتے تھے۔ صرف اس لیے کہ خاندان بھر میں وہ

بہ صورت سمجھی جاتی تھی۔

مگر۔۔۔ اس کے سینے میں دل کتنا خوبصورت تھا۔ یہ کسی کو کبھی دکھائی

نہ دیا۔!! خدا کا بنایا ہوا ہر انسان اپنے اندر کوئی نہ کوئی خوبی رکھتا ہے۔ لیکن

پہچاننے والی آنکھ ہر ایک کو نہیں ملتی۔!!

صاعقہ کمرے سے نکل گئی اور عاطف سوچوں میں بھرا رہ گیا۔

”عاطف۔!“

”جی امی۔!“ ماں کی آواز پر جلدی سے سگریٹ بجھاتے ہوئے عاطف

اُٹھ بیٹھا۔

”بیٹے! اگر جاگ رہے ہو تو ادھر میرے کمرے میں آ جاؤ۔ رفو بھی یہیں ہے۔“

رفو خالہ نے جتنا اسے پیار دیا تھا اتنا اسے کسی اور خالہ سے نہیں ملا تھا۔ باقی

دونوں خالہ امی سے کافی بڑی تھیں۔ خود امی ان کی عزت ماں کی مانند کرتی تھیں۔

اس لیے اولاد کے دلوں میں بے تکلفی کے پیار کی بجائے سہمی سہمی عزت اور احترام

ہی رہا۔

البتہ رفو خالہ تو خالہ کی خالہ اور دوست کی دوست تھی۔ خاصی بے تکلف

دوست۔!! اسی لیے ان کی اولاد اور ان بہن بھائیوں میں کبھی کوئی یہ فرق

نہ محسوس کر سکا کہ وہ بہنوں کی اولاد تھی۔ اکٹھے ہوتے تو یاسب رفیقہ خانم کے لگتے

یا رفیقہ خانم کے۔!!

ڈریسنگ گارڈن کی ڈوریاں باندھتے ہوئے عاطف نے سلیم پنے اور

ماں کے کمرے میں جا پہنچا۔ امی اسے آواز دے کر خود جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ انکا

پتنگ خالی پڑا تھا۔ دوسرے پر رفو خالہ لحاف کمر تک اوڑھے پتنگ کے کھڑے سے

ٹیک لگائے بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ عاطف دبے دبے پاؤں آگے بڑھا۔

”خالو جان کو یاد کرنے کا کیا یہ کوئی بہت موثر طریقہ ہے۔؟“ انکے کان

کے قریب منہ لے جاتے ہوئے عاطف بڑے زور سے بولا۔

”ہائے اللہ۔!“ وہ بڑبڑا کر پہنچ اٹھیں۔ آنکھیں کھولیں۔ سامنے عاطف

کھڑا مسکرا رہا تھا۔۔۔

”بڑے بدتمیز ہو۔۔۔! روز صبح صبح ڈرا دیتے ہو۔۔۔“

”رفو خالہ! میں اکثر سوچتا ہوں کہ آپ اتنی ڈرپوک کیوں ہیں۔؟ میرا خیال ہے کسی دن آپ کو کسی ماہر نفسیات کے پاس لے چلوں۔۔۔“ عاطف انکے پاؤں کی طرف سے لحاف اٹھا کر اس میں بیٹھ گئے ہوئے بولا۔

”یہ میری عمر ہے اب کسی ماہر نفسیات کے پاس جانے کی۔؟ اور یہ تم ادھر لیوں گئے آ رہے ہو۔؟ ماں کا خانا پلنگ دکھائی نہیں دے رہا۔؟“

”دے رہا ہے۔!“ عاطف نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تو پھر دہاں جا کر لیٹو۔ مجھے تنگ نہ کرو۔“

”آپ نے پھر مرتبے میں جانا ہے۔؟ پسینہ خالہ! کچھ وقت ہمارے لیے بھی نکال لیا کریں۔ خالو جان کے پاس تو عمر گزار لی اور باقی بھی گزاریں گی۔“

”دیکھو عاطف! اگر ایسی ہی بکواس کرنی ہے تو جاؤ اپنے کمرے میں ہی چلے جاؤ“

”کیا بات ہے۔؟“ رقیہ خاتم اندر آتے ہوئے بولیں۔ ”دن چڑھا اور تم خالہ بھانجے میں بچوں کی طرح نوک جھونک شروع ہو گئی۔“ اپنے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے لحاف اوڑھا۔

”یہ رفو خالہ بالکل اظفر اور ندیم پر گئی ہیں۔ ایک منٹ کے لیے بھی تو پنگو نہیں بیٹھتیں۔“

رفو خالہ عاطف کی اس بات پر اپنے بھاری بھر کم وجود کو دیکھتے ہوئے خود ہی تہمتہ لگا اٹھیں۔

”عاطف۔!“ کچھ ہنسی تھی تو آنکھوں میں آئے پانی کو صاف کرتے ہوئے

بولیں۔ ”تمہاری نلکے دن کی چھٹی باقی رہ گئی ہے۔؟“

”زیادہ کر آئیں خالہ۔ صبح اٹھتے ہی مجھے بھی یہی خیال آیا تھا۔ بس اسی وقت سے موڈ خراب ہے۔۔۔“

”لو بھلا یہ بھی کوئی موڈ خراب کرنے کی بات ہے۔ اب تم سکول یا کالج کے طالب علم تو ہو نہیں جو چھٹیاں ختم ہو جانے پر جی میلہ کرتے پھرو گے۔“ رقیہ خاتم بیٹے کو سمجھانے لگیں۔

”ایک ذمہ دار افسر ہو اب تو۔!“

”لیکن یہ مت بھولیے امی! کہ ایک انسان ہوں۔ اور انسان بنیادی طور پر آزادی پسند ہوتا ہے۔ خود پر ٹھونسی گئی کوئی بھی پابندی وہ رو رو کر ہی سہتا ہے۔“

پھر مسکرا کر رفو خالہ سے مخاطب ہوا۔

”چلو چھوڑیے اس ذکر کو۔ آپ رفو خالہ! کوئی چٹ پٹی سی بات سنائیں۔“

”چٹ پٹی کس قسم کی۔؟“

”کوئی خاندانی مسئلہ، کوئی تنازعہ۔ کوئی ادھر کی، کوئی اُدھر کی۔ آپ تو خاندان میں بیٹھی ہیں۔ آپ کو بہت ساری باتیں معلوم ہوں گی۔“

”کیا کر دگے سن کر۔؟“

”بڑی دل چسپ ہوتی ہیں یہ خاندانی سیاست کی باتیں۔! رشتہ داروں کی آپس میں لڑائی جھگڑوں کی باتیں۔! کوئی رشتہ نامہ نہ ہو سکے تو اس بنا پر دشمنی کی باتیں۔! لگائی بھائی کی وجہ سے کوئی فتنہ فساد پھیلے ہو۔ اس سے متعلق باتیں۔!! یہ سب خاصا پر لطف ہوتا ہے۔ میں نا اچھی۔!“

امی صرف مسکرا کر رہ گئیں۔ اور رفو خالہ صولت اور نا اہلی کی منگنی ٹوٹ جانے کی وجہ سے جو دونوں بڑی خالوں میں وسیع پیمانے پر جھگڑا ہو گیا تھا

اس کی تفصیل سننے لگیں۔ اسنادل چپ اور مزیدار قبضہ تھا کہ عاطف کا وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

ناشتے کے لیے بلاوا آیا تو خانساں کو ان کے لیے وہیں بھیج دینے کا حکم دے دیا گیا۔ ناشتے کے بعد بھی باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ رقیہ خاتم ملازما سے کام کروانے چلی گئیں۔ عاطف اور رفوخالہ یونہی بیٹھے رہے۔ بہت وقت گزر گیا۔ آخر صدمت اور نالہ کی داستان ختم ہو کے رفوخالہ نے تھکا تھکا سا سانس لیا۔

”واہ بھئی واہ! یہ خاندانی سیاست تو ملکی سیاست سے بھی زیادہ الجھا ہوا جال ہوتی ہے۔“ عاطف مسکرایا۔

”جتنا آج اُٹھتے ہی بور تھا۔ اتنا ہی مزہ آگیا۔ آپ کی صحبت اتنی پُر ہوتی ہے رفوخالہ! تبھی خانو جان آپ کی جدائی گوارا نہیں کر سکتے۔ آپ کو اتنا صرف آٹھ دس دن ہوئے ہیں اور دو تین ان کے خط آگئے۔“ پھر کسکا خالہ کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

”خالو جان خطوں میں کیا لکھتے ہیں؟ کچھ نہیں بھی بتائیے۔“

”چل ہٹ شریر۔!“ رفوخالہ کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”ہم میاں بیوی کے پرائیویٹ معاملات میں تم کیوں دخل دیتے ہو۔“

”دیکھئے نا اب میں بھی جوان ہوں۔ کل کو میری شادی بھی ہوگی۔ اور اُس کے بعد میری بیوی بھی اپنی بہن کے ہاں یونہی کئی کئی دن پڑاؤ ڈالے پڑی کرے گی۔“

”تم نہ جانے دینا اُسے۔“ رفوخالہ نے بیچ میں ہی اُسے ٹوک دیا۔

”کیسے نہ جانے دوں گا۔ ذرا پیار دلا رے آپ کی طرح گلے میں بائیں ڈال کر منائے گی تو ماننا ہی پڑے گا۔“

”بد تمیز! تم نے کب مجھے کسی کے گلے میں بائیں ڈالتے دیکھا ہے۔“ رفو خالہ کی ہنسی رک ہی نہیں رہی تھی۔

”توبہ! توبہ! نغوذ باللہ! یہ میں نے کب کہا کہ کسی کے گلے میں بلکہ صرف خالو جان۔“

”خبردار! آگے بکواس کی تو مار کھا لو گے۔“ رفوخالہ نے اپنے اوپر مضوی غصہ طاری کرنے کی ناکام کوشش کی۔

”ادھر! میرا مطلب تھا کہ ہر بیوی یونہی اپنے خاندان کو مناتی ہوگی تبھی تو ساری دنیا کے مرد اپنی اپنی بیوی کے اشاروں پر ناپتے ہیں۔ اور پھر میری بیوی بھی یقیناً ایسے سب ناز و خمرے دکھائے گی۔“

”اتنی! اتنی جی!!“ دروازے میں سے صاعقہ کا گھبرا یا گھبرا یا چہرہ نمودار ہوا۔

”کیا ہے۔؟“

”دہ نازی آئی آپ کو بلارہی ہیں۔“

”یہ آج سب لڑکیاں صبح سے کہاں غائب ہیں۔؟“ عاطف اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”جاؤ عاطف! جا میرا بیٹا! ذرا جا کر دیکھ تو سہی کہ نازی پر کیا اقتاد پڑی ہے۔“ رفوخالہ بے حد کاہل واقع ہوتی تھیں۔

”رفوخالہ! کبھی کبھی آپ بھی اپنی جگہ سے ہل جایا کریں۔“ عاطف

شرارت سے بولا۔

”کچھ صحت اچھی ہو۔ ورنہ ساری عمر کوئی دھان پان سی رہیں گی۔“  
 ”تم جانتے ہو یا رقیہ آپا کو بلاؤں؟“  
 ”مگر بلایا تو آپ کو گیا ہے۔“

”ماں ائی! نازی آپنی نے آپ ہی کو بلایا ہے۔“

”اس نگوڑی نازی کو تو پتہ نہیں کیا خدا کی مار ہے۔ کوئی نہ کوئی  
 مصیبت پڑی ہی رہتی ہے اس پر۔“ رفوخالہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر جوتی  
 ڈھونڈنے لگیں۔ عاطف ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکراتے جا رہا تھا۔

”تم میرے سر پر کیوں سوار ہوئی کھڑی ہو۔؟ اب دفان ہو جاؤ۔  
 میں آ رہی ہوں۔“ چیل گھسیٹی گھسیٹی صابقتہ کے پیچھے چلی دیں۔

عاطف پہلے تو مسکرا مسکرا کر انہیں دیکھتا رہا پھر نفیض طبع کی خاطر لڑکیوں  
 کا تماشا دیکھنے وہ بھی پیچھے چل دیا۔

باورچی خانے میں بڑی چیل پہلی تھی۔ رقیہ خانم کا باورچی خانہ سارے خاندان  
 میں مشہور تھا کہ جہاں بھی کہیں رہیں بہت بڑا بنوایا، تنگ یا چھوٹے باورچی خانے  
 میں وہ گزارہ کر ہی نہیں سکتی تھیں۔

اور اس وقت رقیہ خانم کا فہمی مشہور و معروف وسیع و عریض باورچی خانہ  
 کوئی تنگ سی جگہ معلوم ہو رہا تھا۔ اور اس کی تنگی کی وجہ وہاں موجود  
 بھیڑ تھی۔

سیمیں، نازی، جبین، صابقتہ، انظر اور ندیم کے علاوہ خاندان کا  
 بلو اور بلو کی بڑی بہن ملی بھی وہیں تھے۔

”لا حول و لا قوۃ! یہ سب شیاطین یہاں کیوں جمع ہیں۔؟“

عاطف جاتے ہی حیرت سے چلایا۔  
 ”شیاطین صرف تین ہیں۔ باقی سب خاتین ہیں۔“ سیمیں مسکرا کر بولی۔  
 ”مگر یہ ہو کیا رہا ہے۔؟“ رفوخالہ کو اندر گھٹن میں جانے کی ہمت  
 نہ ہوئی۔ دروازے میں ہی ٹھٹھک کر بولیں۔

”خانہ داری۔! جبین نے مختصر سا جواب دیا۔

”خانہ داری۔؟“ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ”یہ کیا بکواس ہے۔؟“  
 ”رفوخالہ! آج ہم سب میں کھانا پکانے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔“

”مقابلہ۔؟ کیا مطلب۔؟“

”کہ دیکھیں سب سے زیادہ مزیدار سالن کون بناتی ہے۔!“ نازی  
 ماں کے قریب اکھڑی ہوئی۔

”اور انظر اور ندیم کیا کر رہے ہیں۔؟“ رفوخالہ نے دور سے ہی  
 باورچی خانے کے پرلے کونے میں ان کے سر دیکھ کر ڈانٹنا شروع کر دیا۔

”چلو تم لکھو باہر۔ لڑکیوں کے کام میں تمہیں گھسنے کی کیا ضرورت ہے۔؟“  
 ”ہم لالہ آپا کے اسٹنٹ ہیں۔“ انظر نے دیہی سے سرنکال کر جواب دیا۔  
 ”لالہ بھی آئی ہوئی ہے۔؟“

”ابھی نہیں۔ بس آنے ہی والی ہوں گی۔ وہ بھی تو اس مقابلے میں شامل  
 ہو رہی ہیں۔“ ندیم بڑے مزے میں بولا۔

”آج کا مقابلہ ونڈرفل ہوگا۔“

”امی! آپ سے ایک بڑی ضروری بات پوچھنا تھی۔“ نازی نے ماں کو مخاطب کیا  
 ”کیا۔؟“

عاطف بڑے غور سے ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ جین، نازی اور سیمیں دیکھنے کے بعد اس سمت بڑھ گیا جدھر اظفر اور ندیم لالہ کی جگہ محفوظ کیے ہوئے تھے۔

نجانے کیوں لالہ کو آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ دونوں بڑے پریشان تھے ایسے جب تک وہ آتی ان دونوں نے اپنی دانست میں اس کا کافی کام نہ سنا چڑھتا تھا۔ کتنا سارا اور کچھیل کاٹ کر رکھا ہوا تھا۔ جب بے ڈھنگے موٹے موٹے سے ٹکڑے تھے۔ عاطف کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی۔ ہرے دھنیے کی ٹہنیاں کاٹ کر ایک ایک پتا الگ کر کے علیحدہ رکھا ہوا تھا۔

اور اب اظفر پیاز کاٹ رہا تھا۔ اور ندیم لہسن چیل چیل کر رکھ رہا تھا۔ خاصی بڑی بڑی ڈھیری لگائے کھڑے تھے۔ پیاز کے کاٹنے سے دونوں کی آنکھوں سے پانی بہ رہا تھا مگر انہیں کوئی پرواہ نہ تھی ساتھ ساتھ مسلسل باتیں کیے جا رہے تھے۔ اور جانے کیا بات تھی ہنس ہنس کر بے حال ہوتے جا رہے تھے۔

”ارے! یہ تم کیا کر رہے ہو۔۔۔؟“

عاطف کی آواز پر دونوں یوں چونکے جیسے کوئی جرم کرتے پکڑے گئے تھے! ”کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔“ مارے گھبراہٹ کے دونوں ہی ہلکانے لگے اور رخساروں پر بہتا پانی پونچھنے لگے۔

”یہ کچھ نہیں کر رہے ہو۔۔۔؟“ عاطف نے دونوں کے ہاتھوں کی جانب اشارہ کیا۔

سیمیں بھاگ کر قریب آگئی۔ اتنا ڈھیر سارا اورک، پیاز، دھنیا اور چھلا ہوا لہسن دیکھ کر چیخ اٹھی۔ ”یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔؟“

وہ آگے بڑھ کر ماں کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ جو کچھ پکار ہی تھی شاید اس سے متعلق ماں سے کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی۔ عاطف نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔ آگے بڑھ کر باورچی خانے کا جائزہ لینے لگا۔

نازی، سیمیں، جین اور لالہ کے درمیان یہ مقابلہ ہونے والا تھا۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کون کیا چیز پکا رہی تھی۔ ہر ایک کو اپنی پسند کی چیز منتخب کرنا تھی۔ اور بہترین پسند کے بھی کچھ نمبر تھے۔

باورچی خانے کے چاروں کونوں میں ایک ایک چولہا دھرا تھا۔ خانسالاں کو بالکل چھٹی دے دی گئی تھی اور نہ صرف اسے ہی بلکہ اس کی بیوی کو بھی اپنے گھر کے کام سے چھٹی تھی۔ ایک تو ان کا چولہا جین اٹھا لائی تھی۔ دوسرے ایک نہیں۔۔۔ دو نہیں۔۔۔ اکٹھے چار سالن بن رہے تھے پھر انہیں گھر میں پکانے کی کیا ضرورت تھی۔ سیمیں کی حاتمہ طبیعت نے اسی زعم میں انہیں آج دو پہر اپنے دسترخوان پر مدعو کر ڈالا تھا۔!!

اب ہر پکانے والی کو ایک اوپر والا کام کرنے والے کی بھی ضرورت تھی۔ نازی کے جھٹے میں صاحبہ آئی تھی جین کے بلی اور بلو کو سیمیں نے اپنا اسسٹنٹ بنا لیا تھا۔ لالہ کے لیے اظفر نے اپنا آپ پیش کر دیا۔

لڑکیوں میں سولائے لالہ کے اس کی کسی اور کے ساتھ بنتی ہی نہیں بنتی۔ یوں بھی بہت سوچ بچار کے بعد بھی کوئی ایسا فرد انہیں نہیں مل سکا تھا جو لالہ کا ہاتھ بٹاتا

مالی کی بیوی بچوں سمیت میکے گئی ہوئی تھی اور وہاں کوئی اور تھا نہیں۔

لالہ کے لیے اظفر کی پیش کش غنیمت تھی اور خالہ کے گھر آکر ندیم کے بغیر اظفر کی تکمیل ہی نہیں ہوتی تھی۔ لہذا اظفر اور ندیم دونوں ہی لالہ کے اسسٹنٹ تھے



جلدی جلدی سویرا آتا رہا۔ کمرس ایپر نہ باندھا اور کام کے لیے مستعد ہو گئی۔  
 ”میر تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ لپکا کیا رہی ہیں۔“ اظفر نے دھیرے  
 سے پوچھا۔

”گوشت منگوایا ہوا ہے نا۔“  
 ”جی ہاں۔ یہ دیکھئے۔“ ندیم نے جلدی سے پلاسٹک کی ایک چھوٹی  
 سی ٹرے اس کے سامنے لا رکھی۔

عاطف ابھی تک وہیں کھڑا ان کی کارکردگی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ خصوصاً  
 اظفر اور ندیم کی افراتفری قابلِ دید تھی۔  
 ”پھر۔۔۔ آپ نے بتایا نہیں لالہ آپ بنا کیا رہی ہیں۔“ اظفر  
 نے دوبارہ بتائی سے پوچھا۔

لالہ نے اسے بتانے سے پہلے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ عاطف اسی کی  
 جانب دیکھ رہا تھا۔ مسکرائی۔ اور پھر اظفر اور ندیم کی گردنوں میں بازو ڈال  
 کر قریب کھینچتے ہوئے سرگوشی میں کچھ کہا۔

”یہ اسٹو کیا بلا ہوتی ہے۔“ ندیم حیران ہو کر بلند آوازیں بول پڑا۔  
 ”اچھا! اسٹو بن رہا ہے۔“ عاطف مسکراتے ہوئے بولا۔ ”جیسی پھر  
 تو ہم اس پارٹی کے مہمان ہوں گے۔“

”آہستہ بولیے۔“ اظفر نے آگے بڑھ کر جلدی سے عاطف کے منہ پر ہاتھ رکھ  
 ”آج کے مقابلے کی سب سے بڑی پُرلطف بات تو یہی ہے کہ ایک کو دوسرے  
 کی چیز کا علم نہیں۔ زبردست سپنس۔!“ پھر ندیم کو ڈانٹنے لگا۔ ”تم  
 ندیم ذرا اپنے منہ کے آگے سائیلنس لگا کر رکھو۔ ایک دم ہیٹ پڑتے ہو۔“

”سب کچھ پہلے تیار رکھیں گے نا۔ تاکہ لالہ آپ کو دیر نہ ہو جائے۔“ معلوم  
 نہیں ابھی تک آئی کیوں نہیں۔ خیریت ہو۔!“ اظفر نے تشویش کا اظہار کیا  
 ”تم دونوں کے دونوں ہی پاگل ہو۔!! ہر چیز اتنی زیادہ۔“

”کیا سہ کس چیز کی کتنی ضرورت پڑ جائے۔“  
 ”کچھ بھی ہو۔ اتنے زیادہ اس بیاز کی ضرورت کبھی نہیں پڑے گی۔ دیکھ آ  
 پکانا نہیں اسے۔ لاؤ تھوڑا سا بجھے دسے دو۔ میں نے ابھی نہیں بنایا۔“

”کبھی نہیں۔“ دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ ”آپ اس لیے کہہ رہی  
 نا کہ یہ چیزیں کم پڑ جائیں اور لالہ آپ کا مٹا بلہ مار جائیں۔“  
 ”نہ سہی۔ دیوانے۔!!“ سیمیں ہنستے ہوئے واپس اپنی جگہ پر چلی گئی۔

”ارے لالہ آپ ابھی جاؤ آب ورنہ ہار جاؤ گی۔“ ندیم زمیں پر پاؤں پٹختے ہوئے  
 بڑی بے تابی سے باورچی خانے سے باہر نکلیں دوڑانے لگا۔

”فکر نہ کرو۔ وہ نہیں ہار سکتیں۔“ اظفر نے بڑے اعتماد سے ندیم  
 تسلی دی اور جانے پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا کہا کہ دونوں ہی ہمتہ لگاؤ  
 ”کیوں یار! کیا بات ہے۔؟ بڑے قہقہے چھوٹ رہے ہیں۔“ عاطف

ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔  
 ”کوئی بات نہیں۔“ اظفر پھر گڑبڑا گیا

”لو۔ وہ لالہ آپ آگئیں۔“ ندیم خوشی سے چلایا۔  
 ”لالہ! کہاں رہ گئی تھیں۔؟“ سیمیں نے گردن موڑ کر پوچھا۔  
 ”وہ ذرا امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میرا تو آنے کا ارادہ ہی ہ  
 گیا تھا مگر امی نے زبردستی بھیج دیا۔“ لالہ نے ذرا بھی وقت ضائع کیے

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ پاس ہی کھڑے ہیں۔“  
 ”نہیں بھی تو اظفر جبین نہیں آ رہا تھا۔“ لالہ نے اظفر کو دوش دیا۔  
 ”کام ہوتا جاتا دیکھتے جاتے۔ سارا راز صرف تمہارے بار بار پوچھنے  
 کی وجہ سے چوپٹ ہوا ہے۔“

عاطف مسکرایا۔

”تم آپس میں کیوں لڑنے لگے۔ کچھ چوپٹ ووپٹ نہیں ہوا۔ فکر نہ کرو میرے  
 سوا کسی نے نہیں سنا۔ اور مجھے سب کا علم ہے کہ کون کیا پکار رہا ہے۔؟“  
 ”عاطف بھائی۔!“ اظفر نے خوشامدی انداز میں عاطف کے گلے

میں باپیں ڈال دیں۔

”بھلا بتائیے تو وہ تینوں کیا کیا پکار رہی ہیں۔؟“  
 ”بتاتا ہوں۔ لیکن پھر پہلے انہیں بتاؤں کہ یہاں کیا ہی رہا ہے۔“  
 ”ارے نہ نہ۔“ اظفر نے جلدی سے اس کا راستہ روک لیا  
 ”یہ اچھی راز داری ہے۔؟“

”اور ان کے ساتھ بھی میری ایسی ہی راز داری ہے بیٹے۔!“  
 ”اچھا پھر پرانے مہربانی آپ اندر تشریف لے جاسیے۔ یہاں لڑکیوں؟“  
 ”آپ کا کیا کام۔؟“  
 ”میں جناب کے فرمانے سے پہلے ہی جا رہا ہوں۔ واقعی میرا لڑکیوں میں ک

کام۔! تم دونوں تو نجانے کونسی مخلوق ہو۔!“  
 عاطف ہنستے ہوئے باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔ لڑکیاں سبھی ادھ  
 مصروف تھیں۔ امتی جمعدارنی سے صفائی وغیرہ کردار ہی تھیں۔ ایک فوجدار

ہی رہ گئی تھیں۔

اور اس اکیلے پن کے عالم میں ان کی باغ و بہار قسم کی صحبت میسر آجائے  
 تو اور کیا چاہیے تھا۔؟ سیدھا رنوخالہ کے پاس جا پہنچا۔ یوں بھی وہ داستان  
 کا پیارہ تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں پھر کوئی خاندانی قصہ چھڑ گیا۔ دلچسپ اور  
 طویل۔! وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

باتوں اور ہنسی کی آواز کے شور سے دونوں چونکے۔ سیمیں، نازی جبین  
 اور لالہ اندر داخل ہوئیں۔ اتنی دیر باورچی خانے کی گرمی کھاتی تھی۔ چہرے  
 دھک رہے تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھری تھیں۔

اندر آتے ہی نازی ماں کے پاس صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ سیمیں لمبے لمبے  
 سانس لیتی قالین پر اوندھی لیٹ گئی۔ جبین نے آتے ہی ریڈیو گرام کھول  
 دیا اور اس کے پاس نیچے بیٹھ کر اپنی پسند کے ریکارڈ چھانٹنے لگی۔

لالہ کا نہ یہ اپنا گھر تھا اور نہ جبین اور نازی کی ماں کا گھر کے لیے بے تکلفی۔  
 کہ لیٹ جاتی یا ریڈیو گرام لگا کر اور خوبصورت دھنوں کے ساتھ تھرک تھرک کر  
 اپنی تکان اتار لیتی۔ عاطف بھی وہیں تھا۔ ایک غیر مرد، نا محرم۔  
 بسٹ کر کونے والے چھوٹے صوفے پر الگ تھلک بیٹھ گئی۔

”ہو گیا کام ختم۔؟“ رنوخالہ نے پوچھا  
 ”ہاں۔“ سیمیں سر اٹھا کر بولی۔ ”اور اب ذرا آپ کھانے والے  
 ٹرے میں تشریف لے چلیے نا۔“

”کیوں۔؟“

”بھوک نہیں لگی کیا۔؟“

”کیا وقت ہو گیا۔؟“ سٹپا کر روف خالہ نے کھڑی دیکھی۔

”ارے! یہ تو دو بج گئے ہیں۔ مجھے تو واقعی بڑی بھوک لگ گئی۔“

”روف خالہ! وقت دیکھ کر آپ کو بھوک لگتی ہے۔؟“ عاطف نے پوچھا

”لگتی تو بغیر وقت دیکھے ہی ہے مگر اس وقت دو بجے کا سن کر احساس

بڑھ گیا۔“

”تو چلیے پھر۔ ابھی تو آپ کو کچھ دیر کے لیے جج کے عہدے پر بھی

فائز ہونا ہے۔“ سیمیں مسکراتے ہوئے بولی

”یہ کام اپنی ماں سے کرانا۔“ روف خالہ نے صاف جواب دے دیا۔

”کیوں؟ آپ غیر جانبدار نہیں رہ سکتیں۔؟“ عاطف نے مسکرا کر پوچھا

”سب ہی میری اپنی ہیں۔ جانبداری اور غیر جانبداری کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ میں نے تو صرف اس لیے کہا تھا کہ بھوک بے حد لگی ہے اور جب بھوک

تنگ کر رہی ہو تو ذلتے کا احساس نہیں رہتا۔“ ساتھ ہی اٹھ کر کھڑی ہو کر

”آپ سب جلدی سے آجاؤ۔“

”روف خالہ! ماشاء اللہ آپ کا معدہ وقت کا اور کام کا بڑا پابند ہے۔“

عاطف نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یاد نہیں۔ صبح مجھے تو باتوں میں لگائے رکھا اور خود ناشتہ کرتے

رہے۔ میں نے صرف چائے کی تین چار پیالیاں ہی لی تھیں۔ کھایا کچھ بھی نہیں

عاطف کا بازو پکڑ کر کہنچا۔

”چلو اٹھو۔ اور ابھی تو یہ بھی دیکھنا ہے کہ انہوں نے کیا کیا کچھ بنایا ہے

عاطف ان کے ساتھ چل پڑا۔ دروازے کے قریب ہی صوفے

لالہ ملی بھی تھی پاس سے گزرتے ہوئے مسکرا کر پوچھنے لگا۔

”وہ لالہ کی بچی! تمہارے دونوں چیلے کہاں ہیں۔؟“

”دیکھئے بھائی جان! اگر آئندہ آپ نے اسے لالہ کی بچی کہا تو مجھ سے بُرا

کوئی نہ ہو گا۔“ سیمیں اٹھ کر اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔

”تم سے بُرا تو اب بھی کوئی نہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہو۔“

”آپ بُرے ہوں گے۔ میری سیمیں آپنی تو اتنی اچھی ہیں۔“ جبین بھی

ریڈیو گرام بند کرتے ہوئے ان کے پیچھے آگئی۔

”تم لڑکیاں تو شاید کوئوں کی برادری سے تعلق رکھتی ہو۔ فوراً ایک دوسری

کی مدد کو پہنچتی ہیں۔“ عاطف یہ کہتے ہوئے جلدی سے کمرے سے باہر

نکل گیا۔ اور سیمیں اور جبین بڑبڑاتی رہ گئیں۔

”لالہ آپا! نازی آپنی!! اٹھیے نا آپ بھی۔ ابھی تو سب کچھ گرم ہو گا۔

دوبارہ گرم کرنے سے چیز کا وہ مزہ نہیں رہتا۔“

سب آگے پیچھے کھانے والے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”صاعقہ کہاں ہے۔؟“ روف خالہ نے انظر اور ندیم کو پیشتر ہی دہاں موجود

پایا۔ صرف صاعقہ غیر حاضر تھی۔

”باورچی خانے میں۔“ ندیم نے جواب دیا۔

”وہاں کیا کر رہی ہے۔؟“

”گری پڑی چیزیں اٹھا اٹھا کر کھا رہی ہوگی۔“ انظر جلدی سے بولا۔

”تم جیسی کمینہ نہیں ہے۔“ جبین نے جیس جیس ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ تو ہر وقت کباب بنی رہتی ہے۔“ انظر نے جبین کے سر پر چپٹ لگائی۔

”کچھ اور پکانے سے بہتر تھا تم خود کو ہی پٹیٹ میں سجا کر پیش کر دیتیں۔“  
 ”آج حقو! یہ جلا ہوا کباب —!! مکھیاں بھگتی رہتیں مگر کوئی ہاتھ نہ لگا  
 ندیم کب پیچھے رہنے والا تھا۔“

”ندیم کے بچے! کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھا ہے تم نے۔“  
 ”جی ہاں جی! بولی۔“

”کبھی بار — پھول ہی پھول دکھائی دیے — تنگفتہ اور تروتازہ۔!!“  
 ”یہ تم دونوں ہر وقت میری بچیوں کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہو؟ جا  
 کب رقیہ خانم اندر آگئی تھیں۔ بڑے غصہ سے بولیں۔“

”رفو! تم انہیں منع کیوں نہیں کرتیں؟“  
 ”آپا! سب کی زبانیں ایسے کتر کتر چلتی ہیں کہ کسی اور کو بات کرنے کا مو  
 ہی نہیں ملتا۔ منع کیا خاک کروں انہیں۔“

”چلو سب آرام سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔“ رقیہ خانم نے سب کو  
 ”امی! ہم بیٹھ جائیں گی۔“ سیمیں جلدی سے بولی۔ ”پہلے ذرا آب  
 نج کی کرسی پر تشریف رکھیں نا۔“

رقیہ خانم مسکرا پڑیں۔ عجیب عجیب کھیل کھیلتے تھے سب بل کر۔  
 معمولی ہوتی تھی۔ مگر بحث نے آنا طول پکڑا کہ مقابلہ بازی تک نوبت آگئی۔  
 سامنے ہی یہ سب کچھ طے پایا تھا۔

انسان کے دل میں مقابلے کا جوش ہو تو یہ بری بات نہیں۔ ایک  
 سے کچھ سیکھتا ہے اور پھر کچھ بننے اور آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے  
 سوچ کر انہوں نے انہیں اجازت دے دی تھی!۔

رقیہ خانم نے اپنے ساتھ والی کرسی پر ٹو خالہ کو بٹھالیا۔ ان کی دوسری  
 جانب عاطف خود ہی جلدی سے بیٹھ گیا۔

صداقت نے سب کو کھانے والے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو جھاگ  
 کر بلا اور ملی کو بھی تماشہ دکھانے کے لیے بلا لائی۔ ان کے پیچھے خانسماں اور اکی  
 بیوی بھی آگئے۔ صبح سے گھر میں آنا شور مچا ہوا تھا۔ سبھی کے دلوں میں تجسس  
 اور مقابلہ دیکھنے کا شوق تھا۔

بڑا خوشگوار سا ماحول تھا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹیں تھیں۔ لالہ، جبین،  
 نازی اور سیمیں کے دل البتہ دھک دھک کر رہے تھے۔ اظہار اور ندیم  
 چپ چاپ لالہ کی پرلی طرف کھڑے تھے۔ خانسماں کی بیوی اور بچے بڑے  
 اشتیاق سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

مقابلہ میں بیٹھنے والوں میں جبین سب سے چھوٹی تھی اس لیے سب سے  
 پہلے اُسے ہی اپنی دُش لانے کو کہا گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے اُس نے دُش  
 رقیہ خانم کے سامنے لا رکھی۔ اُس وقت اس کا چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔

رقیہ خانم نے دھکنا اٹھایا۔ جُسنے ہوئے قیے سے دُش بھری ہوئی تھی اور  
 اُس کی سطح اُبلے ہوئے اندڑوں کے قتلوں کے ساتھ بڑے خوبصورت طریقے سے  
 سجی تھی۔

قیمہ کیسا ہی پکا ہوا نلکے۔ اس کے پیش کرنے کا انداز عاطف کو اتنا بھایا کہ  
 دل ہی دل میں اس نے اسے فرسٹ ڈویژن پاس کر دیا۔

رقیہ خانم نے دُش میں سے تھوڑا سا پلیٹ میں نکالا اور چمچ میں لے کر منہ  
 میں ڈال لیا۔ سب دم بخود تھے۔ اور جبین دھک دھک کرتے دل کو تھامے

بڑی امید و بیم سے خالہ کے چہرے کو دیکھ رہی تھی —  
 تھوڑا سا چہرہ رقیہ خانم نے ایک دم ٹھٹھک کر جبین کو دیکھا اور پھر اٹھا  
 جلدی سے "آخ تھو" کر کے بیسن میں پھینک دیا اور پانی سے کلیاں کرنے لگیں۔  
 "کیا ہوا —؟" روفالہ نے چھکنے کے لیے گھبرا کر چچ بھر کے منہ میں رکھ  
 لیا۔ لمحہ بھر بعد وہ بھی تھوکنے کے لیے بیسن کی طرف لپکیں —  
 رقیہ خانم تو چپ چاپ واپس آکر بیٹھ گئیں البتہ روفالہ کے تن بدن  
 میں اک آگ سی لگ گئی —

"اس جبین نگوڑی کو نجانے کب کوئی طریقہ سلیقہ آئے گا۔ دوسری جماعت میں  
 ہو گئی۔ یہ معمولی قیہ پکانا ابھی تک نہ آیا۔ سارا جلا جلو کے کڑوا کر کے رکھنا  
 فیشن دنیا بھر کے کوئی اس سے سیکھے —"

"امی! یقین کیجئے۔ ذرا بھی تو نہیں جلا۔ نجانے کڑوا کیوں ہو گیا۔  
 جبین وہیں کرسی پر بیٹھ کر رونے لگی۔ "میں نے تو اتنی احتیاط سے پکایا تھا۔  
 "اب رو رو بیٹھ کے اپنے نصیبوں کو۔ جسے کوئی طریقہ سلیقہ نہیں آتا۔  
 کے نصیب بھی پڑے ہی ہوئے ہیں۔" روفالہ مسلسل بڑبڑاتے جا رہی تھیں  
 "لاؤ نازی بیٹی! تم دکھاؤ۔ تم نے کیا بنایا ہے۔؟" رقیہ خانم  
 کو خاموش ہو جانے کے لیے ٹھوکا دیتے ہوئے نازی سے مخاطب ہوئی۔  
 "سہیں! پہلے تم۔" جبین کا حشر دیکھ کر نازی بھی سہم گئی تھی —

سہیں کو نازی پر ترس آگیا۔ ویسے بھی اسے خود اپنے پکڑنے کے فن پر بڑا  
 تھا۔ اپنی ڈنٹ لے جا کر ماں کے آگے رکھ دی۔ ڈھکنا ہٹا۔ تورنے کی  
 انہی طرح سرخ سی تھی کہ بے اختیار سب کی جھوک چمک اٹھی۔  
 "واہ بھئی واہ! یہ تو میری پسندیدہ چیز ہے۔" روفالہ نے ڈنٹ اپنے آگے  
 گھسیٹ لی۔ پلیٹ میں نکالنے کی بھی انہوں نے ضرورت محسوس نہ کی۔ وہیں  
 سے چچ بھر کر منہ میں ڈال لیا۔  
 "استغفار!" ان کا حال بھی رقیہ خانم جیسا ہوا۔ بھاگیں کلی کرنے کیلئے!  
 عاطف کو سیمیں پر بڑا ناز تھا کہ اس کی بہن بہترین کھانا بنا جاتی تھی —  
 جبین تو خیر تھی ہی ابھی بچی۔ کوئی غلطی ہو گئی ہوگی۔ مگر سیمیں — اسے جیسے  
 روفالہ کی اس حرکت پر یقین نہ آیا۔ آگے بڑھ کر خود چکھنے لگا۔  
 "ہائیں! یہ کیا ہو گیا۔؟" بڑی حیرت سے وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھ  
 رہا تھا۔ نمک اتنا زیادہ تھا۔ اتنا زیادہ — کہ ذائقہ کھڑوا سا ہو گیا تھا۔ ذرا سا  
 بھی زبان کو لگایا نہیں جا رہا تھا۔  
 آج یہ سیمیں کو ہو گیا تھا۔؟ ورنہ نمک مرچ وغیرہ کا اس کا اندازہ تو  
 بالکل درست ہوا کرتا تھا۔ شاید بھولے سے دوبار نمک ڈال گئی تھی۔ مگر نہیں  
 اس سے ایسی غلطی کی توقع نہیں تھی۔ ضرور کوئی اور معاملہ تھا۔ عاطف کا ماتھا ٹھنکا۔  
 "نازی! تم دکھاؤ نا۔" عاطف نے جلدی سے نازی کے ہاتھ سے  
 اس کی ڈنٹ چھپٹ لی —  
 اس نے مغز پکائے ہوئے تھے۔ خوشبو بے حد اشتہا انگیز تھی۔ مگر  
 چکھتے تو مزہ جبین اتنی زیادہ تھیں کہ انہیں کھانا کسی انسان کے بس میں نہ تھا۔ بالکل  
 ذرا سا زبان پر رکھا تھا۔ حلق تک جل اٹھا۔!  
 سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔  
 "کیوں یہ سب کسی کی شرارت تو نہیں۔" عاطف نے سوچتے ہوئے کہا۔

”شرارت کیا ہوگی۔“ اوراصل یہ بیٹوں کی میوں، سودہی، حاصی، چھوہریں۔“

اظفر جلدی سے بولا۔

”کچھ آتا جاتا ہے نہیں۔ چلی تھیں مقابلہ بازی کرنے۔“

”اور کسی سے بھی نہیں۔؟ ہماری لالہ آپا سے۔“ ندیم نے بڑے فخر سے

تن زہما۔

”نہیں نہیں۔ سیمیں اور نازی کے ہاتھ کی کچی ہوئی چیزیں تو ہیں کئی بار کھا چکی ہوں۔ مجھ سے بھی اچھا لپکتی ہیں۔“ لالہ بول کھلا کر بولی۔

”آپ مارے مردت کے کہہ رہی ہیں۔“ اظفر نے کہا۔ ”چلیے خالہ امی کے آگے اپنی ڈش پیش کریں۔ ابھی پتہ چل جاتا ہے کہ کون کیا لپکتا ہے۔؟“

سیمیں، نازی اور جبین کا شہر دیکھ کر لالہ بڑی پریشان ہو گئی تھی۔

”نہیں۔“ رہنے دیں۔ یہ بھی خراب ہی ہوگا۔“ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

”ایسے ہی خراب ہوگا۔“ اظفر نے بڑے اعتماد سے کہا اور لالہ کے آگے سے ڈش اٹھا کر رقیہ خانم کے سامنے لے جا کر رکھ دی۔

”یہ دیکھئے خالہ امی! اسے چکھئے۔ آپ ہی معلوم ہو جائے گا کہ سگھڑ لٹکیاں کیسی ہوتی ہیں۔!!“

اور پھر۔۔۔ لالہ کا بنایا ہوا اسٹو سامنے تھا۔ کھڑے مصالحوں میں بٹھنے کے گوشن کے یہ ٹکڑے ہر ایک کو دعوتِ طعام سے رہے تھے۔

جبیں جو ابھی تک رو رہی تھی۔ رونا دھونا بھول سیدھی ہو بیٹھی۔ جانے کیوا

لاشتوری طور پر سب کے ذہنوں میں یہی خیال گردش کر رہا تھا کہ یہ تھیک ہوگا۔

اس میں ایسی کوئی خرابی نہ لگے گی۔

اظفر اور ندیم میز پر ہاتھ لٹکائے، آنا آگے جھک آئے تھے کہ عاطف کو انہیں ذرا پرے ہٹانا پڑا۔

مگر۔۔۔ اس کا ذائقہ تو باقی سب کی چیزوں سے بھی زیادہ خراب نکلا۔ اس میں مرچیں، نمک اور کڑوے پن کی زیادتی اتنی زیادہ تھی کہ ابکائی آرہی تھی۔ اُممہ سے لے کر حلق کے اندر تک کڑواہٹ سرایت کر گئی تھی۔

”کیوں۔؟ ہئے نالے ون۔“ اظفر نے پورے یقین سے عاطف سے پوچھا۔

”خود ہی کچھ کر دیکھ لو۔“ اور عاطف خود کھلی کرنے کے لیے اٹھ گیا۔

”نہیں نہیں۔“ اظفر نے یقینی سے بولا۔ ”لالہ آپا کا خراب نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔؟ وہ بھی ہم جیسی ہی لڑکی ہے۔“ جبین تلخی سے بولی۔

”ارے اظفر! کہیں غلطی سے لالہ آپا کی ڈش میں بھی تو نہیں ڈال دیا تھا۔؟“

ندیم نے مشکوک انداز میں اظفر کی جانب دیکھا۔

”چپ۔!“ اظفر نے گھبرا کر ارد گرد دیکھتے ہوئے ایکدم ندیم کا بازو تھام لیا اور کمرے سے باہر نکلنے کے لیے قدم اٹھائے۔

”کہاں چلے تم دونوں۔؟“ عاطف نے لپک کر دونوں کو روک لیا۔

”سچ سچ بتاؤ۔ ابھی کیا کہہ رہے تھے۔؟“

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ آپ خواہ مخواہ ہی ہمارے پیچھے پڑ گئے۔“

”تم نہ تین میں نہ تیرہ میں۔“

”تین میں نہ تیرہ میں۔!“ عاطف نے دانت پکچپائے۔ اور سارا وقت پھر باورچی خانے میں کیوں گھسے رہے تھے۔؟

”وہ تو ہم لالہ آپا کے اسٹنٹ تھے۔“

”اسٹنٹ کے بچو! بچو! بتاؤ کیا معاملہ ہے۔؟“

”اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو پھر لالہ آپا کی تو ٹھیک ہوتی۔“ اظفر نے دوسرا

نقطہ نکالا۔

”ان تینوں کے ساتھ ہم شرارت کر سکتے ہیں مگر لالہ آپا کے ساتھ تو نہیں نا۔“

”تم سے کچھ بھی بعید نہیں۔ تم ہر ایک کے ساتھ شرارت کر سکتے ہو۔ اور تو اور

اگر تمہارا بس چلے تو تم اللہ میاں کے ساتھ بھی شرارت کر آؤ۔“

”یہ اظفر! لالہ آپا کا اسٹو خراب مرنے کا بھید! ابھی تک میری سمجھ میں نہیں

آیا۔؟“ ندیم نے اپنی دانت میں اظفر سے سرکوشی کی تھی مگر عاطف نے سن لیا۔

”اور باقی سب کا جو بعید تمہاری سمجھ میں آگیا ہے بیٹے! ذرا وہ بتا دنا۔؟“

عاطف نے ندیم کا کان پکڑ لیا۔

ندیم اظفر کے مقابلے میں ابھی کچا تھا۔ ذرا ڈانٹ ڈپٹ ہوتی۔ جھٹ بک پڑتا۔

اور وہ عاطف کے قابو آگیا۔ ندیم اپنی ہی بیوقوفی کی وجہ سے پھنس گیا تھا۔ اظفر نے

خیریت اسی میں سمجھی کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ اور اسکا بھاگنا سب کو مزید مشکوک کر گیا۔

”تمہارے ابا آلیں۔ اس بار تو تمہاری کھال کھینچو اگر چھوڑوں گی۔“

رقیہ خانم نے غصے سے ندیم کو گھوڑا۔ باپ سے اس کی روح فنا ہوتی تھی۔

کا نپٹے ہوئے بولا۔ ”گرامی! اظفر نے سارا پروگرام بنایا تھا۔“

”کیا پروگرام بنایا تھا۔؟“

”کہ چپکے سے نظر بچا کر ان سب کی پکائی ہوئی چیزوں میں پسلی ہونی کو نہیں،

نمک اور مرچیں ڈال دی جائیں۔ تاکہ لالہ آپا جیت سکیں۔“

”لالہ کے لیے تم دونوں کے دلوں میں بڑی ماما چمکتی ہے۔ پھا پھا کسٹیاں

کیں کی۔!!“ بیسمن نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”آپ سب ہم سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں اور لالہ آپا سے کوئی شرارت بھی کریں

تو کچھ نہیں کہتیں۔“ ندیم ردنی سی صورت بناتے ہوئے گھگھیا گھگھیا کر بولا

”پھر کیسے نہ ان کی طرف داری کریں۔؟“

”مگر آج تو پھر اس سے بھی دشمنی ہو گئی۔“

”ایمان سے ابکی دُشمن میں تو ہم نے بالکل نہیں ڈالا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہو گیا؟“

پھر کچھ سوچتے ہوئے لالہ سے مخاطب ہوا۔

”لالہ آپا! آپ نے نمک مرچ کہاں سے ڈالی تھی۔؟“

”وہ تو نازی سے لے کر ڈالی تھی البتہ آخر میں دُشمن پر گرم مصالحوں جو چھڑکا تھا وہ

دیں لہسن پیاز وغیرہ کے پاس ایک پڑیا پڑی تھی۔ اس میں سے ڈالا تھا۔“

”اوہو! اسی میں تو کونین ملی ہوئی تھی۔ چرچ چرچ! آپ نے ہم سے پوچھ

کیوں نہ لیا۔؟“

”آغا! اسے کہتے ہیں۔ خود آپ اپنے جال میں صیاد آگیا۔“ نازی

نے بڑے تیکھے انداز میں ندیم کی جانب دیکھا۔

”ارے عاطف! فی الحال تو اسے دفع کرو۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ آپا!

بھوک بہت لگی ہے کچھ کھانے دلنے کا بندوبست کرایئے نا۔“ رقیہ خانم

اکتائی اکتائی سی جگائی لے کر بولیں۔

”فیئد بھی آرہی ہے۔ کچھ کھا کریں تو تھوڑی دیر آرام کرونگی۔“

رقیہ خانم نے جھٹ خاناماں کو اشارے سے پاس بلایا۔

۳۴ "اظفر بجائی کے پیٹ میں تو شاید کیڑے ہیں۔ انہیں ہر وقت ہی بھوک لگی رہتی ہے۔" اے! اب ہم کیا کھائیں گے۔؟ "صاعقہ بھوک کے مارے کراہ کر بولی۔

"تو پھر اب کیا کیا جاتے۔؟" رقیہ خانم بے حد پریشان تھیں۔  
"پریشان نہ ہوں امی! میں ابھی جا کر بازار سے مچھلی اور تنکے وغیرہ لے آتا ہوں۔" عاطف مال کی پریشانی دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کیوں جاتے ہو۔؟ تمہیں کاہے کا جرمہ۔؟" رقیہ خانم جلدی سے بولیں "جاؤ صاعقہ ان دونوں فتنوں کو بلا کر لاؤ۔ وہی گاڑی میں جا کر لائیں گے۔"

"ایک ہیں ہے امی۔!" ندیم ردنی سی آوازیں پر لے کونے سے بولا۔  
بے اختیار سب کے چہروں پر مسکراہٹیں پھیل گئیں۔

"امی۔! اتنا منگوائیے گا جو سب کو پورا ہو جائے۔ خاناں کی بیوی بچے بھی سب بھوکے ہیں۔ انہیں میں نے آج ہمیں کھانا کھانے کو کہا تھا۔" سیمیں دھیرے سے بولی۔

کیل خوب زوروں پر تھا۔ اظفر اور ندیم نے شرط لگائی تھی کہ بیڈ منٹن کے کھیل میں ان دونوں کی شرکت کے مقابلے میں کوئی نہیں جیت سکتا۔ عاطف اور جبین نے ان دونوں کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔

نازی اور سیمیں دیکھنے والوں میں تھیں اور کچھ کچھ ریفری کے فرائض بھی انجام

"جاؤ جا کر انڈے وغیرہ بناؤ جلدی سے۔ اب کچھ تو کرنا ہے۔" خاناں کو بھیج کر رقیہ خانم ندیم کو ڈانٹتے اور برا بھلا کہنے لگیں۔

"اب تمہیں اور اظفر کو میں نے اکٹھے دیکھا تو جوتے لگیں گے۔ دونوں بل جائیں تو بالکل ہی جاے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ایک تو بیچاری لڑکیوں کا کھیل برباد کیا دوسرے اتنا نقصان۔"

"بیگم صاحبہ! تھوڑی دیر بعد خاناں ان کے پاس آکر دھیرے سے بولا "انڈے ختم ہو چکے ہیں۔"

"کیا۔؟" رقیہ خانم حیران رہ گئیں۔ "ابھی صبح ناشتے کے بعد میں نے دیکھے تھے۔ درجن بھر سے کم تو کبھی صورت نہیں ہونگے۔"

"امی! وہ سب تو استعمال ہو گئے۔" سیمیں لگا پیں جھکاتے ہوئے بولی۔  
"کہاں استعمال کر لیے۔؟" رقیہ بیگم کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ "سوائے

جبین کے جو اس نے ابال کر قہیمے کی ڈش سجائی تھی اور تو کبیں انڈوں کی ضرورت نہ تھی۔"

"وہ امی! دو میں نے تورے میں ڈالے تھے۔ دو نازی نے مغزوں میں اور دو لالہ نے اور تین جبین نے۔ ایک پھینٹ کر قہیمے میں ڈالا اور دو ابال کر اوپر سجائے۔" سیمیں نے سچ سچ بتا دیا۔

"ارے! یہ تورے اور مغزوں اور اسٹوپیں کون انڈے ڈالتا ہے۔؟" روفو حالہ حیرت سے چلا پڑیں۔

"سب نے اپنے اپنے سالن مزیدار جو کرنا تھے۔ اور تین انڈے اظفر اور ندیم فرانی کر کے کھا گئے تھے۔ کہتے تھے بھوک لگی ہے۔"



”عاطف بھائی! مرے کی بات سنی آپ نے؟“  
 ”کیا؟“ ”عاطف نے گردن موڑ کر نازی کی جانب دیکھا۔ نشانہ چوک گیا۔  
 ”وہ لے لیا پوائنٹ!“ اظفر نے فتح مندانہ نعرہ مارا اور وہ اور نذیم  
 بیٹھ اچھا اچھا کرنا چنے لگے۔

”دیکھیے عاطف بھائی! آپ اپنی بے پرواہی کی وجہ سے ہمیشہ مجھے بھی  
 ساتھ لے ڈوبتے ہیں۔“ جبین نے رو ہانسی ہوتے ہوئے رکیٹ پھینک دیا۔  
 ”ایک تو جس وقت سے کھیلنے لگے ہیں نازی آپ کو برابر باتیں یاد آئے جارہی  
 ہیں۔ جانیے آپ پہلے ان کی باتیں سن کر فارغ ہو لیجئے، پھر کھیلیں گے۔“  
 ”تم خود تو کھیل سے لطف اندوز ہو رہی ہو اور ہم کیا باتیں کر کے بھی جی نہ

بھلائیں۔“ نازی تیکھے انداز میں بولی  
 ”تو باتیں کرنے کے لیے آپ کے پاس سیمیں آپی نہیں ہیں۔؟“  
 ”باتیں کرنے کے لیے تو جتنے بھی لوگ ہوں تھوڑے ہوتے ہیں۔“ نازی  
 مکرانی۔

”میرا خیال ہے بڑی تیز اور رواں قبینچی منہ میں رکھتی ہو۔ تاکہ بہت ساروں  
 سے نبٹ سکو۔ ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! جیتیم بد دور۔!“ ”عاطف  
 نازی کے پاس والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے مکرانہ کر بولا۔  
 ”ہاں تو کیا بات سنا رہی تھیں۔؟“

”اب تو نہیں سنا رہی۔“ نازی نے عاطف کی قبینچی والی بات سے  
 ناراض ہوتے ہوئے دوسری سمت رخ پھیر لیا۔  
 ”میں بھی نازی! یہ فائل ہے۔ ہم سب میں یہ پہلے سے طے ہے کہ کوئی

رہے رہی ہمیں۔ مگر چار چار نہیں سمجھیں۔ سب سب ٹرکیوں کی اظفر اور نذیم کے  
 ساتھ بڑی زبردست جنگ ہوئی تھی۔ اس لیے وہ کھلم کھلا عاطف اور جبین کا  
 طرفداری کیے جا رہی تھیں۔

کچھ دیر تو اظفر اور نذیم ان کی یہ زیادتی برداشت کرتے رہے آخر ان کے  
 صبر کا پیمانہ بھر نہ ہو گیا۔ انہوں نے سیمیں اور نازی کو ریفری ماننے سے صاف  
 انکار کر دیا۔  
 وہاں سے چھٹی ملی تو دونوں اپنے محبوب مشغول یعنی باتوں میں مصروف ہو گئیں  
 ”تین چار دن ہو گئے سیمیں! لالہ نہیں آئی۔“ گفتگو کے دوران اچانک  
 نازی کو لالہ کا خیال آ گیا۔

”جانے کیوں نہیں آئی۔ اتنے دنوں سے تم نے بھی تو مجھے کالچ نہیں  
 جانے دیا۔ معلوم نہیں وہ وہاں بھی جا رہی ہے یا نہیں۔ کہیں بیچاری کی طبیعت  
 ہی نہ خراب ہو۔“ سیمیں تشویش سے بولی۔

”اگر تمہارا یہ خیال ہے تو ہمیں ضرور اس کی خبر لینا چاہیے۔“  
 ”کالچ کا تو اب وقت ختم ہو چلا۔“

”اس کے گھر چلی جائیں گی۔“  
 ”گھر۔؟“ سیمیں کسی سوچ میں کھو گئی۔  
 ”کیوں۔؟ کیا اس کے گھر جانے میں کوئی حرج ہے۔؟“  
 ”مگر مجھے تو اس کے گھر کا پتہ ہی نہیں معلوم۔“  
 ”ہائیں۔!“ نازی نے بڑی حیرت سے سیمیں کو گھورا پھر ہنستے ہوئے  
 ذرا فاصلے پر بیٹھنٹن کھینٹے عاطف کو مخاطب کیا۔

کبھی کی بات کا بُرا نہیں مانے گا۔“

۷۴

”مگر آپ ہمیشہ ہماری زبان کی بات کیوں کرتے ہیں؟“

”اگر کوئی چیز قابلِ تعریف ہو اور اس کی تعریف نہ کی جائے تو یہ کمِ طرفی کی نشانی

ہے اور میں کمِ طرف نہیں ہوں۔“

”جیسے آپ تو ایسے عیسائی بنائے ہیں جیسے آپ بیچارے مرنے والے کے سبب

گونگے ہوں۔“

”تم سورتوں کے سامنے تو تقریباً گونگے ہی ہوتے ہیں۔“

”آپ نے پھر وہی بحث شروع کر دی۔! “جین اکتائے ہوئے لہجہ پر

بولی۔ ”پہلے عاطف بھائی! نازی آپنی کی بات تو سن لیجئے۔ جس کی وجہ سے

ہم مار بیٹھے ہیں۔“ جین کو باتیں سننے کی بڑی لت تھی۔

”ہاں۔“ نازی سیدھی ہو بیٹھی۔ ”میں آپ کو یہ بتا رہی تھی کہ لا

سیمیں کی سگی سہیلی ہے۔“

”یہ سگی سہیلی کیا چیز ہوتی ہے نازی آپنی۔؟“ اظفر نے فہم نہ لگاتے ہوئے

نازی کی بات کاٹ دی۔

”تم میری بات میں مت بولو اظفر! “نازی نے تلخی سے کہا اور گردن پھیر

پھر عاطف سے مخاطب ہو گئی۔ ”سیمیں کو اس کے گھر کا پتہ ہی معلوم نہیں۔“

”اے سچ۔! “عاطف نے متحیر ہوتے ہوئے سیمیں کی جانب دیکھا۔

”وہ۔۔ وہ۔۔“ سیمیں کچھ بول کھلا سی گئی۔ ”تھی بھی تو حیرت کی“

لالہ کے متعلق اس کا یہی دعوئے تھا کہ وہ اس کی عزیز ترین سہیلی تھی۔ تقر

ایک جان دو قالب کی سی حیثیت تھی ان کی۔!۔

”بھائی جان! دراصل میں اس کے گھر کبھی گئی ہی نہیں۔“ سیمیں ان

سب سے آنکھیں چراتے ہوئے بولی۔

”تمہاری اتنی پیاری دوست ہے۔ کیا اس نے کبھی تمہیں اپنے ہاں مدعو

نہیں کیا۔؟“ عاطف نے پوچھا۔

”نہیں۔ کبھی نہیں۔“ پھر سیمیں کچھ سوچنے لگی۔ ”جیسے کسی بات کا احساس

ہو جائے۔ اپنے آپ سے ہی دھیرے دھیرے بڑھانے لگی۔

”جانے کیا بات ہے۔؟“ اس نے کبھی اپنے گھر اور گھر کے افراد کے متعلق

کوئی بات نہیں کی۔ کبھی نہیں۔ حالانکہ باقی سب لڑکیاں اپنے گھر، گھر والوں،

ارد گرد کے رشتہ داروں اور رشتہ کے بھائیوں بہنوں کی بے شمار باتیں کیا کرتی ہیں۔

لالہ نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔“

”گھنٹی ہوگی۔“ عاطف زیر لب مسکراتے ہوئے شرارت سے بولا۔

”نہیں۔ ایسی بھی نہیں۔ عاداتاً وطبعیتاً بے مثال ہے۔ خوش مزاج اور

دوسروں کا دکھ درد جاننے والی۔ ہر لحاظ سے ہی اچھی ہے۔“ سیمیں اُسی طرح

کھوئی کھوئی سی بولی۔

”بس اس معاملے میں کچھ پراسرار سی ہے۔ کبھی اپنے گھر کسی کو نہیں بلایا۔ خود بھی کبھی

کسی کے ہاں نہیں جاتی۔“

”یہاں تو اکثر آتی رہتی ہیں۔“ اظفر اور ندیم بھی پاس آ بیٹھے تھے۔ اظفر

نے نگاہیں ترچھی کر کے عاطف پر مرکوز کر دیں اور الفاظ پیا پیا کر اور سکر اسکر کر بولا۔

”کیس کچھ دال میں کا لا والا تو نہیں۔؟“

سیمیں اس کی نگاہوں کا انداز دیکھ رہی تھی۔ بگڑ کر بولی۔

"خبردار اظفر! ایسی بات آئندہ نہ کرنا۔ لالہ ایسی نہیں ہے۔"

"ایک انسان کو دوسرا انسان پسند آ ہی سکتا ہے۔ پھر اس میں میں نے"

ایسی بُری بات کہی —؟"

"تمہاری عمر ابھی ان باتوں کی نہیں ہے۔" اب نازی بنک کر بولی۔

"ابھی سے خواہ مخواہ جوان بننے کی کوشش نہ کرو۔ اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دیا"

"جانے آج کل کے لڑکوں کو کیا ہو گیا ہے۔؟ پندرہ سولہ سال کی عمر"

ایسی لفظوں کی سی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ اسی لیے دن بدن ہمارا معاشرہ تن"

کی طرف جا رہا ہے۔" سیمیں نا صحا نہ انداز میں بولی۔

"لو بھئی یہاں تو ہمارے اور ہمارے ہم عمروں کے خلاف محاذ کھل گیا۔"

بھئی ندیم اور چل میاں اظفر! بھلا کو یہاں سے دم دبا کر۔"

اظفر اور ندیم کھسپائی سی ہنسی ہنستے ہوئے دہان سے چل دیے۔

"کچھ زیادہ ہی بدتمیز ہو گئے ہیں دونوں۔! جہیں نے کسی پرانی دشمنی یا تادم نے اس کے لیے کوئی اچھی سی، اعلیٰ سی، چندے آفتاب چندے ماہتاب"

"دھیان سے۔ کہیں تم پر بھی بدتمیز ہونے کا بیس نہ لگ جائے۔ دلچن ڈھونڈی۔؟"

عاطف مسکرایا۔ "تم سے دونوں بڑے ہیں۔"

"ہو نہ بڑے۔! ندیم چار چھ مہینے اور اظفر دو سال۔ مگر بھائی جان!؟"

میں بڑا ہونے سے کوئی بڑا نہیں ہو جاتا۔ ان کے کروت تو دیکھا کریں۔ کبھی کبھار"

صاحب سے بھی اپنی بے عزتی کر دالیتے ہیں۔"

"چلو چھوڑو اس قصے کو۔" سیمیں کا موڈ بحال ہو گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے

"یہ بدتمیزوں کی جوڑی ہماری زندگی میں نہ ہوتی تو میں سوچتی ہوں پھر تمہارے"

ہوٹوں پر مسکرائیں بھی کم ہی بکھرا کرتیں۔"

"کیوں۔؟ ہمارے عاطف بھائی بھی تو ماثار اللہ اتنے زندہ دل ہیں۔"

"انہی فرسے کی باتیں کرتے ہیں کہ روتے روتے بھی بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو جائیں۔"

زبد تمیر بالکل نہیں ہیں۔"

"آداب عرض ہے جہین بیگم۔! عاطف مسرتے ہوئے جہین کو آداب بجالایا"

"بس ایک تمہیں نے مجھے آج تک پہچانا ہے۔ در نہ یہ نازی اور سیمیں تو میری"

قدر ہی نہیں کرتیں۔"

"ہائے! تو اور آپ کی کیا قدر کروں۔؟" سیمیں رونے والی ہو گئی۔

"دیکھ نازی! جتنے دن یہ چھٹی پر رہیں میں ایمان سے خود اپنے ہاتھ سے ان"

کے لیے کھانا بناتی ہوں۔ ان کے دوسرے بھی سارے کام کرتی ہوں۔ اب"

کتے ہیں قدر نہیں کرتی۔ بھلا اور قدر کس طرح کی جاتی ہے۔؟"

"یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ تمہارا بھائی خیر سے اب جوان ہے ماثار اللہ! یہ"

کچھ زیادہ ہی بدتمیز ہو گئے ہیں دونوں۔! جہیں نے کسی پرانی دشمنی یا تادم نے اس کے لیے کوئی اچھی سی، اعلیٰ سی، چندے آفتاب چندے ماہتاب"

"دھیان سے۔ کہیں تم پر بھی بدتمیز ہونے کا بیس نہ لگ جائے۔ دلچن ڈھونڈی۔؟"

عاطف مسکرایا۔ "تم سے دونوں بڑے ہیں۔"

"ہو نہ بڑے۔! ندیم چار چھ مہینے اور اظفر دو سال۔ مگر بھائی جان!؟"

میں بڑا ہونے سے کوئی بڑا نہیں ہو جاتا۔ ان کے کروت تو دیکھا کریں۔ کبھی کبھار"

صاحب سے بھی اپنی بے عزتی کر دالیتے ہیں۔"

"چلو چھوڑو اس قصے کو۔" سیمیں کا موڈ بحال ہو گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے

"یہ بدتمیزوں کی جوڑی ہماری زندگی میں نہ ہوتی تو میں سوچتی ہوں پھر تمہارے"

”لوہہ! لوہہ! لوہہ! سیس کا لول تو ہاتھ لگائے لی۔“

”خدا کی بنائی مخلوق کو کیسی باتیں کرتے ہیں۔!“

”سیس اپنی! ہمارے عاطف بھائی ہیں تو ماثرا اللہ اتنے پیارے۔“ جا نے عاطف کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ اس وقت تو سفید پتلون قمیض میں وہ ہمیشہ سے بھی زیادہ سمارٹ لگ رہا تھا۔

”آپ! انہیں جیسی کوئی لڑکی ڈھونڈیے نا۔“

”ہائے جبین! تم بھی ان کی باتوں میں آگئیں۔ ایمان سے جتنی لڑکیوں کے تئا میں نے انہیں کہا تھا سبھی ان سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں۔ جلنے یہ خود کو سمجھ کیا ہیں۔ کالے کھوٹے سے۔!“

”کالے کھوٹے۔؟“ جبین چلا پڑی۔ عاطف چپ چاپ بیٹھا زیر لب مسکرائے جا رہا تھا۔

”آنا پیارا سا سانولا رنگ ہے ان کا۔ اور پھر ناک نقشہ تو دیکھیں سیس! ایسا بیکھا نہ کھا سا۔ پس! جب فوجی دروی پہنتے ہیں تو میں نے تو کبھی نگاہ کر دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“

”کیوں۔؟“ نازی بے اختیار ہنس دی۔

”اس لیے کہ نظر نہ لگ جائے۔ بے حد وجہ لگتے ہیں۔“ جبین! طرح بنجیدگی سے بولی اور اس کی سنجیدگی دیکھ کر عاطف اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکا۔ ”پاگل لڑکیو! بس کرو یہ باتیں۔ خدا کا بنایا ہوا کوئی بھی انسان بد صورت نہی۔“ تو پھر آپ میری ان سب سیلیوں کو ناپسند کیوں کرتے رہے ہیں۔؟“

”نعوذ باللہ۔! خدا کے بنائے کسی انسان کو میں کس طرح ناپسند کر سکتا ہوں۔“

”سچ۔!“ سیس خوشی سے چلا پڑی

”تو پھر بتائیے ان میں سے کوئی لڑکی آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ رنوخالہ آئی ہوئی ہیں۔ کل ہی ہم آپ کا رشتہ پکا کریں۔“

”ارے بھی اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ دقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔“

عاطف اٹھ کھڑا ہوا۔

”ابھی تو ایک سال کے کورس پر مجھے امریکہ جانا ہے۔ اور یہ کوئی پتہ نہیں کب آرڈر آجائے۔ وہاں سے واپس آکر شادی کر دں گا۔“

”پس عاطف بھائی! آپ امریکہ جا رہے ہیں۔؟“ نازی خوش ہو کر بولی۔

پھر دوسرے ہی لمحے چہرے پر ادا سی سی چھا گئی۔

”لیکن ہم آپ کے بغیر اداس ہو جائیں گے عاطف بھائی۔!“

”ایک ڈیڑھ سال کی بات ہی کیا ہے۔؟“ عاطف ہوا میں رکیٹ سے نشانہ لگاتے ہوئے بولا۔

”اگر جانا ہی ہے تو پھر جلدی چلے جائیے نا۔“ جبین نے ہولے سے کہا۔

”کیوں۔؟“

”مجھے وہاں سے کچھ چیزیں منگوانی ہیں۔“

”کیا۔؟“

”یہی کوئی سویٹر اور دلاہتی کپڑا وغیرہ۔“

”جبیں کو تو کپڑے میں دفن بھی کر دیں گے تو اس کا مردہ مرا مرا بول پڑے گا۔“

”چند پیس اور۔“ نازی ناک بھول چڑھا کر بولی۔

۸۵  
"اسے تو کپڑوں کا تھپ ہے خطبہ — سینکڑوں جوٹے ہونگے اس کے پاس

سیمیں اور عاطف بے اختیار ہنس پڑے —

"دنیا میں عیش کرنے آئے ہیں۔ کیوں نہ کریں —"

"تو پھر اپنے دیسی مال سے ہی کرنا — تاکہ ملک کو بھی کچھ فائدہ ہو۔ دلائے

چیزوں پر جان دی تو کیا دی —؟"

"وہ ہوتی بھی تو اسی قابل ہیں — اور ہمارے یہاں کی کوئی چیز بھی ...

"بس جبین بس —! "نازی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس کے آگے بڑھا

جوڑ دیے — "میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتی —"

"خود بات کر لیتی ہیں اور دوسرے کی سنتی نہیں —"

"تمہاری پس کیا خاک سنوں —! نہ تم نے کبھی پاکستانی کپڑا استعمال کیا نہ تم

اچھائی بُرائی کو جانتی ہو۔ پھر بات کس طرح کر سکتی ہو۔ تمہیں تو بس خدا واسطے کی!

ملک سے دشمنی ہے — "نازی غصے میں بڑبڑاتی گئی —

"ولایتی کپڑا — ولایتی چیزیں —! خواہ خود کو کسی عذاب میں مبتلا کرنا

مگر منگوانی ضرور جائیں گی۔ ایک تو اتنی نے اس کی ایسی دیسی ضدیں پوری کر کے

ستیا ناس کر ڈالا ہے۔ کبھی لٹری کوئی سے چیزیں منگوانی جارہی ہیں تو کبھی سوان

اور کبھی ایمب آباد اور راولپور سے — کیسی مصیبتیں کرنا پڑتی ہیں۔ مزہ آئے

کبھی یہ پکڑی جانے —"

جبیں پھوٹ پھوٹ کر رنے لگی —

"ہر وقت جھڑکیاں دیتی رہتی ہیں — بڑی ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں نا

"بڑے چھوٹوں کو سمجھایا ہی کرتے ہیں جبین —! "عاطف نرمی سے بول

ساہا سب رو د میں —

"اور بھائی جان سبھی باہر سے چیزیں منگواتے ہیں — بڑے ماہر

کی لڑکیاں — میرے سکول کی لڑکیاں بھی — بلکہ وہاں تو اسٹانیاں خود لڑیں نہیں رہا تھا

نے زبطہ پکنک جاتی ہیں۔ نازی آپنی ان سب کو کیوں نہیں کہتیں — مجھے ہی یہ دوسرے

ہر وقت کوستی رہتی ہیں —"

"اپنوں ہی کو کوئی کتا ہے — غیروں کو نہیں —! "سیمیں آگے بڑھ کر جبین

کے آنسو پونچھنے لگی۔ پھر بات کا موضوع بدلنے کی خاطر بولی۔

"آج تو تم نے چائے کے ساتھ خود سمو سے بنا کر کھلانے کا وعدہ کیا تھا —"

"ہاں —"

"اُٹھو پھر — چائے کا وقت ہونے والا ہے —"

عاطف نے دیکھا — روردر جبین نے آنکھیں سنبالی تھیں۔ اسے اس پر

بے حد ترس آیا —

"آج تمہاری طرف سے میں سمو پارٹی دیتا ہوں۔ تم جبین! صرف چائے

بنا دو۔ میں ابھی گراگم سمو سے لے کر آیا —" عاطف چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔

"ٹھہرے عاطف بھائی! ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں —" سیمیں اٹھکر

کھڑی ہو گئی۔

"کہاں —؟"

"وہیں سموں کی دکان پر — گاڑی میں ہی بیٹھ کر کھائیں گے۔ گراگم۔"

اور سیمیں اپنا سوٹر لینے کے لیے اندر بھاگ گئی۔

"جاؤ جبین! صاعقہ، اخگر اور ندیم کو بلا لاؤ —"

”اسے لڑکپن میں کو تو رہنے دیں۔ خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ ڈالیں گے۔  
 سیمیں اے۔ لے چلتے ہیں۔ ان کی بھنگ بھی مزے کی ہوتی ہے۔“ عطا  
 ”۔“ اور پھر بچے ہیں۔ اس عمر میں سبھی ایسے ہوتے ہیں۔ میں ان  
 بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔“

”اور عطف بھائی! سمو سے کھا کر لالہ کے ہاں چلیں گے۔“ نازی  
 ”سمو سے کھانے سے پہلے کیوں نہیں۔“ اظفر ایک درخت کی اوٹ  
 نکلتے ہوئے بولا۔ ”انہیں بھی ساتھ کھلا لائیں گے۔“  
 ”مگر اتنے لوگوں کے لیے گاڑی میں جگہ نہیں ہوگی۔“ عطف نے  
 سوچ کر کہا۔

”ہم سب پہلے بھی بیٹھے ہی رہے ہیں۔“ اظفر لالہ کو ساتھ لینے  
 کے لیے مڑھ تھا۔

”اتنے تنگ ہو کر۔ اور آج لالہ کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔“  
 ”اسے کسی کی گود میں بٹھادیں گے۔“ اظفر نے عطف کی طرف دیکھتے ہوئے  
 آنکھ دبا کر کہا۔ ”مگر ساتھ ہی عطف کے ڈر سے دہاں سے بھاگ گیا۔“  
 ”بد معاش۔!“ عطف رکیٹ تانے اس کے پیچھے لپکا۔  
 سیمیں سویٹر لے کر واپس آ رہی تھی۔ انہیں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگا  
 دیکھا تو پوچھنے لگی۔ ”کیا ہوا۔؟“

”کچھ نہیں۔ ہم ذرا کھیل رہے ہیں۔“ اظفر وہیں سے بولا۔  
 ”سیمیں! ہمارا یہ پروگرام بنا ہے کہ ہم پہلے لالہ کے ہاں چلتے ہیں پھر  
 ساتھ لے کر سمو سے کھانے جائیں گے۔“ نازی نے سیمیں کو اپنا پروگرام

بتایا، جو اس کے جانے کے بعد بنا تھا۔  
 ”مگر اس کے گھر کا تو پتہ ہی معلوم نہیں۔“

”اوہ۔!“ نازی کھیانی سی ہو گئی۔ ”یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا  
 اظفر پھر ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ عطف کے کان کے قریب جیسے  
 سے بولا۔ ”پتہ کچھ! مشکل سے موقع ہاتھ آیا تھا۔ چلیں پھر کبھی ہی۔“  
 ”اظفر! کیس پر سچ سچ تم مجھ سے گولی نہ کھا بیٹھنا۔ آخر تم نے کیا دیکھا جو  
 ہر وقت ایسی اوٹ پناہ بکتے رہتے ہو۔“

”دیکھا نہیں لیکن دیکھنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ وہ مجھے بے حد اچھی لگتی ہیں۔“  
 ”تو پھر دفعہ خالہ سے بات کروں۔؟“  
 ”میں انہیں آپا کہتا ہوں۔“

”عطف بھائی! آئیے بھی۔ دیر ہو رہی ہے۔“ نازی نے پکارتو  
 دونوں اپنی نوک جھونک چھوڑا دھر چلے گئے۔

صاعقہ اور ندیم کو بھی اندر سے بلا لیا گیا۔ صاعقہ نے آتے ہی شور مچا دیا  
 کہ وہ گاڑی میں آگے عطف کے پاس بیٹھ گئی۔ اظفر اور ندیم اس سے لڑنے لگے۔  
 ”یہ اصول ہے کہ لڑکیاں پیچھے بیٹھتی ہیں اور لڑکے آگے۔ البتہ جب تمہاری  
 شادی ہو جائے گی تو پھر اپنے اس کے ساتھ آگے بیٹھا کرنا۔“ ساتھ ہی اظفر  
 نے صاعقہ کی منی سی پونی ٹیل کیپٹنج دی۔

پہلے صاعقہ کے بال ترشے ہوئے تھے۔ اب دو تین مہینے ہوئے دفعہ خالہ  
 نے آئندہ سے ترشٹانے پر پابندی لگا دی تھی۔ کہ ہوسکتا تھا بالوں کا سٹائل  
 بدلنے سے صاعقہ کی صورت کچھ بہتر نظر آئے۔

کیا کرتے ہیں — ؟

”لیکن بھائی جان! یہ ہر بات میں کیوں خند کر بیٹھتی ہے۔“

انظر اسی طرح اس کا بازو پکڑے کھڑا رہا۔ چہرے پر بڑا جلال چھایا ہوا تھا۔ مزید کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ کوٹھی کے صدر دروازے کی جانب نگاہ اٹھ گئی۔ ایک دم مسکرا پڑا۔

”بوجی رٹانی ختم۔!“ پھر ذرا آواز دبا کر بولا۔ ”عاطف بھائی کے ساتھ بیٹھے والا اصلی حق دار آپہنچا۔“ ساتھ ہی جلدی سے صاعقہ کا بازو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔

سب نے مڑ کر صدر دروازے کی جانب دیکھا۔ لالہ ہونٹوں پر بڑی آواز سی مسکراہٹ سجائے چلی آ رہی تھی۔ سمیں اور نازی تو اس کی سمت بڑھ گئیں اور عاطف نے انظر کا کان پکڑ لیا۔

”کتنی بار تمہیں منع کیا ہے کہ ایسی گفتگوں کی سی باتیں نہ کیا کرو۔“ وہ بھائی جان! بات دراصل یہ ہے کہ۔“ انظر مسکرا کر سر کو کھجلائے لگا۔

”ہاں ہاں بتاؤ۔ کیا تکلیف ہے تمہیں۔“

”آپ مائتار اللہ جو ان ہیں بلکہ اب تو ادھیڑ ہو چلے۔ میں چاہتا تھا آپ کا کوئی دال دلیہ ہو جائے۔“

”میرے لیے فکر کرنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں۔“ عاطف نے ذرا زور سے اس کا کان کیچ کر اسے تنبیہ کی۔

”اگر آئندہ ایسی بات کی تو گلا دبا دوں گا۔“ اور اس کا کان چھوڑ دیا۔

”صاعقہ کو خوبصورت بنانے کے لیے وہ ہر ممکن طریقے آزماتی رہتی تھیں۔

اس تک دود میں وہ بیچاری کچھ زیادہ ہی غلط سلط ہو کر رہ گئی تھی۔ کہیں سے بال زیادہ بڑھ گئے تھے کہیں سے کم۔ اور ان خود رو جھاڑیوں کی مانند بڑھے بالوں کی جب پونی ٹیل بن جاتی تو عجیب غریب چیز پیش ہوتی۔ جیسے کسی مرغی کی نچی کھٹی دم ہو۔ پھر بیچاری سب کے مذاقوں کا نشانہ بن جاتی۔!

انظر نے اس کی پیسے ڈھنگی سی پونی ٹیل کھینچی اس لیے تھی کہ زیادہ غصے میں آ کر خوب فیل بپا کرے گی۔ رٹے بھڑے گی اور آخر میں اپنا جانے کا پروگرام متوی کر دے گی۔ مگر صاعقہ اس وقت کسی اور ہی موڈ میں تھی۔

”یہ خدائی حکم تو نہیں کہ لڑکیاں ضرور پیچھے ہی بیٹھیں۔ بس! میں نے کہا ہے کہ میں آگے عاطف بھائی کے پاس بیٹھوں گی۔“ اور صاعقہ اپنی جگہ خود بنانے کے لیے آگے آگے پورچ کی سمت تیزی سے بھاگی۔ انظر اد ندیم اس کے پیچھے لپکے۔

”شرم کرو انظر اور ندیم۔! وہ تم سے چھوٹی ہے۔“ سمیں نے صاعقہ کی حمایت میں ان دونوں کو ڈانٹا۔

”اور ہم آپ سے چھوٹے ہیں۔“ وہ صاعقہ کے تعاقب میں جاتے جاتے؛ عاطف، نازی، سمیں اور جبین جب پورچ میں پہنچے تو عجیب نظارہ تھا۔ گاڑ کے بائیں جانب والے اگلے دروازے کے ساتھ صاعقہ چپکی کھڑی تھی۔ اور انا اور ندیم اس کا ایک ایک بازو پکڑ کر، اسے وہاں سے ہٹانے کیلئے کھینچ رہے تھے۔

”انظر! ندیم!! چھوڑ دو اسے۔“ عاطف نے انہیں ڈانٹا۔

”ہمت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔“ چھوٹی بہنوں سے کبھی ایسا سلوک؟

”جب سے فوج میں گئے ہیں ہر وقت رعب ہی ڈالتے رہتے ہیں۔“  
 اظفر پرے ہٹ کر کان سہلاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔  
 ”آج کل زمانہ بھلائی کرنے کا بھی نہیں رہا۔“

عاطف نے اس کی بڑبڑاہٹ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ جیب سے کاری  
 چائی نکال کر دروازہ کھولنے لگا۔ ”چلو بھئی۔“ جلدی سے آجاؤ۔  
 ”لیکن بھائی جان! لالہ تو جا نہیں رہی۔“ سمیں وہیں سے بولی  
 ”کیوں؟ کیا تکلیف ہے۔“  
 ”کہتی ہے امی سے اجازت نہیں۔“ سمیں اور نازی لالہ کا ایک ایک  
 بازو پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے دیں لے آئیں۔  
 ”اجازت نہیں تو پھر کیا ہوا۔“ عاطف بھائی آپ کو کہیں بھگا تو نہیں لے  
 جائیں گے۔“

”اتنی ڈانٹ ڈپٹ ہوتی تھی۔ ابھی تک کان بھی سُرخ ہی تھا مگر اظفر کی زباں  
 ہی کیا جو خاموش رہ سکے۔ زبان ہلی تو ساتھ آنکھیں بھی شرارت سے چمک اُٹھیں۔  
 کچھ ایسا معنی خیز سا انداز تھا اس کا کہ لالہ کے رخساروں پر سُرخ پھیل گئی اور پلکیں  
 بے اختیار جھج گئیں۔“

لالہ کے سامنے عاطف اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے اظفر کو صرف  
 آنکھیں نکال کر دیکھنے پر ہی اس نے اکتفا کیا۔ اور پھر جلدی سے سمیں اور نازی سے  
 کہنے لگا۔ ”چلو پھر ٹھیک ہے۔ چائے تیار رکھنا۔ میں اکیلا ہی جا کر لے آتا  
 ”بھائی جان! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔“ پاس سے صاعقہ منمنائی  
 ”چلو آجاؤ۔“ عاطف گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

عاطف سے اجازت ملتے ہی صاعقہ لپک کر اس کے پاس جا بیٹھی۔ گاڑی  
 ہلی تو بانی فخمندی پر اظفر اور ندیم کا منہ چڑانے لگی۔  
 ”تم سمجھتی ہو کہ میں شکست دے کر جا رہی ہوں۔ تو یہ تمہاری بھول ہے صاعقہ  
 کی بچی۔! ہم تو خود ہی لالہ آپا کی خاطر نہیں گئے۔ اتنے دنوں بعد آئی ہیں۔“

”واہ واہ! لالہ آپا کی خاطر!!“ جبین بڑے طنز سے بولی۔  
 ”تمہارے بغیر تو جیسے بیچاری لالہ آپا کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔“  
 ”تمہیں کس نے بلایا ہے۔؟“ اظفر جبین سے الجھ پڑا۔  
 ”دخل در معقولات کی عادت اچھی نہیں ہوتی۔“  
 جواب میں جبین بھی اُسے کھری کھری سنا چاہتی تھی مگر سمیں نے ان کا بچ بچاؤ  
 کر دیا۔ اور اسے اور لالہ اور نازی کو ساتھ لے کر واپس لالان میں چلی گئی۔  
 جاتے جاتے اظفر اور ندیم کو اپنے پیچھے نہ آنے کی ہدایت بھی کر دی۔  
 دھوپ کم ہو چکی تھی۔ سیب کے درخت کے نیچے سے کرسیاں کھلی جگہ  
 پر گسیٹ لے گئیں اور بیٹھ کر گپ بازی میں مصروف ہو گئیں۔ جبین کھیل کھیل کر  
 تھکی ہوئی تھی۔ لالہ کا پرس سر کے نیچے رکھتے ہوئے گھاس پر لیٹ گئی۔  
 ”پھر لالہ! تم نے بتایا نہیں کہ اتنے دن کہاں غائب رہیں۔؟“

”بس ایسے ہی۔ فرصت نہیں ملی تھی۔“

”کالچ جاتی رہی ہو۔؟“

”ہاں۔“ باقاعدہ۔“

”سب ٹھیک ٹھاک تو ہیں۔؟“

”بالکل۔“



”لالہ! آج ہم سب تمہارے گھر جانے لگے تھے۔ مگر تمہارے گھر کا پتہ  
ہی معلوم نہیں تھا۔“ نازی نے کہا۔

لالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ تو ان کے اپنے گھر نہ آکنے پر افسوس  
کا اظہار کیا اور نہ ہی اپنا پتہ بتایا کہ کبھی کسی وقت آجائیں۔ بس خاموش سی رہ گئی  
کبھی اُڑنے تو کچھ محسوس نہ کیا۔ مگر سیمیں بڑے غور سے اس کے پسیدہ ہونے  
چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ نازی اور جبین کے سامنے کچھ کننا مناسب نہ سمجھا  
کیونکہ لالہ اس کی اپنی سیلی تھی۔ اس لیے موصوع ہی بدل ڈالا۔  
”نازی! کل اگر کینک کا پردہ گرام بنے تو کیا رہے۔؟“  
نازی نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اظفر کی آواز آئی۔

”اعلیٰ۔۔۔! بے حد اعلیٰ۔۔۔!“

چاروں نے چوتھے ہوئے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

”ڈھونڈ لو۔۔۔“ یہ آواز ندیم کی تھی۔

”بڑے ہی بد تمیز ہو دونوں۔“ سیمیں ہنس پڑی۔

سیب کے درخت کی ٹہنیوں پر دونوں بیٹھے بالکل لنگور ہی لگ رہے

جبیں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

”سیمیں! اپنی! یہ جو بندر بچانے والے ہوتے ہیں۔ کیا بندر قیما کہیں۔

لیتے ہیں۔؟“ جبین ان دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

”کل کی کینک کا خرچ نکل آئے گا۔!“

”ماں قیما لیتے ہیں۔ مگر ساتھ بندر یا بھی ہو تو پھر تو منہ مانگے دام ملے؛

اظفر نے جلدی سے جواب دیا اور ساتھ ہی ایک سیب توڑ کر جبین کا نشانہ بنا

”ہائے نازی! اپنی! سیمیں! اپنی!! اسے منع کریں۔ ورنہ میرا سر پھٹ جائے  
گا۔“ جبین گھٹنوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے چلائی۔ ”اور پھر خون  
سے میرے سارے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔“

سیمیں، نازی اور لالہ بے اختیار قہقہہ لگا اُٹھیں۔ جبین کو سر کی سلامتی  
سے زیادہ اپنے کپڑوں کا فکر پڑ گیا تھا۔

انہیں ہنستے دیکھا تو اظفر اور ندیم شیر ہو گئے۔ جھٹ پٹ چھلانگیں لگا لگا  
کر نیچے اترے اور ان کے پاس آگئے۔

”یہ تم درخت پر کیوں چڑھے تھے۔؟“ سیمیں نے انہیں ڈانٹا۔

”آپ کی باتیں سننے کے لیے۔!“

”کیوں۔؟ ہماری باتیں تم کیوں سننے کی کوشش کرتے ہو۔؟“

”عاطف بھائی نے کہا تھا۔“ اظفر مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

”عاطف بھائی نے۔؟“ نازی اور سیمیں دونوں سیرت سے بولیں

”وہ کیوں۔۔۔؟“

”انہیں یہ شک ہے کہ لالہ آپا ان میں کچھ کچھ دلچسپی لینے لگی ہیں۔“

”دلچسپی۔!“ لالہ بوکھلا کر چلا سی پڑی۔ ”کیا مطلب۔؟“

سیمیں، نازی اور جبین منہ کھولے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی

تھیں۔ اظفر نے کسی کی جانب کوئی توجہ نہیں دی، نظریں جھکائے اپنی ہی کتا

چلا گیا۔

”مطلب یہ کہ عشق و شوق۔!! اور وہ کہتے تھے کہ میں انہیں معلوم کر کے

بتاؤں۔ تاکہ پھر وہ بھی ان کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کریں۔“

انظر بالکل سنجیدہ تھا۔۔۔ "یعنی عیش کرنا شروع کر دیں۔۔۔ ویسے کچھ کچھ تودہ اب بھی کرتے ہی ہیں۔۔۔"

"یہ کیا بکے جا رہے ہو۔۔۔؟" نازی غصے سے بولی۔

لالہ کے چہرے کی سُرخ رنگت کسی سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ درپٹے کو اٹکیوں پر لپیٹ اور کھول رہی تھی۔ اس کے پورے سراپا سے عجب قسم کی اضطرابی کیفیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"جھوٹ تو نہیں بک رہا۔۔۔" انظر اسی ڈھٹائی سے بولا۔

"ابھی عاطف بھائی آئیں ہم ان سے پوچھتے ہیں۔۔۔" سمیں بولی۔  
"پوچھ لیں۔۔۔" انظر کی دیدہ دلیری کی وجہ سے سبھی کچھ کچھ شک میں آ گئے۔

"سمیں! میں جا رہی ہوں۔۔۔" لالہ اٹھ کھڑی ہوئی۔  
"نہیں نہیں۔۔۔" سمیں اور نازی ایک دم بولیں اور اٹھ کر لالہ کا راستہ روک لیا۔۔۔ کچھ شرمندہ شرمندہ بھی تھیں۔

"نہیں۔۔۔ اب میں یہاں مزید ایک پل نہیں ٹھہر سکوں گی۔۔۔" لالہ کا آواز بھڑائی ہوئی تھی۔

"یہ انظر بڑا کھینہ ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے عاطف بھائی نے ایسی بات کہ نہیں کی ہوگی۔۔۔" سمیں کی پریشانی قابل دید تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ تھا کہ کیا کرے۔۔۔؟ کبھی غصے سے انظر کی جانب دیکھتی اور کبھی پریشانی اور شرمندگی سے لالہ کی طرف۔۔۔!

"لالہ آبا! ہم آپ کو یوں تنہا ہو کر کبھی بھی نہیں جانے دیں گی۔۔۔" جبین اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"یہ دیکھیے سب کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔۔۔" جبین نے سچ لالہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

انظر چپ چاپ بیٹھا سارا نظارہ دیکھ رہا تھا اور مُسکرا رہا تھا۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں۔۔۔ چہرے پر پریشانی یا بیشیمانی کا ہلکا سا بھی سایہ نہ تھا۔! اسی آثار عاطف اور صاعقہ شور مچاتے آ گئے۔

"سمو سے۔۔۔ گرما گرم۔۔۔!! چٹنی۔۔۔ مصالحے دار۔۔۔!! مال پسند نہ آتے تو دام واپس۔۔۔" صاعقہ باقاعدہ غناچہ والوں کی طرح ہلکیں لگاتی آرہی تھی۔ عاطف اور صاعقہ کو آتے دیکھ، سب ہی کڑ بڑا گئے۔ لالہ نے جلدی سے پرلی سمت رُخ پھیر لیا اور جبین نے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔

عاطف قریب آیا۔۔۔ سب خاموش تھے۔ اسے اور خصوصاً گرما گرم سموں کو دیکھ کر کسی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نہیں پھیلی تھی۔ ورنہ پہلے تو ایسی چیزیں ہاتھوں ہاتھ ہی جھپٹ لی جایا کرتی تھیں۔

عاطف ایک ایک کے چہرے کو پریشانی سے گھورتے ہوئے بولا۔  
"ارے! تم سب کو کیا ہوا۔۔۔؟"

اور ابھی اس کو اپنی بات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا کہ لالہ نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور مڑ کر صدر دروازے کی سمت تیز تیز چل دی۔  
"ارے ارے ٹھہرو۔۔۔ خدا کے لیے رُک جاؤ لالہ۔۔۔!" سمیں اس کے پیچھے بھاگی۔

عاطف نے نازی اور جبین کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ نازی جلدی جلدی اسے انظر کی کی ہوئی بات بتانے لگی۔ عاطف کی کشادہ پیشانی پر پسینے کی

بونڈیں اُبھریں اور آنکھیں غصہ سے خون اگلنے لگیں۔ جنین چلائی۔  
 ”وہ دیکھیے عاطف بھائی! اظفر بھاگ گیا ہے۔ یقیناً اس نے جھوٹ بولا ہوگا۔“  
 نازی کی پوری بات سننے بنا عاطف اظفر کے پیچھے بھاگا۔ فوجی آدمی! کئی  
 کئی میل پیدل چلنے اور تیز بھاگنے کا عادی۔!! دو چھلانگوں میں ہی اس نے اظفر  
 کو چالیا اور اسے گردن سے دوپٹے کی سیدھا سمیٹ لیا اور لالہ کے پاس لے گیا۔ لالہ  
 دوپٹے میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی اور سمیٹیں معافیاں مانگ رہی تھی۔  
 ”لوسمیں! اب میرے سامنے اس سے پوچھو۔“ عاطف نے مخاطب  
 سمیٹیں کو کیا تھا مگر اپنی صفائی وہ لالہ کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔  
 اظفر نے کی بھی تو حد ہی تھی نا۔! بیچارہ لڑکی کیسے شرمندہ ہو گئی؟  
 اور خود اس کا اپنا بھی ندامت کے مارے بُرا حال تھا۔  
 ”بتاؤ۔؟ کب میں نے تم سے کوئی ایسی بات کی۔؟ اب میرے  
 سامنے سب کو بتاؤ۔“

عاطف نے دانت پیسے ہوئے اظفر کی گردن پر اپنی گرفت سخت کر دی  
 اس وقت اظفر پر غصہ اتنا زیادہ تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس  
 ساتھ کیا سلوک کرے۔ جی تو اسے بالکل ہی کچا چبا جانے کو چاہ رہا تھا۔

”وہ... وہ...“

”ہاں! ہاں! بکو۔“

”آجکل اچھے لڑکے ملنا بھی مشکل ہیں اور اچھی لڑکی بھی خال خال ہی  
 ہے۔ میں نے سوچا تھا یہاں دونوں ہی موجود ہیں۔ خالہ امی اور لالہ آپا کو  
 کو سہولت رہے گی اگر یوں معاملہ طے ہو جائے۔“

اظفر نے سر جھکائے ہوئے چھ اس سجدہ انداز میں کہا کہ جے اظفر نازی ہیں  
 اور جنین کا قبضہ چھوٹ گیا۔

لالہ نے گہرا کرچرے سے ماتھ مٹائے۔ عاطف اسی کی جانب دیکھ رہا  
 تھا۔ بھیگی بھیگی ہلکیں ایک دو بار اٹھیں، گریں اور پھر لالہ شرمندہ سی ہو کر وہیں لان کے  
 پیچوں پیچ گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

”بڈیز! اُلو!!“ عاطف کھینا ہوتے ہوئے بڑبڑایا اور پھر اظفر کی گردن  
 چھوڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔  
 ”ارے بھائی جان! سمسے تو کھاتے جاویے۔“ اظفر بت بنی کھڑی  
 صاعقہ کے ہاتھوں سے سمسوں کا یہ بڑا سا پیکٹ چھینے ہوئے عاطف کے پیچھے  
 بھاگا۔

جنین کے ماتھ میں چٹنی کا پالہ تھا۔ جو عاطف نے آتے ہی اسے تھمایا  
 تھا۔ ندیم نے وہ جھپٹا اور اظفر کے پیچھے لپکا۔  
 ”لیجئے۔ چٹنی بھی آ رہی ہے۔“

چشم زدن میں اظفر اور ندیم انہیں لوٹ لے گئے تھے۔ لڑکیاں جب ذرا  
 سنبھلیں تو دونوں نگاہوں سے اوچھل ہو چکے تھے۔  
 ”ہائے! اب یہ ہمارے لیے ایک بھی نہیں چھوڑیں گے۔“  
 صاعقہ بسر کرنے لگی اور باقی سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔

نازی اور جین بڑی بھر ہو گئی تھیں۔ حالانکہ سیمیں انہیں دو تین بار اپنے کالج بھی لے جا چکی تھی۔ مگر کہاں وہ سہ وقت کی رونقیں اور چونچا چاچی! کبھی کسی کھیل کا مقابلہ ہو رہا ہے تو کبھی کھانا پکانے کا۔ اور کچھ نہیں تو عاطف کے ساتھ جوتاش کی بازیاں لگتی تھیں انہیں کا کوئی بدل نہ تھا۔ پھر جب ہی چاہتا گاڑی میں بیٹھ کہیں نہ کہیں چل دیتے۔ سارا راستہ وہ شور مچا رہتا کہ خدا کی پناہ۔!! اور اب تو سب نے ہی علیحدہ علیحدہ اپنی مصروفیت بنالی تھی۔ سیمیں کالج سے آتی تو اتنی تھکی ہوتی کہ کتنی کتنی دیر تک چہرے پر مکرہٹ ہی نہ کھل سکتی۔ لالہ نے بھی اس دن کے بعد یہاں قدم نہیں رکھا تھا۔ پھر کیسے نہ دونوں گھبرا اٹھتیں۔ چنانچہ ماں کو واپس چلنے پر مجبور کرنے لگیں۔ رقیہ خاں نے بہت روکا۔ بچوں کی چھیڑ تک ٹھہرنے کے لیے کہا بھی مگر نازی اور جین اپنی جند پر اڑی رہیں۔ آخر فوخالہ کو بیٹیوں کی بات ماننا ہی پڑی۔

عاطف کی چھ سات چھٹیاں باقی رہ گئی تھیں۔ ان دنوں میں کبھی کبھار پروگرام بنا تو کبھی ساری کی ساری پارٹی نے سینما ہال میں جا اودھم مچایا۔ آدھی رات دیکھی، آدھا وقت شرارتوں اور ہنسی ٹھٹھائی گزرا۔ موڈ بننا تو رات کے بارہ بجے گاڑی میں ٹھنٹھٹھنا کافی پینے چل دیتے اور آدھی رات کو اس کرم کھانے کا سودا سردوں میں سما جاتا۔ امی اور فوخالہ نصیحتوں اور جھڑکیوں کے باوجود باز نہ آتے۔ نہ کسی نے زلہ زکام کی پرواہ کی نہ کھانسی بخار کی۔ ایسے مزے کے دن تو نہیں آتے۔ اب نے خوب لطف لیا۔ البتہ لالہ کی غیر موجودگی ہی کو کھٹکتی رہی۔ اس دن کے بعد وہ پھر ان کے ہاں نہیں آئی تھی۔ سیمیں نے کئی بار سوچا کہ کالج جا کر اس کا حال احوال پوچھے مگر نت سننے پڑا۔ نے اتنا مصروف رکھا کہ سپر کو شملی جامہ نہ پہنا سکی۔ اور پھر۔۔۔ عاطف کی چھٹی ختم ہو گئی۔ اس دن سبھی بڑے ادا اور تو اور اظفر اور ندیم کی آنکھوں میں جو ہر وقت شرارت کے تارے ٹٹھا رہتے تھے۔ ڈوب سے گئے تھے۔

اتنے دنوں سے آئی ہوئی تھیں۔ گھر کے ہر کونے میں کپڑے تلے بھرے پڑے تھے۔ اکٹھے کرتے کرتے بھی پورا دن لگ جاتا تھا۔ پناہ لگے دل واپسی کا وقت مقرر ہو گیا۔

سیمیں جب کالج سے واپس آئی تو ان کی تیاریاں دیکھ کر سچ سچ ہی ردی۔ اور پھر جب یہ معلوم ہوا کہ نازی اور جین اب مزید ٹھہرنے کو تیار نہیں تھیں تو ان سے بول چال بند کر دی۔

رات کو کھانا کر مرنے سے پہلے موجود تھے مگر کچھ بھی خاموشی ہی تھی۔ صرف

آخری دن سب بہنوں نے اسے الوداعی پارٹی دی۔ اپنے اپنے ہاتھ ایک ایک چیز عاطف کے لیے بنائی۔ مگر آج اظفر اور ندیم نے کسی میں کو پس کر نہ ڈالی اور کسی میں مریچیں نہ جھونکیں۔ سب کھانے بے حد مزہ

احقر اور بدیم ایک دوسرے کے کانوں میں کچھ کھسکھس کر رہے تھے۔ کھاتو رہے تھے اور پچیس پچیس زیادہ ہو رہی تھی۔

سیمیں میز پر تو تھی مگر نازی اور جبین سے ناراض ہونے کی وجہ سے کھانے سے بھی روٹھ گئی تھی۔ ایک نوالہ بھی نہیں لیا۔ بس منہ پھلایا بیٹھی رہی۔ اور شاید اسی کا سوجا پھولا چہرہ دیکھ دیکھ کر احقر اور بدیم ہلکا جاس رہے تھے۔

کچھ دیر تو سیمیں ان کی مسکراہٹیں اور کھسکھس برداشت کرتی رہی مگر غصے سے اٹھ کر دھپ دھپ پاؤں مارتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسے آدھا منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کی پیچ کی آواز سنائی دی۔ بڑی بھیاہ قسم کی پیچ تھی۔

سب چونک پڑے۔ احقر اور بدیم نے ہاتھوں میں پکڑے نوالے دیں پھینکے اور باہر بھاگ گئے۔ نازی، جبین اور صاحبہ بھی ان کے پیچہ رقیہ خانم اور رفوخالہ وہیں دل تھام کر بیٹھی رہیں۔ پریشانی کے مارے ان سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ "یا اللہ خیر۔ یا اللہ خیر۔"

دونوں درود شریف اور نجانے کیا کیا پڑھنے لگیں۔ اگر ایک آدھا منٹ اور کوئی آواز نہ آتی تو شاید دونوں کے ہی دلوں کی دھڑکنیں بند ہو جا قدموں کی چاپ پر منتظر لگا ہوں دروازے پر موقوف کر دیں۔

احقر بھاگا بھاگا اندر داخل ہوا۔ بے حد کھراپا ہوا تھا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟؟"

"سیمیں آپنی کو ایک بھوت چمٹ گیا۔"

"ہائے! میں مر گئی۔" رفوخالہ چلائی۔

"ارے آپا! میں تو اب ایک پل یہاں نہیں رکوں گی۔ ابھی واپس جاؤنگی۔"

اپنے پہلے کیوں نہ بتایا کہ اس گھر میں بھوت پریت کا بسیرا ہے۔؟

"رفو! پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔" رقیہ خانم دم بخود سی تھیں۔

"خدا یا رحم کر۔! پھر وہ اٹھیں کہ خود جا کر دیکھیں معاملہ کیا تھا۔"

"ارے! تو سب لڑکیاں کہاں ہیں۔؟" رفوخالہ بیٹھی بیٹھی چلائی۔

"وہ سب بھوت کو چمٹ گئیں کہ وہ کیوں سیمیں آپنی کو چمٹا تھا۔"

"ہائے ہائے۔ جاؤ انہیں اندر بلاؤ۔" رفوخالہ کا چہرہ سپید ہوا

جارا ہوا تھا۔

"جل تو جلال تو۔ آئی بلا کوٹال تو۔" وہ سر ہلا کر ورد کرنے لگیں۔

"اسی لیے میں کہتی تھی آپا! کہ پہاڑوں میں اکثر جن اور بھوت جتے ہیں۔"

سب بچوں کے گون میں سورۃ جن کا ایک ایک تعویذ ڈلوا دیں مگر آپ نے میری ایک نہ سنی۔

"احقر بیٹے! آؤ میرے ساتھ باہر۔ لڑکیوں کو دیکھیں کیا ہوا۔؟" رقیہ خانم

بھی جی جی میں کچھ ڈری ہوئی تھیں۔

"ایک تو خانساں بھی آج چھٹی پر ہے اور کھینٹ مالی اپنی کوٹھری میں پڑا خراٹے

لے رہا ہوگا۔"

"آپ بیٹھیے خالہ امی! میں جاتا ہوں۔ ویسے بھوت صاحب کو ساتھ

لے کر وہ سب ادھر آنے ہی لگی تھیں۔"

"ہائے ہائے! کیا غضب ہو گیا۔" رفوخالہ ہمتے ہوئے دونوں ہاتھوں

"آپا! یہ کیا ہو رہا ہے۔؟ نازی، جین! کہاں ہو میری بچیو! ہائے! میں ان کے باپ کو کیا جواب دوں گی۔؟"

"رفو! حوصلہ رکھو۔ میں ابھی جا کر دیکھتی ہوں۔" رقیہ خانم نے باہر جانے کے لیے جھجک جھجک کر دو تین قدم اٹھائے ہی تھے کہ قدموں کی چاپا ہنسی قہقہوں کی آواز کان میں آئی۔

گھبرا کر ٹپٹیں اور جلدی سے اپنی جگہ پر بیٹھ کر ہانپتے ہوئے منوش نگاہیں دروازے پر مرکوز کر دیں۔

صاف تھکے لگتی اندر آگئی۔ ایسا سنجیدہ معاملہ تھا اور وہ ہنس رہی تھی رفو خالہ نے اسے ڈانٹنے کے لیے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے ہی تھے کہ نازی اور سمیں عاطف کو دروازے کے اندر دھکیلتے ہوئے آگے آئیں۔

"دیکھی امی! آپ نے بھائی جان کی شرارت۔!"

"عاطف! ارے! تم کب آئے۔؟ اور وہ بھوت۔" رفو خالہ چلائی

"ارے جین کہاں ہے۔؟"

"اجی! کیا ہوا۔؟" ان کے پیچھے سے جین نے سر نکالا۔

"میں یہاں ہوں۔ آپ اتنا گھبرائی ہوئی کیوں ہیں۔"

"وہ۔ وہ بھوت۔ کہاں گیا۔؟" وہ بھلائیں۔

"اظفر نے بتایا تھا کہ سمیں کو بھوت چمٹ گیا ہے اور اب سب لڑکیاں۔"

رفو خالہ کی بات کسی نے پوری بھی نہیں سنی۔ قہقہوں کا طوفان مالاٹھ پڑا۔

"رفو خالہ! وہ تو عاطف بھائی تھے۔"

کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ دکھائی نہ دیا تو جلدی سے بولیں۔

"تم کیوں جینتی تھیں سمیں۔؟"

"یہ عاطف بھائی نے ڈرا دیا تھا۔ پر لے برآمدے میں اندھیرے میں چھپا ہیدھے کھڑے تھے۔ میں غسل خانے کی طرف جا رہی تھی مجھے دیکھ کر کبھی ذرا

ہلے چلے نہیں۔ اور میں ڈر گئی۔ سمجھی تھی کوئی چور ہے۔!"

سمیں عاطف کی جانب دیکھ کر بے اختیار ہنس دی۔

"پھر میری بیچ سُن کر اظفر نے آکر بتی جلائی تو دیکھا یہ جناب تھے۔"

"کہاں ت بخت اظفر۔؟ کہا تھا بھوت چمٹ گیا ہے۔ ہا ہا ہا!"

میرا تو دل ابھی تک دھک دھک کر رہا ہے۔" ایک بار پھر قہقہہ پڑا۔

"ارے لڑکیو! بھائی کو بیٹھنے تو دو۔ کیسے اسے گھیر کھڑی ہو۔"

رفو خالہ نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے جلدی سے موضوع بدل دیا۔

"دیکھیے نا۔ کتنی بیوقوف ہیں۔ بھوک اور تھکن کے مارے میرا بُرا

حال ہو رہا ہے۔"

سمیں نے جلدی سے کرسی بڑھائی۔ عاطف بیٹھ گیا۔ نازی نے بڑھ کر

جلدی جلدی پیٹ میں سائین نکالا اور عاطف کے آگے رکھ دیا۔

"آؤ بھئی۔! اب میرا ساتھ کون کون رہے گا۔؟" عاطف نوالہ پیتے

ہوئے بولا۔

"ہم تو سب کھا چکے۔" رقیہ خانم اور رفو خالہ بولیں۔

سمیں عاطف کے پاس ہی کھڑی تھی، اسی طرح کھڑے کھڑے عاطف کی

پیٹ میں ہی کھانے لگی۔

”پیٹ ہو گئی ہو۔“ عاطف نے پوچھا۔  
”میں نے اس وقت کھایا نہیں تھا۔“ سمیں نے بخندگی سے کہا۔  
”کیوں۔“

”یہ سب کل جا رہے ہیں اور میں سب سے روٹی ہوئی تھی۔“

”چلو اب من جاؤ۔ کل کوئی نہیں جا رہا۔“

”کیوں؟“ رقیہ خانم نے پوچھا۔ ”کیا کوئی خاص بات ہو گئی؟“

”ہاں۔“

”کیا۔“ روفانہ گھبرا گئیں۔

”میں جو آگیا ہوں۔“ عاطف مسکرایا اور سب قہقہہ لگا اٹھے۔

”مگر جین کا بہت سا درسکول کا کام کرنے والا ہے اور نازی کو بھی کوئی

کام ہے۔“ پیٹیوں نے جو دلائل دے کر ماں کو واپس چلنے پر دبا

کیا تھا، روفانہ کی زبان پر آگئے۔

”وہ امی۔“ کوئی بات نہیں + میں کام پیس ختم کر لوں گی۔“

جین کی بات پر سب ہی ہنس پڑے۔

”لیکن عاطف اب بیٹے تم خلاف توقع آ کیے گئے۔“ امی نے پوچھا

”چند دن پہلے تو ایک مہینے کی چھٹی گزار کر گئے تھے۔“

”ایک مہینے کی اور مل گئی۔“

”ہج۔“ سبھی بیک زبان چلائیں۔

”ہاں ہج۔“

”لیکن وہ چاہتے تھے۔“

”مادرت امریکہ جا رہے ہیں۔“

”کب۔“ سب کے چہروں پر خوشی جھلک اٹھی۔

”مہینے ڈیڑھ مہینے بعد۔“ عاطف ہنسا۔

”اب ذرا میری خوب خاطر مدارات کر دو۔ پھر پتہ نہیں سال بعد آؤں کہ دو

سال بعد۔ اور اتنا عرصہ کیسے پھیکے پھیکے سے کھانے کھانا پڑیں۔“

رقیہ خانم کا چہرہ پھیکا سا پڑ گیا۔ پہلے اس کے جانے کی خوشی تھی کہ یہ کورس

بیٹے کے لیے بہت ساری ترقی کا در کھولنے والا تھا۔ مگر اب جبکہ بالکل طے

ہو گیا۔ جانے کا وقت بھی مقرر ہو گیا۔ تو خود ہی اداس بھی ہو گئیں۔ اتنے

بلجے عرصے کی جدائی۔ !!

پردیس بڑی بڑی چیز ہوتی ہے۔ اور پھر امریکہ جیسا ملک! اتنا

دور دراز اور ایسا آزاد ماحول۔ آزاد معاشرت۔ !! انہیں تو بیٹے کی فکر

پڑ گئی۔ کہیں ہاتھ سے نہ جائے۔ دل ہی دل میں خوف سا سما گیا۔

سب بچے خوب زور شور سے باتیں کر رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی

نہیں دے رہی تھی۔ ہنسی تھی۔ قہقہے تھے۔ !!

جین پتہ نہیں وہاں سے کیا کیا کچھ لانے کو کہہ رہی تھی۔ نازی اور سمیں بھی

کوئی فرمائشیں کر رہی تھیں اور روفانہ بھی باقاعدہ بات چیت میں حصہ لے رہی تھیں۔

عاطف ہنس رہا تھا۔ مذاق کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ سب کو صبر کی تلقین بھی

کیے جا رہا تھا کہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ ہر ایک کو اس کی

مطلوبہ چیز مل جاتا تھی۔

اچانک انظر کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

”بھائی جان! آپ ماثرا اللہ اتنے پرکشش ہیں۔ ایسے چوڑے چمکے اور ہیں۔ آپ پر تو بڑی میمن میمن کی۔ پلین! میرا خیال رکھیے گا۔ ایک ہر لیے ضرور لیتے آئیے گا۔ اپنی۔ کے علاوہ۔!“

انظر کا یہ مذاق رقیہ خانم کو ایک انوکھی قسم کی دعوت قرار دے گیا۔ کچھ اور پھر چمکے سے روفو خانہ کا ہاتھ تھام لیا۔

”روفو! ادھر میرے کمرے میں آؤ۔“ ان کی آواز میں اضطراب سا تھا۔

”کیوں آیا۔! خیر تو ہے۔؟“

”ہاں۔ تم سے ایک بے حد اہم بات کرنی ہے۔“

کبھی اہم بات کے لیے تو روفو خانہ ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سب بچوں کو وہیں ہٹے کھیلنے چھوڑ دوں رقیہ خانم کی خواب گاہ پہ چلی گئیں۔ رقیہ خانم نے اندر سے چٹخنی لگائی تو رقیہ نے ان کی حرکات کو پرانا بھرے عرصے سے دیکھا۔ ”آپا۔! خیر تو ہے نا۔؟“

”عاطف اتنے طویل عرصے کیلئے امریکہ جا رہا ہے۔“ رقیہ خانم رقیہ کے ہاں بیٹھ گئیں۔

”اور اس ملک کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہے اور سنا ہے اور میرا لڑکا جہان میں چاہتی ہوں اس کی شادی کر کے بھجوں۔ مجھے دلائی یا امریکن ہو پسند نہیں میں اپنے مذہب اور اپنے دیس کی لڑکی کو اپنی بہن بنائوں گی۔“

”گر آپا۔! اتنی جلد۔!“

”اب کچھ ہو سکتا ہے روفو۔“

”ابھی تو عاطف کی کہیں بات بھی پکی نہیں ہوئی۔ ایک دم شادی کیسے ہو سکتی ہے۔؟“

”میں نے اس مسئلے پر پہلے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ورنہ نام ہی لے چھوڑتی۔ لیکن۔“ سوچ میں کھو سی گئیں۔

”اب بھی ہو سکتا ہے روفو۔! میرے بچے میں کوئی عیب نہیں۔ کوئی بڑی لت نہیں اسے۔ فوج میں اتنی اعلیٰ ملازمت پر ہے۔ کوئی بھی لڑکی دینے سے انکار نہیں کرے گا۔“

”لیکھی آپا! پہلے لڑکی ڈھونڈنا ہے اور پھر شادی کی تیاری۔ اتنے قلیل وقت میں کیا کیا ہوگا۔؟“

”لڑکی ڈھونڈ لی جائے تو بس۔ پھر تو ایک ہفتے کے اندر اندر شادی ہو سکتی ہے۔“

”لڑکے کی شادی کا تو اتنا کام نہیں ہوتا مگر لڑکی والوں کے لیے یہ وقت بہت کم ہے۔“

”میں اگر لڑکی والوں سے کہوں کہ جہیز وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں اللہ کا دیا سب کچھ ہمارے پاس ہے۔ تو پھر وقت کیوں کم ہوگا۔ بس روفو! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ عاطف کی شادی کر کے ہی اسے بھیجوں گی۔“

”اور مسئلہ تو لڑکی کا ہے آپا۔!“

”لڑکی ڈھونڈنے کا کام لڑکیاں اچھا کر سکتی ہیں۔“ رقیہ خانم مسکائیں۔

”اب تو رات ہو گئی۔ صبح تم جانا طوتوی کر دو اور لڑکیوں کو کہتے ہیں کہ

بھائی کے لیے دھن ڈھونڈیں۔ جوان دماغ اچھا کام کریں گے۔“



”خدا مبارک کرے۔“ رفوخالہ بڑبڑائیں۔

”آپ کو کیا پتہ آیا۔! کہ عاطف کا سہرا دیکھنے کا خود مجھے کتنا ارمان ہے“  
دونوں ہنسنی مسکرائیں۔

”وہ۔۔۔“ عاطف کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”امی کا بھروسہ قائم رہے گا۔“ میرا پہلے ارادہ تو نہیں تھا کہ شادی کر کے  
امریکہ جاؤں۔ اور اگر امی کی یہی خواہش ہے تو میں کبھی انکار نہیں کروں گا۔“  
”ویری گڈ۔ ویری گڈ۔“ اظفر اور ندیم چہرے ناپتنے لگے۔  
”ارے ٹکیو۔۔۔! تم بھی کوئی خوشی کا اظہار کرو۔“

اظفر نے جبین کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ ناچ میں شامل  
کرنے کی کوشش کی۔

”اصل خوشی کا اظہار اس وقت ہو گا جب دولہن ڈھونڈ لی جائے گی۔“  
”وہ تو میں نے ڈھونڈ بھی لی۔“ اظفر جبین کو چھوڑ کر جلدی سے عاطف  
کے پاس اکھڑا ہوا۔

”کونسی۔۔۔؟ کونسی۔۔۔؟“ سبھی بڑے اشتیاق سے اظفر کی جانب دیکھنے  
پہلے بھائی جان وعدہ کریں کہ اتنے اچھے انتخاب پر مجھے مٹھائی کھلائیں گے۔“  
”میں مٹھائی کھلاؤں گی۔“ رقیہ خاتم جلدی سے بولیں۔

”نہیں خالہ امی! آپ سے نہیں۔“ بھائی جان سے کھاؤں گا۔ کیونکہ ان  
کے دل کی مراد پوری ہوگی۔“

”بھئی تمہیں مٹھائی ہی کھانی ہے نا۔ سو کھالینا۔“ رفوخالہ کو سننے کی  
بڑی بے چینی تھی۔

”بتا دوں پھر بھائی جان۔۔۔؟“  
”ہم جو کہہ رہے ہیں کہ بتاؤ۔؟ اس سے کیا پوچھتے ہو۔؟“  
”صفوراں بی بی۔“

رات کو دونوں بہنوں نے جو فیصلہ کیا تھا۔ صبح ناشتے کی میز پر اس کا  
اعلان ہوا۔۔۔ سبھی خوب زور زور سے خوشی کے نعرے لگانے لگیں۔  
اظفر اور ندیم تو ناشتہ چھوڑ چھاڑ اٹھ کر عاطف کے ارد گرد ناپتنے لگے اور تائیاں  
بجا بجا کر سہرا گاتے لگے۔

رقیہ خاتم اور رفوخالہ کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھری تھیں اور بڑے پیار سے  
سب کو دیکھ رہی تھیں اور نہال نہال ہوتی جا رہی تھیں۔

جبیں کو ایک دم ہی اپنے کپڑوں کی فکر پڑ گئی تھی کہ کون سے پہنے گی۔؟ اور  
صانعہ کو اپنے بالوں کی۔ جن کی نہ صحیح چوٹی بن سکتی تھی اور نہ ہی ڈھنگ سے  
ترشے ہوئے تھے۔!

”لیکن امی۔! پہلے بھائی جان سے تو پوچھ لیں۔ ان کی کیا مرضی ہے۔“  
یہیں ہمیشہ منتقل و ہوشش سے سوچا کرتی تھی۔

”تم نہیں پوچھ لو۔ ویسے مجھے عاطف کی سعادت مندی پر پورا پورا بھروسہ  
ہے کہ میری خواہش کو رو نہیں کرے گا۔“

عاطف چپ چاپ بیٹھا رہا۔  
”پھر عاطف۔! آپا کی بات کا تم نے جواب کچھ نہیں دیا۔“ رفوخالہ بولیں۔

صغوریاں، مالی کی بیچ بھری انھوں والی سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی تھی۔ ہر وقت بے حد گندی رہتی۔ مگر پھر بھی مالی ہر ایک کے آگے اپنی بیٹی کی صفائی پسند طبیعت اور لکھڑیوں کے گن گایا کرتا۔

تقمقے کے ساتھ سب انظر کو مارنے کے لیے لپکیں۔ انظر اماں کی خاطر بھاگ کر رقیہ خانم کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

”بھئی سچی بات۔! اس وقت جلدی میں تو صرف وہی مل سکتی ہے۔ اور پھر ویسے بھی۔“ پھر عاطف کی جانب مٹنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرا دیا۔  
”کیا ویسے بھی۔؟“ جبین نے پوچھا۔

”عاطف بھائی اسے بہت پسند کرتے ہیں۔“

”ہائیں۔!“ رقیہ خانم حیرت سے چلائیں۔ ”یہ کیا کہتے ہو۔“

”ہاں حالہ امی۔! ایک دن میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لان میں ایکسے تھے اور اشارے سے اسے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ ایک جوان لڑکا نوجوان لڑکی کو اشارے کرے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔؟“

سب بے ساختہ تقمقہ لگا اٹھیں۔

”ہمت تیرے کی انظر کے بچے۔! تو بڑا بدتمیز ہے۔ وہ تو کرسی پر کبھی جانور کی بیٹ تھی تو اُسے صاف کرنے کو بلا رہا تھا۔“

”آپ بہانے نہ بنائیے۔“ انظر ڈھٹائی سے بولا۔

”بھئی چپ بھی کرو انظر۔! ہمیں ذرا سنجیدگی سے سوچتے دو۔“ نازی نے اُسے جھڑک دیا۔

”نہ سہی۔ آخر میں ہم ہی کام آئیں گے۔“ انظر بڑبڑاتے ہوئے اور دھبے

پاؤں مارتے ہوئے باہر نکل گیا۔

”جوتہ! تم نکلتے کس کے کام آسکتے ہو۔“ جبین بڑبڑائی۔

”تم تو صرف تنگ ہی کرنا جانتے ہو۔“

”اجی! وہ بڑے ماموں کی سالی کی لڑکی سارہ کیسی رہے گی۔“ جبین کی بڑبڑاٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے نازی نے تجویز پیش کی۔

”خاصی پیاری ہے اور پھر بڑے عرصے سے ان کی نگاہ بھی عاطف بھائی پر لگی ہے۔“

”نہ بھئی! ہم تو وہاں نہیں کرنے دیں گے۔“ جبین ناک بھوں چڑھتے ہوئے

بولی۔ ”مجھے سارہ کا بڑا اچھی نہیں لگتیں۔ بے حد مغزوریں۔ کسی سے سیدھے

منہ بات ہی نہیں کرتیں۔“

”مغزور تو واقعی وہ بہت ہے۔“ رفو خالہ نے جبین کی تائید کی۔

”خود کو بہت کچھ سمجھتی ہے۔“

”بڑی پھوپھو کی کوکب کے متعلق کیا خیال ہے امی۔؟“ سیمیں نے کہا۔

”لڑکی تو اچھی ہے مگر اس کی ماں سے میری ساری عمر نہیں بنی۔ ایسا نہ ہو بیٹی کو

بکھلا پڑھا کہ مجھ سے میرا بیٹا ہی چھڑا لے۔“ رقیہ خانم نے جواب دیا۔

”مغزوں سے اچھا سلوک کیا کرتے ہیں امی۔!“ عاطف شرارت سے مسکرایا

”میں نے تو ہمیشہ تمہاری دونوں پھوپھیوں کو سگی بہنیں ہی سمجھا مگر بخانہ کیوں ٹی

کو تو مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔“ رقیہ خانم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”اور قسمت دیکھو۔ چھوٹی پھوپھو کی کوئی لڑکی ہی نہیں۔ ورنہ وہ لے آتے۔“

تدیم کی بات پر سب کو ہنسی آگئی۔

”یہ مغزوری تو نہیں ہو گیا کہ کسی پھوپھی ہی کی لڑکی آئے گی۔“ جبین نے

”ہمیں! تمہاری اتنی سیلیاں ہیں۔ کتنی تھیں بڑی خوبصورت خوبصورت ہیں۔ ان میں سے کوئی بتاؤ۔“

جب سب رشتہ دار لڑکیاں ختم ہو گئیں تو رفو خالہ نے مزید سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ سیلیاں ہیں تو۔ نازی اور جین نے دیکھی بھی ہوئی ہیں۔“

”مگر اس نظر سے تو نہیں دیکھی تھیں نا۔“ نازی بولی۔

”تو پھر آج ہی میرے ساتھ چلو۔ سب مل کر کوئی لڑکی پسند کر لیں گے۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ رقیہ خانم نے مسرت کا اظہار کیا۔

”میں چاہتی ہوں عاطف کی دھن بہت بڑھی لکھی ہو۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو

سوسائٹی میں بات کرنے کا سلیقہ بھی ہوتا ہے۔“

تینوں اسی وقت تیار ہو کر کالج چل دیں۔ رقیہ خانم اور رفو خالہ بھی غافل

نہ بیٹھیں۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر پھر سوچنے لگیں۔ بہت دور دور کے رشتہ داروں

اور سب ملنے جلنے والوں کی لڑکیاں چھان بھٹک ڈالیں۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں۔

آخر رفو خالہ کو کچھ سوچھا۔ عاطف کو بلوایا گیا۔

”عاطف! تمہارا جی سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ تمہیں نے زندگی گزارنی ہے۔

اگر تمہاری نگاہ میں کوئی لڑکی ہے۔ میرا مطلب ہے کسی سے دلچسپی وغیرہ ہو تو

بتا دو۔“ رفو خالہ نے مسکرا مسکرا کر کہا۔

”نہیں رفو خالہ! میں نے اس نظر سے کبھی کسی کو دیکھا ہی نہیں۔“

”ارے! تو کیا تمہیں شادی نہیں کرنا تھی۔“

”کیوں نہیں کرنا تھی۔؟ اللہ کے بنائے ہوئے اصول، ضابطے اور قانون

تو ہر انسان کو پورے کرنا ہی چاہئیں۔ شادی سے میں منکر نہیں ہوتا۔ مگر میں نے

نذیم کو گھورا۔ ”عقل نہ ہو تو بات نہیں کیا کرتے۔“

”اور تمہیں تو جیسے بڑی عقل ہے۔ ابھی تک دسویں ہی پاس نہیں کر سکیں لالائی

زمانے بھر کی۔“

”تم نے کیوں لڑنا شروع کر دیا۔ چپ کر دو۔ ہمیں کچھ چین سے سوچنے بھی

دو۔“ رفو خالہ نے انہیں ڈانٹا اور پھر قدرے توقف بعد بولیں۔

”آپا! وہ میری منجھلی منڈ کی لڑکی زینچا کیسی ہے۔؟“

”اچھی ہے۔“ رقیہ خانم نے سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیں اتنی۔! اس کا قد بہت پھوٹا ہے۔“ نازی بڑبڑائی۔ ”عاطف بھائی

جیسے چوڑے چمکے اور لمبے رنگے فوجی کے ساتھ تو بالکل نہیں سجے گی۔“

اسی طرح بے شمار لڑکیوں کے نام لیے گئے۔ مگر کسی کو کسی نے ناپسند کر دیا اور کسی

کو کسی نے۔ اتنے سارے لوگ۔ سب کی اپنی اپنی پسند۔ کسی ایک پر متفق نہ ہو

تہ سکے۔ عاطف بیٹھا سب کی باتیں سنے جا رہا تھا اور ہنسنے جا رہا تھا۔

”امی! آپ نے خواہ مخواہ ہی سب کو مصیبت میں ڈال دیا۔“

”مصیبت کیوں؟ عین راحت۔! وطن ڈھونڈنا تو سب سے زیادہ

دلچسپ اور پر مسرت کام ہوتا ہے۔“

”اور پھر بھائی جان! جس کے گھر لڑکی دیکھنے جائیں وہ خاطر میں بھی بہت کرتے ہیں

بڑی چیزیں بکھاتے ہیں۔“ صاعقہ نے خوش ہو کر کہا۔

”بشار اللہ کافی مدد دے گی ہو۔“ کیا گھر میں تمہیں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔؟“ جین

نے صاعقہ کو گھورا۔

”وہ تو میں نے ایسے ہی کہا تھا۔“ صاعقہ شرمندہ سی ہو کر اپنی سیلی کو ملنے چلو

اٹھ کھڑا ہوا —

”بھائی جان! ذرا میرے ساتھ آئیے۔“

”کیوں؟“

”ایک بہت ضروری کام ہے۔“

عاطف کچھ حیل و حجت کرنے ہی والا تھا کہ اظفر نے اس کا بازو تھام لیا۔

”آئیے تو ہسی۔ ایمان سے میں اس وقت بے حد بخیدہ ہوں۔“

عاطف اس کے ساتھ چل دیا۔

”کہو۔“ کمرے میں پہنچتے ہی عاطف نے ذرا عجب سے کہا۔

”لالہ کیسی لڑکی ہے۔؟“ اظفر نے بڑی بخیدگی سے پوچھا۔

”اچھی ہے۔“

”یوں نہیں۔ خالی خوبی اچھی ہے۔ تصور ہی تصور میں پہلے اُسے اپنے پہلو

میں بٹھائیے۔“

”پاگل!۔“ عاطف بے ساختہ مکرا پڑا۔

”بیوی بنا کر بھائی جان! کسی اور ناجائز طور سے نہیں۔ ہاں تو پھر

سوچئے کہ کیسی ہے۔؟ شکل اگر چندے آفتاب پندے ماہتاب نہیں تو بد صورت

بھی نہیں بلکہ خاصی پرکشش ہے۔ جیسے آپ سانولے سلونے ہونے کے باوجود

نوبصورت کہلاتے ہیں۔“ اظفر بغیر ہنسنے مکر لائے بولے جلا جا رہا تھا۔

”اور عادات۔۔۔ واہ واہ۔۔۔! ماشاء اللہ۔۔۔ میرا تو خیال ہے جو بڑی نہ صرف

اچھی بلکہ بہترین رہے گی۔ یہ سب لڑکیاں اور امی اور خالہ امی تو صرف صورت

کو ہی لیے بیٹھی ہیں۔ اور صورت بھی ایسی کہ جو اس دنیا میں ملنی مشکل ہو۔ قد

اس نگاہ سے اس لیے آج تک کسی کو نہیں دیکھا کہ یہ اتنی اور سیمیں وغیرہ کا حق ہے۔

اپنی پسند کی لڑکی لائیں گی تو اچھا گزارہ ہوگا۔“

”بڑے بیانے ہو۔“

”ذرا نوازی ہے خالہ آپ کی۔!۔“ عاطف جھک کر خالہ کو آداب بجالایا۔

”پھر۔۔۔؟ کچھ تو ہماری مدد کرو۔“

”مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ سب کیا کرتی ہیں۔“

”تو گویا ہمارا امتحان لے رہے ہو۔؟“ رفو خالہ مکر لائیں۔

”امتحان تو خیر نہیں۔ البتہ تماندے اہل کرم دیکھتے ہیں۔“

عاطف ہنسا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

چار پانچ گھنٹے کالج میں گزار کر لڑکیاں واپس آئیں تو ان کا انتظار کر کے رفیقہ

رفو خالہ، صاعقہ، اظفر اور نذیم کھانے کی میز پر جا بیٹھے تھے۔ سیدھی دیہیں پہنچ گئیں

”لڑکیو! کوئی گوہر مراد پایا۔“ اظفر نے کھنکھارتے ہوئے پوچھا۔

سب کی استفہامیہ نگاہیں ان پر گز گئیں۔

باقی سب کو تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ آپس میں ہی الجھ پڑیں۔ تینوں نے

ہی مختلف لڑکیاں پسند کی تھیں۔ اور ہر کوئی دوسری کی پسندیں کوئی نہ کوئی عیب

ڈال کر اپنی کو اس پر ترجیح دے رہی تھی۔ پھر آخر بحث اتنی بڑھی کہ جھگڑے کا

خطرہ پیدا ہوگا۔ اظفر ہنس ہنس کر دوہرا ہوا جا رہا تھا۔

”نہیں کیا ہو رہا ہے۔؟“ نازی نے اظفر کو گھورا۔ ”کبھی تو بخیدہ ہوا کر

”اوتے ہوئے۔! آپ تو مریحوں کے ڈرم میں سے نکل کر اتنی معلوم ہوتی

ہیں۔ لیجئے جناب! ہم یہاں سے چلے ہی جاتے ہیں۔“ اظفر مکر لائے ہوئے

۱۵ ہو تو سر دجیا —! زنگت چاندنی جیسی —! بال کالی کھٹاؤں کی طرح —! کسی خشک میوے جیسی —! کیا کہتے ہیں —؟ پستہ، بادام، چلغوزہ یا اخروں کا عطف کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی —  
 "میں اس وقت سنجیدہ ہوں بھائی جان! آپ بھی مذاق نہ سمجھیے — ہاں تو کہہ تھا، ناک تلوار کی تیز دھار کی مانند ہو — بعد میں بے شک کوئی حادثہ ہو جائے " کیا مطلب —؟ "  
 "آخر بیوی ہو گی کوئی دشمن تو ہو گی نہیں — پاس بھی آکر بیٹھا کرے گی — اور آپ تلوار کی تیز دھار سے زخمی و زخمی ہو جائیں تو —؟ نہ بابا! ہمیں نہیں منظور —! "  
 "یہ تم سنجیدہ ہو —؟" عطف مسکرایا —  
 "ہاں بالکل — سو فیصدی — اور اب میں آپ کو مکمل خلوت دے دیا رہا ہوں — سوچیے اور خوب سوچیے — اور پھر کل تک مجھے جواب دے دیا انظر کمرے سے باہر نکل گیا —

جوں جوں اس کے متعلق اس انداز سے سوچا — ایک نیا اور عجیب قسم کا اُنس ما اس سے محسوس ہونے لگا — وہ ہر لمحہ زیادہ سے زیادہ اچھی لگتی گئی۔ یوں — جیسے وہ ہمیشہ سے ہی اس کی آرزو تھی — اور اگر یہ دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ والی لڑکی اسے نہ ملی تو اس کے بغیر گویا زندگی ادھوری سی رہ جائے گی —  
 امی کو — سمیں کو — اسے اپنے گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لے آنے کی کوشش کرنا ہی چاہیے تھی — اپنے بیٹے کی خاطر —! اپنے بھائی کے لیے —!!

بظاہر وہ بے پرواہ سا رہا تھا — ہر معاملے سے بے نیاز — مگر لا شعور میں جیسے بہت عرصہ سے لالہ چھٹی بیٹھی تھی — انظر نے چھیڑا تو پردوں سے باہر نکل آئی — تمام خسر سامانیوں کے ساتھ —! دھیما دھیما اور دلآویز تبسم ہونٹوں پہ سجائے —!!  
 آنکھوں میں غلوص کی جھپک —!!

سارا دن بھی عطف ایسے سوچوں میں کھویا رہا اور رات بھی ایک پل کے لیے سو نہ سکا — اُف خدا! یہ کس نئی مصیبت میں انظر نے اسے ڈال دیا تھا — ساری رات جاگنے کے بعد اسے احساس ہوا — اس نے انظر کو بے شمار گالیاں دے ڈالیں — دل

انظر نے عطف کو ایک نئی سوچ میں مبتلا کر دیا تھا — جوں جوں سوچتا تھا انظر کی رائے بڑی مناسب معلوم ہو رہی تھی — ہر ہر زاویہ اس نے پرکھا اور ایسا نقطہ ایسا خیال ذہن میں نہ آیا جو ذرہ بھر بھی اس کی تردید کرتا یا کوئی قباحت اس میں دکھائی دیتی —  
 سمیں سے لالہ کی بڑی ہنسی تھی — بلکہ دونوں کا آپس میں بے حد پیار تھا

۱۱۹ میں پکا ارادہ کر لیا کہ اب اس معاملے اور لالہ کے متعلق ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچے گا۔

آخری سگریٹ ایش ٹرے میں بچھایا تو چونک اٹھا۔ راکھ اور جلے ہوئے تھکے تھکے ٹکڑوں سے وہ اباڑا تھا۔ عاطف نے کبھی اس زیادتی سے سگریٹ نہیں پئے تھے۔ اپنی دیوانگی پر اسے خود ہی ہنسی آگئی۔

ناشتے کی میز پر پھر وہی موضوع چھڑا ہوا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی تھیں۔ اظفر عاطف کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھ مار کر مسکرا دیا۔

"ہم نے لڑکی ڈھونڈ بھی لی اور یہ سب خواہ مخواہ ہی کائیں کائیں کر رہی ہیں۔" اظفر کی بات پر عاطف یکایک گڑبڑا گیا۔ گھبرا کر جلدی سے اظفر کو گھورا۔ مگر وہ اس کی جانب دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔

"کونسی اظفر۔؟ کونسی لڑکی ڈھونڈ لی۔؟" نازی اور سمیں تقریباً اکٹھی ہی لیے تابی سے بولیں۔

عاطف کھنکھارا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اظفر ابھی کوئی بات منہ سے نکالے جب تک لالہ کی مرضی کا کسی نہ کسی طرح علم نہ ہو جاتا۔ انہیں ابھی کچھ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھا۔

عاطف کے کھنکارنے پر بھی اظفر نے اس کی جانب نہیں دیکھا تو اسے غصہ آیا کیسا غلط فہم کا لڑکا تھا۔ کبھی اتنا عقلمند لگتا کہ مقابلے میں سبھی پہنچ نظر آتے اور کبھی ایک دم ہی اتنا بیوقوف ہو جاتا کہ اپنا ہی سر پیٹ لینے کو جی چاہنے لگتا۔ عاطف غصے میں کھولتا ہوا اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ عاطف کے کھنکارنے پر اظفر نے جان بوجھ کر اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ یہ جانتے

ہوئے بھی کہ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی بہمت متوجہ ۱۱۷ نہیں ہوا تھا۔ محض شرارت کی خاطر۔ اس سے دل لگی کے لیے۔!!

اور جب دیکھا کہ عاطف ناراض ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا تو جلدی سے خود بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔

"یہ آج آپ کو کھانسی کا دورہ کیوں پڑا ہوا تھا۔ کوئی علاج وغیرہ کیجئے" کہیں کوئی نازک صورت نہ اختیار کر جائے۔

"کو نہیں۔"

"کیا بات ہے۔؟" اظفر اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔

"مجھ سے کوئی ناراضگی وغیرہ ہو گئی۔؟ مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

"تمہیں متوجہ کرنے کے لیے اتنی زور زور سے کھانسا کہ حلق دکھنے لگا۔ میری

طرف دیکھتے کیوں نہیں تھے۔؟"

"اوہ! تو وہ کھانسی اسی سلسلے میں تھی۔" اظفر ساختہ معصومیت سے بولا

"مجھے کیا پتہ۔ میں سمجھا کوئی چٹنی، اچار وغیرہ کھا لیا ہو گا تبھی کھانسی آ رہی ہے۔"

پھر ایک دم رنج پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا اب کھانسی کر دیکھیے۔ اب فوراً متوجہ ہوں گا۔"

"بد تمیز۔!" عاطف کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"کھانیسے بھی۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" اسی طرح کھڑے کھڑے قدرے

توقف بعد بولا۔

"چلو کو نہیں۔" عاطف سنجیدہ ہو گیا۔

"یہ تو بتاؤ کہ تم بھی سے انہیں لالہ کے متعلق کیوں بتانے لگے تھے۔؟"

”لالہ کے متعلق کب بتانے لگا تھا۔؟“

”کہہ نہیں رہے تھے کہ لڑکی کا انتخاب کر لیا ہے۔“

”وہ میں نے لالہ کے متعلق کب کہا تھا۔؟“ انظر نے بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے عاطف کو دیکھا۔

”ہوں۔! تو یہ بات ہے۔؟“

”کیا۔؟“ عاطف بھی مسکرایا۔

”یعنی کہ دل و دماغ پر لالہ پوری طرح قابض ہو چکی ہے۔ اب ہر بات اس کے متعلق معلوم ہوتی ہے۔“

”پاگل ہو تم تو۔!“ عاطف ہنس دیا پھر سنجیدگی سے بولا۔

”وہ تم کس کے متعلق انہیں بتانے لگے تھے۔؟“

”صفوراں کی ایک چھوٹی بہن بشریٰ بھی تو ہے۔ وہ صفوراں سے بھی کچھ بڑی

صفائی پسند ہے۔ سوچا تھا شاید وہی لڑکیوں کو پسند آجائے۔“

”تم اپنی شرارتوں سے کبھی باز بھی آؤ گے کہ نہیں۔؟ معاملے کی نزاکت

کو تو بھانپ لیا کرو۔ ہر وقت مذاق اچھا نہیں لگتا۔“

”تو گویا کہ آپ نے لالہ بیگم کو اتنا سنجیدہ معاملہ بنالیا ہے۔“ وڈرفل

ویری گڈ۔!۔“

”کیا وڈرفل۔ ویری گڈ۔؟“

”بس بس۔ سمجھ گیا سب کچھ۔ میں ابھی سب کو یہ خوش شخبری سناتا ہوں

انظر جانے لگا۔

”سنو اطف۔! بات تو سنو۔“ عاطف نے گھبراتے ہوئے لیک کر

بازو تھام لیا۔

”لالہ کے متعلق ابھی کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔“

”کیوں۔؟“

”پہلے اس کی بھی تو مرضی معلوم ہو۔“

”واہ بھائی جان واہ۔! اس کی کیسے مرضی نہ ہوگی۔ ارے! مجھے آپ جیسا

لڑکا بل جائے تو میں تو ابھی فٹنڈ شادی کروں۔ انکار تو بڑی بات۔ ایک لمحے

کے لیے سوچوں بھی نہ۔ آپ میں ماشاء اللہ اتنی ساری خوبیاں موجود ہیں۔“

”ایک تو میں تمہارا بھائی ہوں۔ اور دوسرے۔ ہر ایک کی پسند مختلف ہوتی ہے۔“

”تو بھائی جان! معلوم کیسے لیتے ہیں۔“

”وہ کس طرح۔؟“

”آپ آج ہی اس کے کالج چلے جائیے۔ چھٹی کے وقت۔! اور وہ جب

گھر جانے کے لیے باہر نکلے تو اسے کیسے کہہ سکیں گے بلایا ہے۔ سیمیں آپنی کے لیے

فراہم کی آئے گی۔ تو راستے میں بات کر لیجئے گا۔“ پھر شریر نظروں سے ٹٹ

کو دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

”اؤز اگر دراز و ناٹک قسم کی گفتگو کرنا ہوگی تو کوئی طویل سارا سہ اختیار کر لیجئے گا۔“

ساتھ ہی لب بچھنے بچھنے کر مسکرانے لگا اور کوئی طریقہ سی دھن سیٹی میں بجانے لگا۔

”ہو نہ! میرے ساتھ چل ہی تو پڑے گی۔“ عاطف اس کی شریر نگاہوں اور

مسکراہٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”کیوں نہیں۔! انظر جلدی سے بولا۔“ ”میرا تو خیال ہے کبھی انکار نہیں کریگا“

”مجھ اکیلے کے ساتھ۔؟“

”ہاں! لیا خرچ ہے؟“ لالہ پر بھی لکھی اور حاضمی معمول لگتی ہے۔  
پھر سنجیدگی سے کہنے لگا۔

”چلیے اور کچھ نہیں تو یہی معلوم ہو جائے گا کہ اسے آپ پر یا خود پر کتنا اعتبار ہے اور اگر نہ لے لے آپ پر اور نہ ہی خود اپنی ذات پر اعتماد ہے تو پھر تو یہ رشتہ مٹا ہی نہیں رہے گا۔“

بعض وقت انظر بڑی پتے کی بات کر جایا کرتا تھا۔ عاطف نے سوچا۔  
”کیا اب بھی تو کہہ رہا تھا۔ اگر لالہ کو عاطف کی شرافت اور عالیٰ نبی پر بھروسہ ہی نہیں تھا تو پھر یہ رشتہ کس طرح درست ہو سکتا تھا۔“

”پھر۔۔۔ کیا سوچ رہے ہیں۔۔۔؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔۔۔!“

”ہم تو بھائی جان! ہمیشہ ہی بڑی عقل کی بات کیا کرتے ہیں۔“ انظر ایک دم  
اگر اڑ کر کرے میں ٹپکنے لگا۔

”لو ساتھ ہی اپنی بیوقوفی کا ثبوت بھی دے دیا۔“ عاطف ہنسا۔

”بیوقوف انسان ہمیشہ خود کو عقل مند سمجھتا ہے۔“

انظر جھینپ کر مسکراتے لگا۔

”وہ تو میں شرافت سے کہہ رہا تھا۔“ پھر موضوع بدلنے کے لیے جلدی سے

سنجیدہ ہو گیا۔

”میرا خیال ہے پھر آج ہی اپنی قسمت آزمائیے۔ خدا کرے خوش قسمتی آپ کا

ساتھ دے۔“ انظر نے کسی بزرگ کے انداز میں اسے دُعا دی۔ عاطف مسکرا  
”میں سنجیدہ ہوں بھائی جان!۔“ اور انظر بڑوں کے سے انداز میں چہرے پر

سنجیدگی طاری کیے ہوئے تھے۔ باہر چل گیا۔  
عاطف اکیلا ہوا تو پھر انہیں سوچوں نے آکھیرا۔ بڑی دیر لگتا رہا۔ سگریٹ  
پیتا رہا اور کمرے میں ٹپکتا رہا۔ پھر کھانا کی گھڑی دیکھی۔ وقت کا کچھ اندازہ لگایا  
اور لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔

تیار ہو کر سیٹی بجاتا اور گاڑی کی چابی انگلی میں گھاتا ہوا باہر پورچ میں گیا تو میں  
نازی اور رفوخالہ خوب رنگا رنگ کپڑوں میں طوس ہنستیں ہسکراتیں، کھل کھل کر تیں،  
برآمدے میں برآمد ہوئیں۔ وہیں ٹھٹھک کر انہیں دیکھنے لگا۔

ان کے ساتھ ایک بوڑھی سی اور خستہ و خراب چلیے والی عورت بھی تھی۔ چہرے  
سے بڑھاپے کی معصومیت کی بجائے عیاری سی ٹپک رہی تھی۔

جانے کیوں اسے دیکھتے ہی عاطف کے ذہن میں پہلا جو خیال اُبھرا وہ یہ تھا  
کہ پچھا پچھا کتنی اسی قسم کی چیز کا نام ہوگا۔

عاطف کو دیکھتے ہی وہ رفوخالہ سے پوچھنے لگی۔

”اسی لڑکے کا رشتہ چاہیے۔؟“

”ہاں۔۔۔“ رفوخالہ نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”کیسا ہے۔؟“

”ویسے تو ماشاء اللہ باقی سارا ٹھیک ہے۔“ اُس نے عاطف کو سر سے پاؤں

تک بنظر غائب دیکھا۔ جیسے کوئی قصاب بکرے کو۔۔۔!

”بس ذرا رنگ کی وجہ سے کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

عاطف کو اس کے اس انداز پر بے اختیار ہنسی آگئی۔

”ہائے ہائے! اتنا پیارا تو ان کا رنگ ہے۔“ نازی جلدی سے

تھپک کر بولی۔ ”گڑبڑ کیوں ہوگی۔؟“



”بھائی جان! ہمیں ذرا آپ کی ضرورت تھی۔“ سیمیں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی۔

”اوئے ہوئے! مارا گیا۔“ عاطف نے دل ہی دل میں کہا۔  
 ”آپ کہیں جا رہے تھے۔؟“ نازی نے ویس سے پوچھا۔  
 ”جا تو رہا تھا۔ مگر تم سب کو میری ضرورت کیوں پڑ گئی۔؟“  
 ”وہ۔ ایک جگہ لڑکی دیکھتے جانا تھا۔“ رفو خالہ مسکرا کر بولیں  
 ”تو جانیے۔“

”اور لڑکا بھی تو دکھانا ہے۔“ نازی نے آنکھیں پچاتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا مطلب۔؟ کہیں بات بچی کر لی ہے۔؟“ عاطف ایک دم گھبرا گیا۔ وہ تو  
 کل سے لالہ کے پینے دیکھ رہا تھا۔!  
 ”نہیں۔ بات تو ابھی نہیں پکی ہوئی۔“ بڑھیا آگے آتے ہوئے بولی  
 عاطف نے اطمینان کا سانس لیا۔

”ویسے لڑکی والے چاہتے ہیں کہ لڑکا بھی خوبصورت ہو۔ اس لیے پہلے وہ  
 لڑکا دیکھیں گے۔ انہیں پسند آگیا تو پھر لڑکی دکھائیں گے۔“  
 ”یہ کیا بات ہوئی۔؟“ عاطف سہما سا گیا۔ ”مرد کا حسن کب کسی نے  
 دیکھا ہے۔!!“

”کیا ان لوگوں کو لڑکے کا خاندان، تعلیم اور ملازمت وغیرہ پسند نہیں۔؟“  
 ”سب کچھ بے حد پسند ہے۔ لیکن بچہ۔ بالکل وصورت کی بھی تو بات ہوتی  
 ہے۔ ان لوگوں نے بہویں بھی خوبصورت ڈھونڈی ہیں اور داماد بھی خوبصورت  
 چاہتے ہیں۔“

”تو پھر انہیں پرستان کا راستہ دکھاؤ اور کہو سبز پری سے گلہام چھین لائیں۔ میں  
 اپنا رشتہ ایسے لوگوں میں نہیں کراؤں گا۔ جہاں صرف شکل صورت ہی دیکھی جاتی  
 ہے اور خاندانی نجات اور قابلیت کی کوئی قدر ہی نہیں۔“  
 ”ہائے ہائے بچہ! ایسی بات نہیں کرتے۔“  
 عاطف کو اس بڑھیا پر غصہ آگیا۔ جلدی سے بڑھ کر رفو خالہ کے کان میں  
 پوچھنے لگا۔

”خالہ! یہ پچھا کتنی آپ نے کہاں سے حاصل کر لی۔ اور اسکی شانزدل کیا ہے؟“  
 رفو خالہ پہلے تو مسکرائیں پھر اسے سرگوشی میں بتایا کہ وہ رشتے کرانے والی عورت تھی۔  
 اس لیے رقیہ خاتم نے عاطف کے رشتے کے لیے اس کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔  
 ”بھائی جان! اس کا بہت سارے گھروں میں آنا جانا ہے۔“ سیمیں قریب  
 آکر بولی۔ ”اس نے تو ہمیں بے شمار لڑکیاں دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔“  
 ”ہوں۔! تو یہ بات ہے۔“ عاطف نے سنجیدگی سے کہا۔  
 ”ذرا بچ کر رہنا۔ ایسی عورتیں دھوکے کرنا بھی خوب جانتی ہیں۔ کوئی گنجی کافی  
 بھابی تمہارے پتے ڈال دے گی۔“

”نہیں۔ یہ ایسی نہیں۔ بہت ڈھیر ساری قسمیں کھاتی ہے کہ اس نے بھڑٹ  
 کبھی نہیں بولا۔“  
 ”تو پھر جاؤ اس کے ساتھ اور گھر گھر پھرو۔ مگر مجھے ان خرافات میں نہ ہی گھیٹو  
 تو بہتر ہے۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔ بھائی کو ساتھ لیجانے کیلئے پھر مائلینا۔ یا میں کسی ن  
 ان لوگوں کو نہیں لے آؤں اگر۔۔۔“ عاطف کو لیت دھل کرتے دیکھ کر وہ بڑھیا بولی۔

”اسے میں کوئی اور لڑکی دکھا دیتی ہوں۔ اور بہت ہیں۔“ پھر وہ میرا دل

کی سی شان سے سپر سپر جوتیاں گھسیٹتی ہوئی آگے آگے چل پڑی۔

”جلو آؤ بچو۔! آؤ۔ وقت ضائع نہ کرو۔“

سیمیں، نازی اور رفوخالہ اس کے پیچھے لپکیں۔

”یہ انہیں کیا سُبھی۔؟“ عاطف اپنے آپ سے ہی بڑبڑایا۔ ”پلیس بھی بڑا کریں گی اور وقت بھی۔!“

پھر مسکرایا اور سر کو جھٹکا دے کر گاڑی میں جا بیٹھا۔

”ہم تو چلیں اپنی ہم پر۔ اربیا اللہ! میری ہم کو کامیاب بنا دینا۔“ دل ہی دل میں بڑے طلوع سے دعائیں مانگتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

کالچ پنچا تو بڑا پھانگ بند تھا مگر چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ اٹکا دکا لڑکیاں آجا رہی تھیں۔ اس نے گاڑی ذرا پیچھے لے جا کر ایک طرف کھڑی کر دی۔ ایسی جگہ جہاں سے ہر آتی جاتی لڑکی کو بچوئی دیکھ سکے۔

کچھ دیر ٹو سیٹ پر ہی بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور گنگنا تارا۔ پھر اس کام سے گتا کر گاڑی سے باہر نکل آیا اور ٹہل ٹہل کر آنے جانے والوں کو دیکھنے لگا۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھڑی بھی دیکھ لیتا۔ اسے یہاں آئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ انتظار کے دو گھنٹے۔! جس کا ایک ایک لمحہ مہ و سال کے برابر ہو کر گزرتا ہے۔ وہی دو گھنٹے۔! مگر ابھی تک نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا تھا۔ بیشمار لڑکیاں نکل کر جا چکی تھیں۔

جانے لالہ آج کالچ آئی تھی یا نہیں۔؟ وہ ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اس کا انتظار کیے جا رہا تھا۔ پاگل پن ہی تو تھا اس کا۔!

مایوس ہوتے ہوئے وہ واپس گاڑی میں جا بیٹھا۔ دل برابر سا ہورہا تھا۔

لالہ مل جاتی تو اچھا ہی تھا۔ دل میں حسرت تو نہ رہ جاتی۔!!

یہی کچھ سوچتے ہوئے آخری بار نگاہ پھانگ پر ڈالی اور گاڑی کو سٹارٹ کر دیا۔

”اے کاش! دل میں یہ خیال آیا ہی نہ ہوتا۔ اے کاش۔!!“

گاڑی نے ابھی رفتار نہیں پکڑی تھی۔ جاتے جاتے بڑی ہی مایوسی سے ایک بار پھر پھانگ کی طرف دیکھا۔

”ارے لالہ کی بچی! کہیں ابھی جاؤ۔“ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

”تمہیں کیا پتہ کہ کوئی کس بے تابی سے تمہارا انتظار کرتا رہا ہے۔“

اور پھر ایک دم ہی سٹارٹ اس کے ہونٹوں پر کھج گئی۔ جیسے تاریکی میں اجلے کی کرن پھوٹ نکلی تھی۔!!

چھوٹے دروازے سے لالہ کا سر نمودار ہوا۔ عاطف نے جلدی سے گاڑی کو بریک لگائے۔ مگر۔ پھر پریشانی اور مایوسی۔!!

لالہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور تھیں۔ تینوں اسی سمت چل پڑیں جدھر اس کی گاڑی تھی۔ عاطف بوکھلایا۔ لالہ کو کس طرح مخاطب کرے۔؟

کہیں وہ بُرا نہ مان جائے۔! اس کے ساتھ والی لڑکیاں کیا کہیں گی۔؟ کیا سوچیں گی؟ اس کی بھی تو عزت کا معاملہ تھا۔ جوان اور کنواری لڑکی کی۔! اور جانے اب

ایکدم کیا ہو گیا تھا۔ اس کی عزت اپنی سے بھی مقدم محسوس ہونے لگی تھی۔ مگر وہ یہ موقع کھونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ امی، سیمیں اور

رفوخالہ اس کا رشتہ جلد از جلد طے کرنے کے درپے تھیں۔ دھڑا دھڑ لڑکیاں دیکھی جا رہی تھیں۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی لڑکی منتخب کر لیں عاطف لالہ کو لے

— ”اپ کو تمہیں سے بلایا ہے۔!“ اس نے براہ راست لالہ کو مخاطب کیا۔

”کیوں —؟ خیر تو ہے۔“ لالہ گھبرا کر بولی۔

”بس لیے ہی۔ طبیعت کچھ خراب تھی۔“

”اوہ۔!“ لالہ پریشان سی ہو کر دوسری دونوں کی جانب دیکھنے لگی۔

”کل تو اچھی بھلی تھی۔!“ دوسری دونوں میں سے ایک بولی۔

”کل —؟“

”ہاں کل — تم نہیں آئی تھیں لالہ! — ساتھ اس کی حاملہ زاد بہنیں بھی تھیں۔

سارا دن کالج میں خوب شور مچاتے رکھا۔ ایک منٹ کے لیے پڑھا نہیں۔ بس نہیں لے کر گھومتی پھرتی ہی رہی۔“ وہ لڑکی شاید بڑی ہی باتونی تھی۔ عاطف کو اس کی

طویل بات پر الجھن سی ہونے لگی۔

”مگر طبیعت خراب ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔؟“ قدرے الجھ کر بولا۔

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ سارا دن گھومتی رہی تھی شاید اسی لیے طبیعت خراب

ہو گئی ہو۔!“ ذہی پھر بولی۔

لالہ کچھ کہہ ہی نہیں رہی تھی۔ اور اسے لالہ کی ہاں یا نہ کا انتظار تھا۔

”پھر —؟ چل رہی ہیں۔؟“ عاطف نے امید ویم کے لہجے میں پوچھا۔

”جلد کوئی جواب دیں۔ مجھے اپنے بھی کچھ کام کرنا ہیں۔“

”تم روجی! چلو گی۔؟“ لالہ نے اسی باتونی لڑکی سے پوچھا۔

”ضرور چلتی لیکن آج گھر میں کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ امی نے جلد لٹنے کی

تاکید کی تھی۔ وہ تو شاید آج کالج ہی نہ آنے دیتیں مگر میں پریکٹیکل کی وجہ سے آگئی۔

اور یہ صبحی تو ہے ہی میرا دم چھلّا۔!“ وہ خواہ مخواہ ہی ہنسنے لگی۔

نجانے کیوں یہ بات اس کے دل میں ٹیٹھ گئی تھی کہ جو بھی لڑکی انہوں نے منو کی وہ لالہ سے بہتر کسی صورت میں نہ ہوگی۔ بلکہ بہتر تو کیا۔ اس کے مقابلے کی نہ ہوگی۔ دل کی بات تھی۔! جو اسے بھا گیا۔ بس بھا گیا۔ بے شک مقابلے میں کوئی جنت سے حور آجاتی۔ یہ دل کے معاملے ہوتے ہی انوکھے ہیں۔! یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ وہ تینوں بالکل اس کے قریب آگئیں۔ عاطف جلد سے گاڑی سے باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ نگاہ لالہ پر ہی ٹپٹی تھی۔!

ان میں سے ایک نے اسے یوں لالہ کو گھورتے دیکھا تو جلد ہی سے لالہ کے ٹھوکا دیا اور ساتھ ہی کان میں کچھ کہا۔ اس کے متوجہ کرنے پر لالہ نے جھجکا ہوا سر اٹھا کر عاطف کی جانب دیکھا۔

”اوہ! آپ۔!“ بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا

وہ تھوڑے ہی فاصلے پر تھیں۔ عاطف نے اس کے الفاظ سن لیے۔ کچھ حوصلہ بڑھا۔

”کون ہے۔؟ کون ہے۔؟“ دوسری دونوں وہیں رک کر اس سے پوچھ رہی تھیں۔

”سیمیں کا بھائی۔!“

”ذہی جو کیپٹن ہے۔؟“ ان میں سے ایک نے پوچھا

”ہاں۔“

دوسری دونوں عاطف کو غور سے دیکھنے لگیں اور لالہ کے کانوں میں کچھ کھسپھر کرنے لگیں۔ عاطف دو قدم بڑھ کر ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔

عاطف دل ہی دل میں ہی ہی کر کے اس کی ہنسی کی نقل اتارنے لگا۔  
اس وقت کتنا بور کر رہی تھی اپنی طویل طویل گفتگو سے۔! اور اس کے پاس وقت  
بہت کم تھا۔ کچھ وقت کی کمی اور کچھ معلوم کرنے کی بے چینی۔!! بُری طرح جھجھا  
ہوا تھا۔

"یعنی تم نہیں جاؤ گی۔ اور میں۔؟" لالہ کچھ سوچنے لگی۔  
"دیکھ لالہ کی بچی۔! "عاطف، دل ہی دل میں بولا۔ "کبھی قسم کی بے اعتمادی  
کا اظہار کر کے میرے دل کو ٹھیس نہ پہنچانا۔ میں پہلے ہی بہت غصے میں ہوں۔  
تمہارا اور اپنا دونوں کا سر پھوڑ ڈالوں گا۔"  
"بہر حال۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔ جلنے کیا بات ہے۔؟ یقیناً کوئی بخیر  
معاہدہ ہی ہو گا۔" لالہ جیسے اپنے آپ سے ہی بولی۔ پھر عاطف سے پریشانی  
بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔ "کیا بہت زیادہ بیمار ہے۔؟"  
"نہیں۔ اتنی زیادہ بھی نہیں۔ ویسے ہے ہی۔! "عاطف کچھ تذبذب میں  
پڑ گیا۔ کیا کہے۔؟ اگر کہتا ہے زیادہ بیمار نہیں۔ تو کہیں وہ جانا چاہتا ضروری نہ  
سمجھتے ہوئے انکار کر دے۔!

"اچھی بات۔ میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گی۔"  
"خوش کر دیا لالہ تم نے تو اس وقت۔ جیتی رہو۔" عاطف کا دل بے اختیار  
پکڑا اٹھا۔ ابھی جو اعصاب پر جھنجھلاہٹ سوار تھی یکایک ہی رفع ہو گئی۔ بڑی  
خوشگوار اور دلآویز سی مسکراہٹ ہوٹوں پر پھیلی اور جلدی سے بڑھ کر اس نے کار کا پچھلا  
دروازہ کھول دیا۔

"روحی! صبحی!! آؤ راتے میں ہی تمہارا گھر پڑتا ہے۔ تم وہاں آ جانا۔"

"لیکن۔۔۔" روحی نے ہچکچا کر عاطف کی جانب دیکھا۔

"ہاں بابی! کیا حرج ہے۔" صبحی جلدی سے بولی۔

"پہلے ہی اتنی دیر ہو چکی ہے۔ پیدل گھر جائیں گی تو اور زیادہ ہو جائے گی۔  
اور پھر ایسا نہ ہو جہاں ہم سے پہلے پہنچ جائیں۔ پھر ہم ان ٹیوں میں کیے ان کے  
سامنے جائیں گی۔"

صبحی نے بہن کی اجازت کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ بڑبڑاتے ہوئے جلدی سے  
گاڑی میں بیٹھ گئی۔  
لالہ اور روحی بھی اس کی بے تکلفی پر ہنستے ہوئے اور کھسر پھسر کرتے ہوئے  
بیٹھ گئیں۔

عاطف نے گاڑی گھر کی بہت موڑ تو دی مگر سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔؟  
لالہ کو گھر لیجا نہیں سکتا تھا۔ سیمیں، نامزی اور رفو خالہ تو اس کے سامنے ہی کہیں  
گئی تھیں اور اس نے لالہ کے آگے سیمیں کی طبیعت کی خرابی کا جھوٹ بولا تھا۔ ویسے  
بھی گھر جلنے سے وہ مقصد پورا نہیں ہوتا تھا جو دل میں لے کر چلا تھا۔ وہاں تو  
اس سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

اور یہ دو مصیبتیں جو روحی اور صبحی کی شکل میں گلے پڑ گئی تھیں۔ انہیں ان کے  
گھر پہنچانے کے لیے اپنے ہی گھر کا راستہ لینا تھا۔ عجب سی دبدبائیں پڑا ہوا تھا۔  
اور وہ ٹیوں مسلسل باتیں کیے جا رہی تھیں۔

اس جھجکت روحی کی آواز سب سے تیز تھی۔ عاطف کو اس پر غصہ آنے لگا۔  
اسے جس پریشانی میں ڈال دیا تھا اس کا احساس ہی نہ تھا۔ اور زبان قہقہی کی سی تیزی  
سے کمر کرتا ان کے کمرے کے دروازے پر۔

بحال موڈ پر پھر جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی۔

”بس بس! روکیے — روکیے — ارے! ہمارا گھر تو پیچھے ہی رہ گیا۔“

صبحی چلائی —

”ارے واقعی —! ہم تو کافی آگے نکل آئیں —“ رومی بھی چونکی —

”تو مصیبتو! پہلے کیوں نہ ہوش آیا، یہیں — میرا وقت بھی خرابے کر رہی ہو۔“

عاطف دل ہی دل میں بڑبڑایا —

”زیادہ باتیں کرنا اسی لیے برا ہوتا ہے نا — اور یہ عورت ذات اپنی اسی عادت

کی وجہ سے تو رتی نہیں کر سکتی۔“

اس نے گاڑی کو بریک لگائے — دونوں وہیں اتر گئیں — اور گاڑی سے نکلے

لٹکتے بھی انہوں نے دو تین منٹ لگا دیے —

”میری طرف سے سیمیں کا حال ضرور پوچھنا — میں اسے دیکھنے جاتی گر ہمارا

کی جبوری کا بتا دینا۔ اور کہنا کہ جلدی جلدی ابھی ہو کر کالج آئے — اس کے بانی

بڑی لمبے رونق رہتی ہے۔“

چٹپٹی پھر چل رہی تھی — عاطف نے جانے کی جلدی کا اظہار کرنے کے لیے

گاڑی کا انجن سٹارٹ کر دیا — مگر وہ پھر بھی کھڑکی میں سرگھسیڑ گھسیڑ کر پڑتی گئی۔

”اور ہاں — تم اب سیدھی گھر ہی جانا — یہ کیپٹن خاصا بانگ ہے۔ اور تم بھی...

جانے وہ اور کیا کیا کھڑ پھیر کرتی لالہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے پرے دھکا

دیا اور گھبراہٹ میں عاطف سے مخاطب ہوئی —

”جلدی چلیے — سیمیں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“

لالہ کا اشارہ پاتے ہی عاطف نے گاڑی چلا دی — اور جب گاڑی نے

رفتار بڑھی تو اسے احساس ہوا کہ وہ گھر کے بالکل قریب تھا۔ اتنا — کہ اسی سڑک پر دروازے نظر آنے والا وہ موڑ مڑتا تو صرف دو فلائنگ کے فاصلے پر آگیا تھا۔

اب کیا کرے —؟

اور پھر چند لمحوں میں ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ اُسے کیا کرنا تھا — وہ موڑ آیا تو

گاڑی کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور مڑنے کی بجائے سیدھا نکلا چلا گیا —

پہلے تو ایک آدھ منٹ لالہ بھی خاموش رہی — شاید اسے علم ہی نہیں ہوا

تھا — عاطف عقب نما آئینے میں سے اُسے دیکھ رہا تھا — پھر وہ ایک لمبے چونکی۔

کھڑکی میں سے باہر جھانکا — پھر سے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے —

جانے کیوں عاطف کو بے اختیار ہنسی آگئی —

”بھولی لڑکی! تمہیں پتہ ہی نہیں چلا اور ہم تمہیں لے آئے —“ دل ہی دل میں بولا۔

”یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ میرا خیال ہے گھر پیچھے رہ گیا ہے۔“ لالہ

گھبرا گھبرا کر اور ہکا بھکا کر بولی —

”ہاں —“ عاطف نے مختصر سا جواب دیا —

”تو — تو پھر —؟“ لالہ کے ادا سان خطا ہو گئے مگر اس نے اظہار نہیں

ہونے دیا۔ بڑے حوصلہ سے بولی —

”سیمیں انتظار کر رہی ہوگی۔“

”کرنے دو —“ عاطف نے لا پرواہی سے کہا —

”کیا مطلب —؟“ عاطف کے اس انداز نے اسے سرا سیمہ کر دیا۔

موٹر کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا — اسی تیز رفتاری سے نامعلوم جگہ کی

ہست جا رہی تھی — عاطف مسلسل اسے آئینے میں سے دیکھ رہا تھا اور اس کی جگہ

۱۳۳  
پراسے خواہ مخواہ ہی ہنسی آئے جارہی تھی۔ مگر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دبائے کی کوشش کر رہا تھا۔

جب عاطف نے گاڑی بھگاتے لیے جانے کا کوئی جواز پیش نہ کیا تو لالہ کی گھبراہٹ بڑھی۔ گلاب بھی اس نے گھبراہٹ کا اظہار نہ ہونے دیا۔ بڑے ضبط سے اسی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

"پلیز! گاڑی روکیے۔"

"یہاں گاڑی رکوا کر کیا کردگی؟"

"اپنا سر پٹیوں کی۔" عاطف کی بے نیازی پر غصہ سے لالہ کا خون کھول گیا۔

"تو یہیں بیٹھے بیٹھے سیٹ لو۔" عاطف مسکایا۔

"مجھے آپ سے ایسی توقع نہیں تھی۔" لالہ پھرانی ہوئی آوازیں بولی۔ اب

اس کا ضبط و تحمل جواب دینے لگا۔

عاطف کو اس پر ترس آگیا۔

"سنو لالہ! اصل بات یہ ہے کہ سیمیں بیمار دیکار کوئی نہیں۔ وہ تو میں نے ٹم تمہیں اپنے ساتھ لانے کے لیے ہمانہ بنایا تھا۔"

"وہ کیوں؟" لالہ کے چہرے کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔

وہ اب ایک سنان مقام پر تھے۔ دونوں اکیلے۔ ایک جوان مرد کے

ساتھ وہ بے بس لڑکی۔!

گھبراہٹ۔! پریشانی۔!

لالہ نے جلدی سے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ جیسے چشم زدن پر

کھول کر باہر کو دپٹے گی۔ جہاں کے خنجر کی ہر دانت کیسے بے خبر۔!

عاطف کی نگاہ انہی پر تھی۔ جلدی سے بولا۔

"گھبراؤ نہیں۔ آرام سے میری بات سنو۔" ساتھ ہی اس نے گاڑی سڑک

کے ایک کنارے پر کھڑی کر دی۔

"آپ نے ایسی غلط قسم کی حرکت کیوں کی؟" لالہ کا سارا وجود لرز رہا تھا۔

"مجھے کرنا پڑی لالہ۔! ضرورت ہی ایسی آن پڑی تھی۔" عاطف نے دیہں

سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کی جانب رخ پھیر لیا۔

"سیمیں کی طبیعت کی خرابی کا ہمانہ بھی صرف ان دو لڑکیوں کی وجہ سے بنایا تھا۔

ورنہ نہ سچ بول کر ہی تمہیں اپنے ساتھ لانا تھا۔"

"مجھے؟ کیوں آخر؟" وہ ابھی تک خوف زدہ تھی۔

"تم سے مجھے ایک بے حد ضروری بات کرنا تھی۔"

"مجھ سے؟ اور آپ نے؟" لالہ بوکھلا سی گئی۔

اس کی تو کبھی بھی عاطف سے ایسی بے تکلفی نہ تھی۔ اور نہ صرف بے تکلفی بلکہ

دونوں نے تو براہ راست کبھی ایک دوسرے سے بات بھی نہ کی تھی۔

کوئی بھی تو دونوں کا آپس میں تعلق نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ اس کی عزیز ترین

بھیلی کا بھائی تھا اور اکثر ان کے گھر جاتے رہنے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو جلتے

پہچاننے لگے تھے۔

جب کبھی سب پلنگ پر گئے۔ کوئی کھیل وغیرہ کھیلا۔ بیت بازی کی محفل جمی تو

شریک تو وہ ہوتی رہی تھی مگر۔ صرف سیمیں کے تعلق سے۔ عاطف سے اُسے کوئی

واسطہ نہ تھا۔

اور عاطف نے اس سے کوئی ضروری بات کرنا تھی۔ بے حد اچنبھے کی بات ہی

فنی چہرے اور چٹھی چٹھی آنکھوں سے لالہ عاطف کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی ہریت اتنی عجیب ہو رہی تھی کہ عاطف کو اب اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ ایک دم ہی پریشان ہو گیا۔ "لالہ! کیا ہو گیا تمہیں؟" عاطف نے اس کے لرزتے ہاتھ کو تھام کر بڑی تسلی بھرے انداز میں نرمی سے کہا۔

"مجھ پر بھروسہ رکھو۔ ایک شریفانہ رد کی شرافت پر اعتبار کرو۔ اور حوصلے اور اطمینان سے میری ایک بات سنو۔"

عاطف کی آنکھوں میں خلوص اور اپنائیت کی انوکھی سی چمک تھی۔ لالہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔ بہت دھیرے سے اس نے عاطف کے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ نکال کر استغناء سے نگاہ سے اسے دیکھا۔

"وہ بات سننے سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا میرے متعلق کیا خیال ہے؟"

"کیا مطلب؟" لالہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"میں نہیں کیا لگتا ہوں؟"

"مجھے آپ کی اس بات کی سمجھ نہیں آئی۔ آخر آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟"

"پاگل لڑکی! یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے کیسا سمجھتی ہو؟"

عاطف جھنجھلا سا گیا۔ خاصی کوڑھ منظر لڑکی سے پالا پڑ گیا تھا۔

"اچھا۔ یا بُرا۔؟ کیا ہوں تمہاری نگاہ میں۔؟؟"

"میرے اچھا یا بُرا سمجھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہر انسان ٹھیک ہی ہوتا ہے۔"

ابھی تک اسے عاطف کے اس سوال کے ٹھیک کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ ایسے گول مول جواب دینا۔

"وہ تو درست ہے کہ ہر انسان ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ مگر ہر ٹھیک انسان کی بھی

دوسرے انسانوں کی نگاہوں میں مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک ہی انسان کسی کو اچھا لگتا ہے اور کسی کو نہیں۔" عاطف نے بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"یہ بتاؤ کہ میں تمہاری نظر میں کیسا ہوں۔؟"

"اچھے ہی ہیں۔" لالہ نے سادگی سے کہا۔ ویسے بھی وہ اس کی سہیلی کا بھائی تھا۔ اور کیا کہتی۔؟

"مگر یہ بتائیے کہ آپ یوں دھوکے سے مجھے اس سنان جگہ یہ پوچھنے کے لیے کیوں لائے ہیں۔؟" آخر بہت کر کے لالہ نے پوچھ ہی لیا۔

"یہ بھی بتانا ہوں۔ ذرا صبر سے کام لو۔" عاطف خود بھی بیٹایا ہوا سا تھا۔

موزوں الفاظ ہی نہیں لی رہے تھے ایسی بات کرنے کے لیے۔ کچھ لالہ سے بھی ڈر رہا تھا کہ جانے کیا جواب دے دے۔ کہیں تھپڑ ہی نہ جڑ دے۔

مگر خیر نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اسے قسمت تو آزمانا ہی تھی۔ پھر قدرے توقف بعد

سورج سوچ کر بہت سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"اگر تمہاری نگاہ میں اچھا ہوں تو کہتا۔ میرا مطلب ہے اتنا اچھا ہوں۔"

کہ تم مجھے اپنا شریک زندگی بنا لو۔؟

لالہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا البتہ بہت بُری طرح چونکے ہوئے عاطف کی جانب دیکھا۔ جیسے اس نے کوئی بالکل ہی انہونی سی بات کر دی تھی۔ ایسی۔

کہ جس کی اسے قطعی توقع نہیں تھی۔

"چند دنوں تک میں امریکہ کو رس پر جا رہا ہوں۔" عاطف نے یہ سب کچھ واضح خودیٰ مناسب سمجھا۔

"اور امی چاہتی ہیں کہ جانے سے پہلے میں شادی کر لوں۔"

لالہ کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ کانپتے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑے جا رہی تھی۔  
 "امی، روفو خالہ اور سیمیں، نازی وغیرہ سب میرے لیے کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کر رہی ہیں۔ صاف ظاہر ہے یہ خالصتاً میری زندگی کا معاملہ ہے اور جس کی بڑی زندگی کا مسئلہ ہو وہ کس طرح نہ سوچے گا۔؟" عاطف کے لبوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ رقص کر اٹھی۔

"چنانچہ میں نے بھی سوچا۔ اور میری سوچ نے میری شریک زندگی کے لیے جو مناسب ترین لڑکی میرے سامنے لا کر کھڑی کی۔ وہ تمہیں تھیں۔"

عاطف نے آہستہ سے لالہ کا جھکا ہوا چہرہ اونچا کیا۔

بے حد سُرخ ہو رہا تھا۔ جانے کس دھڑ سے۔؟ شرم سے یا شاد۔  
 عاطف کی اس جبارت سے اُسے غصہ آ گیا تھا۔؟

"میں تمہیں کسی بات پر مجبور نہیں کروں گا لالہ۔! یہ زندگی بھر کے معاملے ہیں اور ان کی بنیاد زبردستی کی بجائے خوشی پر رکھنی چاہیے۔"

لالہ کی جھکی جھکی پلکیں لرز رہی تھیں اور ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ بالوں کی باریک باریک لٹیس جو اس کی صبح پشیمانی پر بکھری ہوئی تھیں وہیں چمک سی گئی تھیں۔ عاطف بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

لالہ خاموش تھی۔ بالکل خاموش۔! ایک لفظ تک نہیں بولی۔

"میں اپنے متعلق کوئی بلند بانگ دعوے نہیں کروں گا اور نہ ہی تمہیں کوئی باغ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ لاؤں گا۔ یہ کروں گا تمہارے لیے۔ اور وہ کروں گا۔ میں جو کچھ ہوں بس یہی ہوں۔ تمہارے سامنے۔ ایک انسان۔ خوبوں اور خامیوں سے مل کر بنا ہوا ایک

انسان۔! اور تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔ میری خوبیوں کو بھی اور خامیوں کو بھی۔! عاطف بے حد سنجیدہ تھا۔ آنا۔ کہ اس سے پہلے لالہ نے اسے یوں کبھی نہ دیکھا تھا۔ سنجیدہ اور باوقار۔! صاف گواہی دے رہا تھا۔

"میں تمہیں فوری طور پر اس بات کا جواب دینے کے لیے بھی نہیں کہوں گا۔ تمہارا بھی تو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ تمہیں حتیٰ پہنچتا ہے کہ جتنا وقت سوچنے کے لیے چاہو لے سکتی ہو۔" ساتھ ہی شریر سی ہنسی ہنس دیا۔

"مگر آنا بھی نہیں کہ تمہارے جواب کا انتظار کرتے کرتے میں کسی اور کے پلے بانڈ دیا جاؤں۔"

غیر ارادی طور پر اس نے جیب میں سے رومال نکالا اور لالہ کی پیشانی پر سے پھرے موتی چھتے ہوئے بہت دھیرے سے اور بے حد اپنائیت سے بولا۔

"جانے کیا ہو گیا ہے۔؟ ایک دم ہی کچھ ہوا ہے لالہ۔! تم میرے بہت ہی قریب آ گئی ہو۔ اتنی۔ کہ اب کسی اور کے پلے بندھنے کے لیے دل نہیں مانتا۔ اور یہ زندگی بھر کا سنگم تو دل کی خوشی سے ہی ہونا چاہیے۔"

لالہ کا چہرہ پھر جھک گیا تھا۔ عاطف نے دوبارہ اونچا کیا۔

"میری طرف دیکھو۔!"

لالہ نے لرزتی پلکیں اٹھائیں۔

"تم کچھ نہیں بولو گی۔؟"

"جی۔ جی۔" لالہ ہلکا کر رہ گئی۔

"ٹھیک ہے۔ اس وقت میں تمہیں کچھ کہنے پر مجبور بھی نہیں کروں گا۔"

عاطف اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔



یوں۔؟ کوئی پوری ہے کیا۔؟ یا کوئی سادہ بات ہے۔؟ یہ نہیں

شرع شریعت کا حکم ہے۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔“ لالہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی

”ہاں ہاں کہو۔ لیکن کیا۔۔۔؟“

”مجھے شرم آئے گی۔“ لالہ کا دبا دبا سا حیا آلود لہجہ عاطف کو وارفتہ کر گیا۔

جلدی سے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ لالہ نے فوراً شرم سے سرخ

ہوتے ہوئے پہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپایا۔

”پگلی!“ عاطف بڑے پیار سے بڑبڑایا

”فل، پرسوں، اترا سوں۔ جس دن کہیں دیں پہنچ جاؤں۔ جہاں سے

آج تمہیں لایا ہوں۔ اگر تمہارے ساتھ کوئی اور لڑکی نہ ہو گی تو پھر سیمیں کو

دوبارہ پیار کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔“

عاطف کی اس بات پر لالہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”پھر ہم اطمینان سے اپنی جگہ پر آکر بات کر لیں گے۔ سن رہی ہو لالہ

کی بچی۔! کہ بالکل ہی بھری ہو۔؟“

جواب میں وہ تو ”ہوں۔ ہاں“ کہ نہیں کر رہی تھی۔ عاطف جھنجھلا گیا۔ اور اسکا

جھنجھلاہٹ پر لالہ کو منہ ہی آگئی۔ وہ جلدی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”کہاں اتار دوں تمہیں۔؟ کیا واپس کالج جاؤ گی۔؟“

”جی نہیں۔ سیمیں کو دیکھنے۔“

”اررر۔۔۔ نہیں۔“ عاطف پٹپٹا گیا۔ ”ایسا غضب نہ کرنا۔“

”مگر روجی جو کل مجھ سے سیمیں کا حال پوچھے گی۔“

”وہ تم کہہ دینا ٹھیک ہے۔“

”اور اگر اس نے خود سیمیں سے پوچھ لیا۔۔۔“

”سیمیں ابھی کچھ دن اور کالج نہیں جائے گی۔ وہ آجکل بہت مصروف ہے۔

اور جب تک جائے گی کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو چکا ہوگا۔ پھر میں اسے خود ہی سب کچھ

بتا دوں گا۔“

”خدا کے لیے یہ نہ بتائیے گا۔“ لالہ یکایک گھبرا اٹھی۔

”یہ کیا۔۔۔؟“

”کہیں آپ کے ساتھ یہاں آئی تھی۔“

عاطف کی پریشانی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ آج کی رات تو اس کی بالکل ہی

جاگ رہی تھی اور سگریٹ پیونک پیونک کر کٹی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی وہ چلاک

نہیں جھپک سکا تھا۔

لالہ نے بھی توجہ ہی کر دی تھی۔ اسے کوئی جواب تو دیتی۔ ہاں میں نہیں

دے سکتی تھی تو نہ کی دہر ہی بتا دیتی۔ وہ اسے کچھ تو کہتا۔! کچھ تو سمجھاتا۔!!

اگر اسے عاطف کی چاہت پر اعتماد نہیں تھا تو وہ اسے کسی نہ کسی طرح اپنے جذبات

سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا۔ اپنے سینے میں مچلنے والے ان طوفانوں کے متعلق

بتاؤں جانے یکایک ہی کہاں سے دل میں آسمانے تھے۔

ان آرزوؤں کی کہانیاں کتابچن کی جان انجانے میں ہی لالہ بن گئی تھی۔ ان

تمناؤں کا ذکر کرتا جو صرف لالہ کے لیے مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں — پھر تنہا —

اسے کچھ رحم آجاتا — وہ اس کے متعلق کچھ سوچتی —

مگر — لالہ تو ایک دم ہی کہیں غائب ہو گئی تھی — متواتر چار دن کئی گھنٹے اس نے کالج کے باہر لالہ کے انتظار میں گزارے تھے مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی —

اور عاطف تھا کہ اب نہ کرنی اور سوچ تھی نہ خیال — بس ارد گرد — دماغ میں — ہوش میں حواس میں — جہاں کہیں تھی — لالہ ہی لالہ تھی — ادھر ماں، بہنیں اور خالہ اس کے جذبات سے بے خبر دھڑا دھڑا اس لڑکیاں دیکھ رہی تھیں — ایک ایک دن میں کئی کئی گھروں کے چکر لگ رہے تھے رشتہ کرانے والی پھا پھا کٹتی قسم کی عورت، اب ایک کی بجائے تین ہو چکی تھیں جتنے کا جتنے صبح نکلتا اور شام کو گھر واپس آتا — بے شمار گھروں کے دروازے چکی تھیں —

یہ تو اتفاق ہی کی بات تھی یا شاید عاطف کی خوش بختی کہ ابھی تک سیمیں، نا کی پسند کسی ایک پر متفق نہیں ہو سکی تھی — اور اسی کا عاطف کو دھڑکا لگا ہو روز شام کو دھڑکتے دل سے ہر گھر میں داخل ہوتا رہا تھا کہ کہیں وہ کوئی لڑکی نہ کر بیٹھی ہوں —

دل اندر ہی اندر دعائیں مانگتا رہتا — جانے خدا کو کیا منظور تھا ابھی تک دعائیں پوری ہی ہو رہی تھیں مگر — کب تک — ؟ وہ جو اتنے جوش و خروش سے اس کے لیے دلھن ڈھونڈنے میں مصروف تھیں — کچھ نہ کچھ انہوں نے کہ ہی چھوڑنا تھا — !!

۱۴۱ اور وہ بھی آخر تک اس آس و پاس کے بھنور میں چکر لگاتا رہتا — اسی پریشانی کی وجہ سے اسے لالہ پر غصہ آنے لگا —

اتنی شرافت سے اس نے اس سے شادی کی درخواست کی تھی — لالہ کو کچھ جواب دینا چاہیے تھا — اچھی خاصی پڑھی لکھی اور معقول لڑکی تھی — اسے اس سے اس قسم کی بد اخلاقی کی توقع نہیں تھی — چاروں — جو چار صدیاں ہو کر گزری تھیں — کیسے اس نے اسے امید و ہم کی سولی پر لٹکائے رکھا تھا — !!

اور اب تو عاطف کے صبر و ضبط کی انتہا ہو گئی تھی — اور اسی انتہا نے عاطف کو لالہ کی طرف سے مایوس کر دیا — اور مایوسی کے بعد اس کا جو رد عمل ہوا وہ خود اپنی ذات پر غصہ تھا — شدید غصہ — !!

کیوں لالہ سے اتنی امیدیں وابستہ کر لی تھیں — کہ پوری نہ ہونے پر پریشان ہوا تھا — کیوں اسے یوں اپنی آرزو بنالیا تھا کہ اب اس کی تکمیل نہ ہوئی تو دل و دماغ غم سے چیخ اٹھے تھے —

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کی ہر رنگینی بے رنگ ہو کر رہ گئی تھی — کوئی خواہش، کوئی تمنا، کوئی آرزو باقی نہیں تھی — پھر — ؟ پھر کس کی شادی — ؟ کیسی شادی — ؟؟

اسی غصے، مایوسی اور پریشانی کے عالم میں اس نے دل سے فیصلہ کر لیا کہ وہ شادی کسے گا ہی نہیں —

اور پھر اپنا یہ فیصلہ ماں تک پہنچانے کے لیے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا رقیہ بیگم کے کمرے میں چلا گیا — وہ وہاں موجود نہیں تھیں — رفو خالہ بھی نہیں تھیں ورنہ ان کے ذریعے ہی ماں تک بات پہنچا دیتا —

ابنیں ہر کرے میں ڈھونڈا۔ اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ما  
اور خالہ کے علاوہ سبیں، نازی اور جبین وغیرہ کو بھی ان کے کمرے میں غیر موجود پا  
راہداری میں سے گزر کر ندیم اور انظر کے کمرے میں ان سب کے غائب ہ  
کی وجہ معلوم کرنے کے لیے جانے لگا تو گول کمرے سے باتوں کی آواز آئی۔ جلد  
دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

صاحقہ اپنی سیلی اور سیلی کی دو سیلیوں کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے مصروف  
گفتگو تھی۔ اسی اور فوالہ کے متعلق استفسار پر اسے معلوم ہوا کہ وہ دونوں  
نازی اور جبین کے ساتھ کہیں گئی تھیں۔

”پانچوں کی پانچوں۔“؟“ عاظمہ متحیر سا ہو گیا۔

”لاں بھائی جان۔“!“ صاحقہ عجلت سے بولی۔

”کل آپ سر شام ہی دروازہ بند کر کے سو گئے آپ کو کیا پتہ یہاں کیا ہو گیا۔“  
”کیا ہو گیا۔“؟“ عاظمہ ایک دم غم جاناں بھول غم دوراں میں اچھڑ  
جانے کیا بات تھی۔؟ خدا کرے گھر والے سب خیریت سے ہوں۔ ابابٹ

سے دورے پر تھے۔ خدا نہ کرے ان کی کوئی ایسی ویسی خبر نہ آگئی ہو۔

لمحہ بھر میں ہی ہزاروں حادثات نے سر اٹھا کر دیے۔

”صاحقہ! بتاؤ بھی کیا ہو گیا۔“؟“ قدرے توقف بعد پھر انتہائی پڑ

بھری پے ڈراری سے بولا۔

”کل سبیں آپنی اور نازی آپنی اور جبین آپ کے لیے ایک لڑکی دیکھ کر آئی ہیں  
کہتی تھیں ایسی پیاری لڑکی دنیا میں کوئی نہیں ہوگی۔“ صاحقہ کے چہرے پر سر  
پھول رہی تھی۔

”اُردب آج صبح صبح اسی اور خالہ امی کو ساتھ لے گئی ہیں کہ جلد از جلد بات پکی  
ہو جائے۔ اور بھائی جان آپ صبح بھی شاید دیر تک سوتے رہے ہیں۔ خالہ امی  
جاتے جاتے کہہ گئی ہیں کہ آپ آج کہیں نہ جائیں۔“

پھر صاحقہ کے چہرے پر شونہ بھری مسکراہٹ پائی۔

”وہ اسی گھنٹے دو گھنٹے تک واپس آجائیں گی اور پھر کل یا پرسوں آپ کی منگنی ہو  
جائے گی اور ایک ہفتے بعد شادی۔“ آجی! ہمارے بھائی جان کی شادی ہوگی  
ہماری ایک پیاری سی بھائی آئے گی۔“

صاحقہ بڑی تیزی سے سانس لیے بنا بولے چلی جا رہی تھی۔ عاظمہ غم سم  
لا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں پر صاحقہ نے کوئی توجہ نہیں دی۔  
”پھر ہم ڈھولک بجائیں گے۔ گوٹے والے کپڑے پہنیں گے۔ حمیرا، زرقا  
درمعدیہ! تم سب بھی آؤ گی نا۔“؟

جانے اس کی سیلیوں نے کیا جواب دیا۔ عاظمہ تو سکتے کے سے عالم  
بل باہر نکل آیا۔

یہ کیسی پریشانی تھی۔! اور کیسی الجھن۔!!

”اوہ لالہ کی بچی! یہ تم نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔“

سوچ سوچ کر تھک گیا۔ کوئی حل سمجھ میں نہ آیا تو جھنجھلاتے ہوئے ہاتھوں  
ل سر تھام لیا۔

مال بہنوں کو پہلے خود ہی اجازت دے چکا تھا۔ اب اگر وہ اس کی بات کہیں  
لا آئیں تو پھر وہاں انگار کرنا انتہائی نازیبا اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت تھی۔  
اور دل تھا کہ لالہ کے علاوہ کسی اور کے تصور کو جگہ ہی نہیں دے رہا تھا۔

پوری کی پوری ہستی میں وہ یوں پھیل گئی تھی کہ اب جیسے میں سمجھ رہی تھی —  
 بڑی مشکل آن پڑی تھی — دماغ سوچ سوچ کر بالکل ہوا جا رہا تھا — جوں جوں  
 وقت گزر رہا تھا وحشت بڑھتی جا رہی تھی —

جی اتنا گھبرایا کہ کمرے میں گھٹن کا سا احساس ہونے لگا۔ اٹھ کر جلد جلد لباس  
 تبدیل کیا — جو کچھ ہاتھ لگا پہن لیا — پتھون اور رنگ کی کوٹ دوسرے  
 رنگ کا — فیض نہ جانے دھلی ہوئی تھی یا استعمال شدہ — کرسی کی پشت پر  
 پھیلی پڑی تھی — وہی اٹھالی تھی —

اس وقت تو اس کا مقصد صرف شب خوابی کا لباس اتارنے کا تھا — بس اور  
 کچھ بھی نہیں — سامنے کوئی منزل تو تھی نہیں جو خاص اہتمام کرتا — نہ شیوہ کی  
 نہ منہ دھویا — سگریٹوں کی ڈبیا جیب میں ٹھونسے اور گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا —  
 جی چاہ رہا تھا — دور — کہیں دور نکل جاتے — اتنی دور کہ  
 پہاڑوں میں کھو جائے اور پھر — نہ صرف کسی اور کو بلکہ خود اسے بے  
 اپنا نشان نہ ملے —

اور پھر وہ اندھا دھند گاڑی چگانے لگا۔ نگاہیں سڑک پر پھسل ضرور رہی تھیں  
 مگر ذہن دماغ اتنے غیر حاضر تھے کہ یہ معلوم ہی نہیں تھا وہ کہاں جا رہا تھا —؟  
 دماغ اپنی دوسری ہی سوچوں میں جنونی سا ہور رہا تھا — اور یہ جنون اسے  
 کی بے پرواہی نے عطا کیا تھا — جوں جوں وہ پہنچ سے باہر ہوتی محسوس ہو رہی تھی  
 دل اور جذبات اس کے قریب چلنے کو پھیل رہے تھے —

کیسا عجیب قسم کا طوفان سینے میں بپا تھا — اور کیسی بے بسی تھی کہ اس  
 پاس ان چلتے طوفانوں کی روک تھام کے لیے کچھ بھی نہ تھا — نہ لالہ کے انس اور

کی مضبوط چٹائیں اور نہ کوئی امید کے بند —

وہ ان طوفانوں میں تنکے کی طرح بہنے لگا — جانے کب تک سڑکوں پر  
 گاڑی بھگاتا رہا — اسے کچھ معلوم نہیں تھا — اور پھر آپ ہی آپ گاڑی کو بریک  
 لگ گئے — لگاتے تو خود اس کے اپنے ہی ہاتھوں نے تھے مگر ادا نہیں —  
 گاڑی رکی تو عاطف نے چونک کر ارد گرد دیکھا —

”ادہ میرے خدا —“ مدٹھال سا ہوتے ہوئے اس نے اپنا سر بازو میں  
 لے کر سیڑنگ پر ٹیک دیا —

وہ آج بھی ویسے تھا جہاں پچھلے چار دن سے لالہ کی طلب اسے کئی کئی گھنٹے  
 منتظر اور بے قرار کھڑا رکھتی تھی —

جانے کتنی دیر وہ بیٹھا رہا — اسے وقت کا کوئی احساس نہیں تھا —  
 ٹانے پر ہاتھ کے ہلکے سے لمس نے اسے چونکا دیا —

سر اٹھا کر دیکھا — مگر نگاہ میں جیسے بیانی نہیں تھی — خالی خالی نظروں سے  
 گھورتا ہی رہا —

”درا دروازہ کھول دیجئے —“ دھیمی سی، مانوس سی لرزتی آواز نے اسے  
 ہوش و حواس کی دنیا میں لا کھڑا کیا — ایک دم آنکھوں کی بصارت لوٹ آئی —

لالہ سر جھکائے کھڑی دوپٹے کے پلو کو بل ویسے جا رہی تھی — بغل میں کتابیں  
 تھیں — عاطف نے جلدی سے بازو بڑھا کر گاڑی کا اگلا دروازہ کھول دیا —

ان گزرے ہوئے چند دنوں نے ذہنی طور پر لالہ کو اس کے اتنا قریب کیا  
 تھا کہ عاطف یہ بھول ہی گیا کہ ان دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ایسا کوئی رشتہ  
 نہ تھا جو وہ اس کے ساتھ والی میٹ پر بیٹھتی — اس کے اتنا قریب —!

اتنی سخت سزا آخر تم نے مجھے کس خطا کے بدلے میں دی —؟ پچھلے چار بعد ۱۳۹  
میرے جس طرح گزرے ہیں تمہیں اگر ایک لمحہ بھی اس عالم میں گزارنا پڑتا تو پتہ پڑ  
جاتا —

غصے سے بڑبڑاتا ہوا خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا —

”جی چاہتا ہے تمہیں یہیں کسی کھڑی پھینک دوں — قصہ تو ختم ہو —!!“  
کچھ بھی جواب لے کر آئی تھی لیکن اس وقت وہ نظر کے سامنے تو تھی — بقیاری  
کو کچھ قرار مل گیا تھا — فوراً سگریٹوں کا خیال آیا — جیب سے پکیٹ نکالا  
اور دزدیدہ نگاہی سے اُسے دیکھتے ہوئے سگریٹ سلگانے لگا۔

اوپر تلے تین چار کش لے ڈالے — کچھ ہوش و حواس بیدار ہوئے —  
”آخر تم غائب کہاں ہو گئی تھیں —؟“

وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی — عاطف نے اس کا سر ہلایا — کوئی جواب نہ ملا۔  
”یہ اچھی زبردستی ہے — پوری اور سینہ زوری — ایک تو مجھے اتنا پریشان  
کیا اور پھر اوپر سے اب منہ بھلا کر بیٹھ گئی ہو —“  
”اہستہ آہستہ عاطف کا غصہ دھیمّا پڑتا جا رہا تھا —  
”کچھ تو بولو — کچھ تو کہو —“

لالہ پھر بھی اسی طرح چپ چاپ گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی —  
”عجیب مصیبت ہے — تم لڑکی محم اور مصیبت زیادہ ہو — ہر طرح  
تنگ ہی کرتی ہو —“

عاطف کی جھنجھلاہٹ میں پیار کا عنصر غالب تھا — آگے بڑھ کر زبردستی  
اس کا چہرہ گھٹنوں سے نکالا —

لالہ بھی جانے کس موڈ میں تھی — چپکے سے آکر بیٹھ گئی — نہ اس نے کچھ کہا  
نہ عاطف نے کچھ پوچھا — گاڑی سٹارٹ کی اور کسی نامعلوم منزل کی سمت چل پڑا۔  
اس دن کی طرح آج بھی وہ مقام سنان پڑا تھا — عاطف نے گاڑی  
روک لی — سڑک کی دونوں جانب سبز سے اُٹی اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں اور کئی  
کتنی فٹ گہری کھدیں —  
عاطف خود گاڑی سے نکللا اور جا کر لالہ کی طرف والا دروازہ کھولی دیا —  
وہ قدرے ہچکچائی —

لالہ نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا — کوئی تھوڑا نہ تھا — چار دن — چار  
ہزار ساں — انتظار کے — آس اور باس کے — اور لالہ کی بے پرواہی کا  
نتیجہ دشت و جنوں ہی نکلتا تھا —!

اس کی ہچکچاہٹ پر عاطف کو بے طرح طیش آگیا — نہ کچھ سوچا نہ سمجھا  
بازو سے پکڑتے ہوئے اسے گاڑی سے باہر کھینچ لیا — پھر دھڑام سے دروازہ  
بند کیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے سڑک سے دُور ہٹا لے گیا —  
”وہ چیختی رہی — چلاتی رہی — ساتھ ساتھ گھسیٹتی رہی — عاطف نے ایک  
نہ سنی — اور نہ ہی اسے چھوڑا — اسی طرح کھینچے لے گیا —

اور پھر جب اندازہ ہو گیا کہ وہ نہ صرف کبھی کبھار سڑک پر سے گزرنے والا  
رکاوٹوں سے اوجھل ہو چکے تھے بلکہ آواز بھی دہان تک نہیں پہنچ سکتی تھی تو ایک  
اُسے پتہ چل گیا —

”بدتمیزی اور بداخلاقی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے — ایک شریف مردنا  
نزاکت سے تیرے ساتھ کیا کر دیتا اس کی حق — کوئی گناہ نہیں کر بیٹھا تو

"ارے۔! یکایک گھبرا اٹھا۔ لالہ کی آنکھیں بُری طرح سوجی ہوئی تھیں  
 "کیا ہوا۔؟" پریشان ہو کر اس کے چہرے کو گھورنے لگا۔  
 "کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" لالہ نے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپنا چاہا۔ عاطف  
 نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔  
 "یہ اتنی پیاری شکل کا کیا ستیاناس کر لیا ہے۔؟"  
 لالہ نے جھینپتے ہوئے، شرماتے ہوئے اپنا چہرہ اس کی نگاہوں کی زد  
 سے ہٹانے کی پھر کوشش کی۔

"آخر کچھ معلوم بھی تو ہو۔" عاطف نے جھٹک کر اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے  
 اس کا رخ اپنی جانب پھیر لیا اور پھر مہر دی بھرے لہجے میں پوچھنے لگا۔  
 "سچ سچ بتاؤ۔ کتنا روتی ہو اور کیوں روتی ہو۔؟" لالہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔  
 عاطف کو زبان سے کوئی جواب دینے کی بجائے لالہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔  
 اس کے رخساروں پر پھیلتے آنسو جیسے عاطف کو اپنے ساتھ بہا لے گئے۔ بے اختیار  
 ہوتے ہوئے اس نے لالہ کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا۔

"تمہارے دُکھ میں اپنی جان پر لوں گا لالہ۔! تمہیں آخر مجھ پر اعتبار کیوں  
 نہیں۔؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔ کیا کسی نے کچھ کہا ہے۔؟"  
 عاطف اس کے بال سہلاتے ہوئے بہت مدھم مدھم اور پیار بھرے نو

ملائم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"کاش! تم یہ جان سکو لالہ۔! کہ میرے دل میں تمہارا کیا مقام ہے  
 یہ اتنے دن تم غائب رہیں تو کچھ نہ پوچھو مجھ پر کیا کیا گزر گئی۔ اپنے غم، اپنی پرہز  
 محض۔! میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

لالہ کے آنسوؤں سے اس کا سینہ بھی بھگنے لگا۔

"بس۔! اب بس کر دو۔ بہت ہو چکی۔"

عاطف نے اس کا چہرہ اونچا کیا اور رومال سے اس کے بھیکے رخسار خشک  
 کرنے لگا۔ "اب بتاؤ۔ کیا بات ہے۔؟"  
 "کچھ نہیں۔"

"پھر جھوٹ۔؟"

"نہیں سچی! کوئی بات نہیں۔"

"پھر یہ تم نے اپنا حال کیا بنایا ہوا ہے۔؟"

"ایسے ہی۔ دو تین راتیں ٹنید نہیں آئی۔"

"بس۔؟"

"ہاں۔"

"قسم کھا کر کہتی ہو۔؟"

"میں نے جھوٹ کبھی نہیں بولا۔"

"تو پھر اتنے دن غائب کیوں رہیں۔؟"

"سوچتی رہی تھی۔"

"کیا۔؟"

"وہی۔ جو آپ نے کہا تھا۔"

عاطف کو بے اختیار مٹھنی آگئی۔ لالہ نے شرمناک چہرہ گھٹنوں میں چھپا

لیا۔ بالکل ہی دیوانی تھی۔!

”پھر۔؟ اتنی لمبی چوڑی سوچ کا کیا نتیجہ نکلا۔؟“ عاطف نے  
مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔!“

”کیا مطلب۔؟“

”میں اکیلی کیا نتیجہ نکالتی۔ امی سے بات کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اور کوئی  
گھریں ہے نہیں۔“ اس نے اسی طرح چہرہ چھپائے چھپائے کہا۔  
”کس سے مشورہ کرتی۔؟“

”میں کس لیے ہوں۔؟“

”آپ۔؟“ لالہ نے گھبرا کر عاطف کی جانب دیکھا۔

”ہاں ہاں۔ مجھ سے مشورہ کر لو۔ سب سے زیادہ تمہارا اپنا تو میں ہی  
ہوں۔“ عاطف نے بڑی اپنائیت اور پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”نہیں ہوں۔؟“

بار حیا سے لالہ کی پلکیں جھکی جا رہی تھیں اور رخسار دھک رہے تھے۔

”بتاؤ۔؟“ عاطف نے اس کے ہاتھ جھٹکے۔

”بلیسی۔۔۔“

”پھر مجھ سے پوچھو۔ جو کسی اور سے پوچھنا چاہتی ہو۔ ایمان سے بڑے

خصوص سے رائے دوں گا۔“

”آپ جو رائے دیں گے وہ مجھے معلوم ہے۔“ جھکی جھکی رنگا ہوں اور جھکے جھکے

چہرے سے بولی۔

”معلوم ہے تو نہیں پھر ٹھیک ہے۔ پھر سوچ کا ہے۔!“ عاطف ہلکی

سے بولا۔

”لاؤ مجھے اپنے گھر کا پتہ بتاؤ۔ میں سمیں اور امی کو کل ہی۔“

”مگر۔“ لالہ لیکالیک ٹپٹا گئی۔ ”مگر میں اپنی امی کر کے چھوڑ سکی کہ بات

”ہر لڑکی کو کبھی نہ کبھی اپنی ماں سے جدا ہونا ہی پڑتا ہے لالہ۔!“

”لیکن میں۔۔۔ میں۔۔۔ نہیں تیں۔ میں اپنی امی کو نہیں چھوڑ سکتی۔“

لالہ کے لمبے میں کرب تھا۔

”پہلے ہر لڑکی ہی سوچتی ہے۔“

”مگر میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میری امی۔ اود خدا۔!“ لالہ بڑی لمبی

سی تھی۔ عاطف نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

پھر قدرے توقف بعد بولا۔

”مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیا میں تمہیں پسند ہوں۔؟“

”ہاں۔“ بغیر کسی بناوٹ یا تصنع کے لالہ انتہائی سادگی سے بولی۔

”اور اسی بات نے مجھے پریشان کیا ہوا ہے۔ میں نے ان دنوں میں ہر طرح

آپ کے خیال کو دل و دماغ سے محو کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں کامیاب نہیں

ہو سکی۔ میں ساری ساری رات جاگی ہوں۔ سارا سارا دن پریشان رہی ہوں

میں کیا کروں۔؟ میں کیا کروں۔؟“

لالہ نے عاطف کا ہاتھ اپنے نرم نرم ہاتھوں میں تھام لیا۔

”مجھے بتائیے میں کیا کروں۔؟“

لالہ کے اس حسین اعتراف نے عاطف کی زندگی میں جیسے کوئی نئی تازہ دُرج

پھونک دی تھی۔ سارا چہرہ خوشیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مزاج کی زندہ دلی اور

”پھر۔۔۔؟“ — بس چپکے سے مجھ سے شادی کرلو۔“

سکراٹ کوٹہ۔۔۔! گرمیری امی۔ آپ کو میں کیسے بتاؤں کہ میں انہیں اکیلا نہیں  
خچوڑ سکتی۔“ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔

”نہ انہیں چھوڑ سکتی ہوں اور نہ۔۔۔ اور نہ۔“ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ ہاتھوں  
میں تھاما عاطف کا ہاتھ آنکھوں سے لگایا اور ایک بار پھر آنکھوں میں سادان بھادو  
بسا لیے۔“ اور نہ آپ کو۔۔۔“

عاطف اس کی الجھن اور پریشانی کی وجہ یہی سمجھ پائے اُس سے اسے بعد  
لگاؤ تھا۔ اور وہ اس سے کسی صورت بھی جدا ہونا نہ چاہتی تھی۔

”سنو لالہ! تم پریشان نہ ہو۔“ عاطف نے بڑے پیار اور تسلی جیسے

انداز سے اس کا سر تھپتھپایا۔

”اگر تمہیں اپنی امی سے اتنی ہی محبت ہے تو ہم انہیں اپنے پاس رکھ  
لیں گے۔ میری امی بھی تو ہمیشہ میرے پاس رہیں گی۔ اتنا ہی حق تم پر تھاری  
ماں کا ہے جتنا مجھ پر میری ماں کا۔“

”مگر میں ان کی لڑکی ہوں۔“

”لڑکی لڑکے میں کیا فرق ہے۔ ساری اولاد ایک جیسی ہوتی ہے۔ اب  
اگر تمہاری امی کا کوئی لڑکا نہیں تو تمہیں ہی ان کا سہارا بننا چاہیے۔ اور پھر۔“  
عاطف کے دماغ میں کوئی نئی سوچ ابھری۔ اور پھر کسی اندرونی جذبے کے تحت  
بے اختیار آنکھیں چپک اٹھیں۔

”تمہارے تعلق سے میں کیا، ان کا بیٹا نہیں ہوں گا۔؟ تم فکر نہ کرو میں ان کا

داماد نہیں بنائوں گا۔ بالکل سکا بیٹا۔۔۔!“

”لیکن۔۔۔“ لالہ نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ عاطف نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی بات  
قطع کر دی۔

”اب تم ایسی ویسی باتیں سوچ سوچ کر خواہ مخواہ پریشان ہونے کی کوشش نہ کرو۔  
میرے قول و فعل کبھی مختلف نہیں ہوئے لالہ۔! اور میرے خلوص کی شہادت  
آنے والا وقت دے گا۔“ اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس کے  
کان میں بہت پیار بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

”تمہیں میری ہی قسم ہے اگر تم نے ایک لمحے کیلئے بھی کچھ اور سوچا۔“

”لیکن میری امی۔۔۔۔۔“

”بس۔! کہا جو کہ اس معاملے کے متعلق مزید ایک لفظ نہیں کہا جائے گا۔  
تمہاری پریشانی اور کشمکش کی وجہ میری سمجھ میں آگئی ہے۔ تم اب بالکل کوئی فکر  
نہ کرو۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ انشاء اللہ تمہاری مرضی اور عین خواہش  
کے مطابق سب کچھ ہوگا۔“

جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ عاطف نے سننا ہی نہیں۔ اٹھ کر کھڑا  
ہو گیا۔ ساتھ ہی لالہ کا ہاتھ تھام کر اسے بھی اٹھالیا۔

”چلو آؤ گھر چلیں۔ تمہارے کالج کا وقت ختم ہوئے دیر ہو گئی۔ اور  
نہاری امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ دیے بھی ایک جوان لڑکی کو شام سے  
پلے اپنے گھر میں ہونا چاہیئے۔“

عاطف کے ان پاکیزہ خیالات کو لالہ نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ دل اور



بھی اس کا گردیدہ ہو گیا۔

دونوں ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ عاطف دیہیں ٹھہر گیا۔

”کیا بات ہے۔؟“ لالہ نے سٹپا کر پوچھا۔ وہ بڑے غور سے اس کے

چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”اب تمہیں تین چار دن لمبی تان کر خوب ڈھیر سارا سونا ہے۔ سمجھیں۔؟“

پھر انگلی سے اس کی آنکھوں کو چھوتے ہوئے بولا۔

”یہ سوچی ہوئی آنکھیں کوئی بہت حسین منظر پیش نہیں کرتیں۔“

کچھ اتنے پیارے شرارت بھرے انداز میں اس نے کہا تھا کہ لالہ بے اختیار

ہنس پڑی۔

”شکر ہے کچھ چہرے پر رونق تو آئی۔!“ عاطف نے اس کے سر کو

ہلکے سے ہلایا۔

”معلوم ہوتا ہے کھوپڑی اندر سے بالکل خالی ہے۔ لگتا ہے کافی مشکل

گوارا ہو گا۔“

”میرا خیال ہے ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے جو کچھ سوچا تھا وہ ٹھیک رہا۔“

”کیا۔؟“

”یہی کہ مجھے کسی کھڈ میں پھینک دیں۔“

”اگر اسی طرح تنگ کرتی رہیں تو ایک نہ ایک دن پھینک ہی دوں گا۔“

”خاتم چیز ہوں۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہو گیا ہے۔“ لالہ مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دبا کر

سے بولی۔ ”ابھی اتنی زور سے مجھے پٹختا تھا۔“

”اوہ۔!“ عاطف یکایک گڑبڑا گیا۔ لالہ کے گرد اپنے مضبوط بازو کا

حصار کر کے اسے اپنے پہلو سے لپٹاتے ہوئے دھیرے سے پوچھنے لگا۔

”کیا بہت چوٹ لگی۔؟“ پھر زحمت بھرے لہجے میں بولا۔

”مجھے معاف کر دو۔ میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا ہرگز نہیں تھا۔“

لالہ مسکراتی رہی اور عاطف کہتا رہا۔

”دراصل اس وقت مجھے بڑا غصہ آ رہا تھا۔ نجانے کس کس پر۔؟ تم ہاتھ

نہ آتیں تو شاید میں اپنے ساتھ ہی یہ سلوک کر بیٹھتا۔“

”اپنے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کر سکتا۔“ لالہ شوخی سے بولی۔

”اور اگر میں سچ میخ کر کے دکھا دوں تو۔؟“ عاطف پلک کر ایک کھڈ

کے دہانے پر جا کھڑا ہوا۔

”تمہاری خاطر لا رہیں سب کچھ قربان کر سکتا ہوں یہ جان تو کوئی چیز نہیں۔“

عاطف کے چہرے پر ایسی خوفناک سی سنجیدگی تھی کہ لالہ پریشان ہوتے

سب اختیار بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ ”میں بھی ساتھ ہی جاؤں گی۔“

اور لالہ کی یہ حرکت بالکل غیر ارادی تھی۔ عاطف کا ردال ردال مسکرا اٹھا۔

”پاگل۔!“ اسے ساتھ لے کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

”تم مل گئی ہو مجھے۔ اب تو کبھی بھی ایسی حرکت نہ کروں۔ اب تو اگر

ذمیاں بھی بلائے گا تو کبھی نہیں جاؤں گا۔“

”توبہ توبہ! کیسی کفر کی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ میاں کے بلاوے پر بھلا کوئی

کار کر سکتا ہے۔؟“

”وہ تو نہیں کر سکتا۔ مگر اپنے خدا سے لاڈ تو کر سکتا ہوں۔“

دونوں یونہی بچوں ایسی باتیں کرتے کرتے گاڑی تک جا پہنچے۔  
مجھے اپنے گھر کا پتہ تو یاد دو۔۔۔؟“ عاطف نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے  
”کیا کرنا ہے۔۔۔؟“

”کچھ بھی کرنا ہو۔ تمہیں اس سے کیا۔۔۔؟“

”مگر۔۔۔“ لالہ کچھ ہچکچاتی۔

”پھر مگر اگر۔۔۔“ عاطف جھنجھلا اٹھا۔ ”کیسی عجیب کوڑھ مغز قہ۔“

”کی لڑکی ہو تم۔“

”مجھے امی سے ڈر لگتا ہے۔“

”دیوانی۔!“ عاطف نے سر جھٹکا۔

”آخر جو ان ہو۔ تمہاری امی نے تمہیں گھر تو نہیں بٹھائے رکھا۔“

”لیکن دیکھیے تا وہ دراصل۔۔۔۔۔“

جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی عاطف نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

”تمہاری یہ خیل و جھٹ کی عادت بڑی خراب ہے لالہ۔! اے تمہیں

پڑے گا۔۔۔“

”اور آپ کو بھی اپنی یہ عادت بدلنا پڑے گی کہ اپنی ہی کہے جاتے ہیں!

کی بات کبھی سنتے ہی نہیں۔“

”کسی اور کا معاملہ ہو گا تو سن لیا کروں گا۔ مگر تمہیں تو میں دوسرا ہوں

نہیں۔ میں بولوں یا تم۔ ایک ہی بات ہے۔“

عاطف کی بات سے لالہ جھینپ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

”لالہ۔!“ تھوڑی دیر بعد عاطف نے اسے بڑے نرم لہجے میں

”جی۔۔۔“

”ادھر میری طرف دیکھو۔“

لالہ نے رخ اس کی سمت پھیرا مگر اس کی پلکیں دفور حیا سے رخاؤں پر

جھکی رہیں۔

”میں کہہ رہا ہوں ادھر میری طرف دیکھو۔“

عاطف نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اونچا کیا۔

”کل پھر ملو گی۔؟“ لہجے میں التجا تھی۔

”لیکن۔۔۔“ لالہ چپ سی ہو گئی۔ عاطف کا یہ ہلکی انداز ”ہاں“ کہہ دینے

پر مجبور کر رہا تھا مگر اس کے پیش نظر شاید کوئی مصلحت تھی۔ تبھی ہچکچا رہی تھی۔

”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔“ عاطف نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”کہہ دو ہاں۔“ وہ جھپک کر بڑے پیار اور وارفتگی سے اس کی آنکھوں میں

جھانک رہا تھا۔ لالہ کچھ سوچنے لگی۔

”تم میرے معاملات بھی سوچ کر طے کرتی ہو لالہ۔؟“ عاطف نے اسے

کسی سوچ میں کھوئی دیکھا تو گویا برا مانتے ہوئے کہا۔

”کیا میرے لیے تمہارے دل میں ایسے حسین جذبات نہیں ہیں کہ فوراً بلا سوچ

سمجھے میری بات مان لیا کرو۔ بتاؤ۔۔۔؟“

”اسی لیے تو ساتھ چلی آئی تھی۔“

”تو پھر کچھ بھی مت سوچو۔ جو دل کہتا ہے وہی کرو۔“

”مگر کالج کا بہت حرج ہوتا ہے۔“

”کالج کو مار دو گولی۔ جتنا بڑھ چکیں میرے لیے اتنا بہتر ہے۔“

عاطف نے بڑے بے تابی سے کہا —

”بس اب کہہ بھی دو کہ آؤ گی۔“

”آپ نے ابھی خود ہی کہا تھا کہ اکیلی لڑکی کا گھر سے باہر رہنا اچھا نہیں ہوتا۔“

”اکیلی تم کب ہو گی۔ تمہارے ساتھ تمہاری عزت کا محافظ میں جو ہوں۔“

”کیا مجھ پر اعتبار نہیں؟“

”جیسی آپ کی خوشی۔“

”یعنی کہ آؤ گی۔؟“

”ہوں۔“ لالہ نے دے دے سے لہجے میں کہا۔

”جیتی رہو۔ اور دونوں مل کر زندگی کی خوشیاں مناؤ۔“

عاطف مسرور سا ہو کر گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔

”دونوں کون؟“

”تم اور تمہارا دودھا۔!“ اس نے شوخی بھری نظروں سے لالہ کے چہرے کو گھورا۔

اس کے رخساروں پر پھرتا گلابی سارنگ بڑا حسین تھا۔ عاطف نے لڑ

سے کچھ گنگناتے ہوئے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

گاڑی بڑے پھانک سے اندر داخل ہوئی ہی تھی کہ دروازے پر آد

اظفر ہلکا نظر آگیا۔ عاطف نے شرارت سے زور زور سے ہارن دیا۔

اظفر نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ جانے کیا بات تھی۔؟ ایک

میں وہ سیڑھیوں سے اترا اور گاڑی کے عین سامنے بازو پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

”ارے ارے۔!“ عاطف نے گھبرا کر گاڑی کو بریک لگائے۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ۔؟“ اظفر کچھ بے چین سا تھا۔

”کیوں۔؟ تم کیوں پوچھتے ہو۔؟“ عاطف کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں

بکھر رہی تھیں۔

”آپ کو کچھ علم بھی ہے کہ آج ایک جگہ آپ کی بات سنی ہو گئی۔“

”کیا۔؟“ عاطف یکدم سنیاتے ہوئے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول

کر باہر نکل آیا۔

”اتنے دنوں سے آپ کو لالہ کے متعلق کہہ رہا تھا۔ اب معلوم نہیں اس

لڑکی کی طبیعت کیسی ہو گی۔؟ جیسا سنتے ہیں کہ بے حد حسین ہے۔ یقیناً نہک چڑھی

بھی ہو گی۔“ اظفر زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔

”آپ سے کہا بھی تھا کہ امی سے بات کر دیجئے مگر آپ کو تو ایک ہی دھن تھی

کہ پہلے لالہ سے اس کی مرضی معلوم کی جائے اور پھر کوئی بات چلائی جائے۔“

”اور وہ آج ابھی ابھی معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔“ عاطف نے

بڑے بچھے بچھے سے لہجے میں کہا۔

”کیا معلوم ہوا۔؟“ اظفر نے بے تابی سے پوچھا۔

”اب جان کر کیا کر دو گے۔؟“ عاطف کھویا کھویا سا بولا۔

”اگر تو وہ راضی ہے تو پھر تو بہت کچھ کر سکتا ہوں۔“

”نہیں۔ سیمیں اور امی کا دل برا ہو جائے گا۔“

”ایسے ہی دل برا ہو جائے گا۔ وہ جو نہک چڑھی سی حسین لڑکی پسند کر کے

”میں نے ہی تو تجویز پیش کی تھی۔“

”لیکن نکاح تو اس کا میرے ہی ساتھ ہوگا۔“

”یہ میں نے کب کہا کہ میرے ساتھ ہوگا۔“

”کہہ کے تو دیکھو۔“ عاطف نے آنکھیں نکالیں۔

”ہوں۔“ اظفر ایک دم قہقہہ لگا اٹھا۔ ”تو یہاں تک معاملہ پہنچ

بٹا ہے۔“

”کیوں نہ پہنچے۔؟“ عاطف لگن لیا۔ ”ہم بھی سینے میں دل رکھتے ہیں۔“

”تو پھر اب اس دل کے مطالبات پورے کیجئے نا۔“

”کیا مطلب۔“

”یہ جو تیرا معاملہ آن پڑا ہے۔“

”اوہ۔“ عاطف کے چہرے پر پریشانی کے سائے سے لہرا گئے۔

”ایک بات بتاؤں بھائی جان۔؟“

”کیا۔؟“

”آپ ابھی کسی کے ساتھ لالہ کا کوئی ذکر نہ کیجئے گا۔“

”تاکہ بالکل ہی معاملہ چوٹ ہو جائے۔“

”سنیئے تو سہی۔ جب آپ کو ہمیں اوزار نہی اپنی وغیرہ لڑکی کے متعلق کچھ بتائیں

تو زبانی ہو کر اور بڑے اطمینان اور سکون سے سنیئے گا۔ آخر میں صرف اتنا کہہ دیجئے گا

کہ لنگنی سے پہلے لڑکی کی تصویر آپ کو ضرور دکھا دیں۔“

”مگر اس سے کیا ہوگا۔؟“

”آپ آگے دیکھتے جانیئے۔“

۱۶۰ ”آئی ہیں وہ مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔ میں تو بس لالہ کا کوسہی اپنی بھابی بناؤں گا۔“

عاطف کو اظفر کے اس جذبے پر پیار سا آگیا۔ مکرراتے ہوئے بولا۔

”وہ بھی اسی لیے مجھ سے تھلہدی پر راضی ہوئی ہے کہ تم جیسا غیبت دیویر مل جائیگا۔“

”ایمان سے۔“ اظفر دوسرے سے بے قابو ہوتے ہوئے عاطف

سے لپٹ گیا۔

”بہت بہت مبارک ہو۔!“ پھر ذرا پیچھے ہٹ کر عاطف کے چہرے کو

گھورتے ہوئے بولا۔

”میں بھی کہوں یہ آج جناب کے چہرے پر زعفران کے کھیت کیوں لہلہا رہے

ہیں ورنہ پچھلے تین چار دن تو دنیا جہاں کی بد مزاجیاں ڈیرہ ڈالے تھیں۔ کسی سے

بات کرنا بھی گوارا نہ تھی۔“

عاطف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑی دلاؤر سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر

پھیلی رہی۔ اظفر اس کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

”پھر۔؟ بتائیے تو سہی۔ کیسے انہیں منایا۔“

”یہ ہمارا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ تم کیوں پوچھتے ہو۔؟“ عاطف بھی

ترنگ میں آگیا تھا۔ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے ہوئے بولا۔

”اچھا۔ تو یہ بات ہے۔ ابھی سے علیحدگی کی باتیں کرنے لگے۔ دیکھیے بھائی

پہلے ہی یہ فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ لالہ صرف آپ ہی کی نہیں ہوگی۔ میرا بھی اس

بہت حق ہوگا۔“

”کیوں۔؟ بیوی وہ میری ہوگی اور حق تمہارا۔ واہ۔! جادو جادو

نالہ۔“ عاطف اب کھل کر مسکراتا تھا۔

”یار! کہیں مرو نہ ڈالنا۔“

”خیر کیوں کرتے ہیں۔ ایسے معاملات سمجھانا تو اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے

”نہیں بھئی دل کوئی بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔“

”واہ بھئی عورت! مان گیا تیرے جادو کو۔“

عاطف نے جھینپ کر اظفر کو پرے دھکیل دیا۔

”چلو بھاگو کہاں سے۔“

”بھاگوں کہاں۔ آپ ذرا اندر آئیے۔ بڑا مزے کا تماشا ہے۔ نہ

زور دار حج حج نہیں ہو رہی ہے۔“ اظفر نے عاطف کا بازو تھام

”ٹھہر دو۔ گاڑی تو گیراج میں کھڑی کر دوں۔“

”رہتے دیں یہیں۔ شاید مجھے اور ندیم کو کہیں جانا پڑے۔“

”کہاں۔ کیا کوئی پروگرام ہے۔؟“

”ہر بات نہیں پوچھا کرتے بھائی جان۔!“

”واہ رے میرے شیر۔! بہت کچھ سمجھنے لگے ہو اپنے آپ کو۔“

”چلیے آئیے۔“ اظفر اس کا بازو کھینچتے ہوئے اندر لے گیا۔

”آج رقیہ بیگم کے گھرے میں محفل جی تھی۔ اظفر کے کہنے کے صبر مطابق بڑی

زور دار حج حج نہیں ہو رہی تھی۔ ہر ایک کی زبان اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی

رقیہ بیگم اور رفو خاں ایک پلنگ پر ڈھیر سارے کپڑے پھیلائے بیٹھیں تھیں

برہی کے جوڑوں کی کٹر بونٹ کر رہی تھیں۔ سمیں اور نازی ساتھ ساتھ صلا

مشورے دے رہی تھیں۔

دوسرے پلنگ پر جمین، صاعقہ اور ندیم شادی کے دنوں میں جو کوئی پروگرام

پیش کیے جانا تھے ان کے متعلق گفتگو اور صلاح مشورہ کم اور بحث زیادہ کر رہے تھے۔

اظفر کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر ندیم وہیں سے چلا یا۔

”ارے اظفر! تم کہاں چلے گئے تھے۔ ذرا پروگراموں کی تفصیل تو سنو۔“

ڈھولک اور گانے کے علاوہ میں نے ایک پروگرام نایح کا بھی رکھا ہے۔“

”کون ناچے گا۔؟ جمیں۔؟“

”وہ نایح بھجڑوں کا ہوگا۔ تم اور ندیم گھاگرے پن کرنا ہو گے۔“

جمیں تنک کر بولی۔ سمیں اور نازی بے اختیار قہقہہ لگا اٹھیں۔

”ہم تو جب ناچیں گے دیکھا جائے گا۔ تم تو ابھی نایح اٹھیں۔ تمہیں نچانا

کوئی مشکل ہے۔“ اظفر ہنسا۔

”اُمی۔! اُمی۔! خالہ امی۔! یہ دیکھیے اظفر کیا کہو اس کیے جارہا

ہے۔“ جمیں سینے لگی کر کہی کی بات کا بُرا نہیں منائے گا۔“ سمیں نے بیچ بچاؤ

کرانے کی خاطر کہا۔

”ارے! پھر اس کی نگاہ اچانک دروازے کی سمت اٹھ گئی۔ تو خود

بھی ایک دم اٹھ کر بھاگی۔

”بھائی جان! آپ صبح سے کہاں غائب تھے۔؟ ذرا میدان میں تو لیئے۔“

سمیں عاطف کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے درمیان میں لے آئی۔

”مبارک ہو۔! مبارک ہو۔! نازی اور جمیں بیک آواز سر سے سر

دار گانے کے انداز میں بولیں۔ شور مچا تو رقیہ بیگم اور رفو خاں بھی چونک اٹھیں۔

”ارے عاطف! ادھر آؤ ہمارے پاس۔“

”گھبرا نہ نہیں — اور نہ ہی موڈ خراب کرنا ہے۔ اور تصویر اگھٹانا نہ بھولے گا۔“

اظفر نے عاطف سے سرگوشی کی —

”یہ تم ان سے کیا کھسکھس کر رہے ہو —؟“ نازی نے مشکوک انداز میں رونوں کو گھورا — اس کا خیال تھا کہ انہوں نے جو کارنامہ انجام دیا تھا اسی کے متعلق اظفر عاطف کو بتا رہا تھا —

”ہم خود ہی سب کچھ انہیں بتائیں گی۔ تم تو بات کو بگاڑ کر رکھ دیتے ہو اظفر!“

”جب بگڑے گی۔ مزہ تو اس وقت آئے گا۔“ اظفر کی بڑبڑاہٹ سن کر عاطف کے چہرے پر مکر اہٹ بکھر گئی —

”جو کچھ کہنا ہے بلند آوازیں کہو نا —؟“ جبین تلخی سے بولی —

”بلند آوازیں بھی کہوں گا۔ اور ڈنکے کی چوٹ کہوں گا — مگر تم جو ناپے لگ جاتی ہو نا — پھر وہ بڑی خوفناک چیز پیش ہوتی ہے۔ بس اسی سے ڈر آتا ہے۔“

”واہ۔! جبین! اپنی کا کبھی سچ مچ کا ناپج تو دیکھیں — سکول سے کیسا ہے انہوں نے۔“ صاحبہ یوں فخریہ انداز میں بولی جیسے خود اپنا کوئی کارنامہ بیان کر رہی۔

”اچھا۔!“ اظفر کی آنکھیں ایک دم لال انگارہ ہو گئیں —

”تو مختصر پڑھنے کی بجائے ناپج سیکنے سکول جاتی ہیں — گھر واپس چل کر دیکھنا ب کون سکول جاتا ہے۔ ٹانگیں توڑ دوں گا۔“

”تم کون ہوتے ہو میرے معاملات میں دخل دینے والے۔“ جبین ڈراہٹ انداز میں بڑبڑاتی — پھر صاحبہ کی بے ڈھنگی سی لپٹی ٹیل کھینچتے ہوئے انتہائی جھنجھٹے سے بولی —

”کبھی تو سوچ کر بات کیا کرو۔“

”اول اول — مجھے کیا پتہ تھا کہ اظفر بھائی غصے ہوں گے۔ میں تو سمجھی ۱۶۵ تھی خوش ہوں گے۔“

”یہ دھیانوسی فن کی قدر کیا جانے۔!“

”میٹرے میٹرے ہاتھ کر کے بے حیائی سے ناپخانہ تو نہ ہے۔“ اظفر اسی طرح غصے میں بھرا ہوا —

”کبھی اپنے مذہب کا بھی خیال کر لیا کرو۔ کہ کس کس فعل سے ہمارے مذہب نے منع کیا ہے اور کیا کیا چیز جائز کی ہے۔!“

”تمہیں تو جیسے بہت پتہ ہے۔“ جبین تنک کر بولی —

”کم از کم تم سے زیادہ ہی جانتا ہوں گا۔“

”بھئی ختم کرو اب یہ بحث۔!“ بیبیں نے انہیں ٹوکا —

”آئیے بھائی جان! آپ کو بڑی مزیدار باتیں سنائیں — اپنی پیاری پیاری بھابی کی۔“

”آؤ ندیم! تم میرے ساتھ آؤ۔ ایک بڑا ضروری کام ہے۔“

اظفر کھا جانے والی لنگا ہوں سے جبین کو دیکھتے ہوئے اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں نجانے کیا کیا کچھ بڑبڑاتے ہوئے ندیم سے مخاطب ہوا —

”کہاں —؟“

”تم آؤ تو سہی۔“

اور اسے ساتھ لیے زور زور سے پاؤں پٹختا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسے اپنے مضبوط بازوؤں سے اٹھا کر پرے پھینک دوں گا۔“  
ساتھ ہی بازوؤں کی مچھلیوں کو پرکھنے کے بعد کچھ اٹھا کر پھینکنے کا اشارہ کیا۔  
پھر ایک کش لگایا۔ دھواں نکلا۔

”عاطف بھائی کی مانند نہیں کروں گا کہ دن دن بھر دوستوں کے ساتھ سیر پڑے  
اور تفریحات میں وقت گزار دوں اور شام کو گھر آکر چھوٹے بھائی کے سامنے آؤں  
بھرنے لگ جاؤں کہ اب کیا ہو۔؟ میں تو اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کچھ کرو  
اور پھر چھوٹا بھائی بیچارہ بھاگتا پھرے اور پریشان ہوتا پھرے۔“

پہلے۔ پلے۔ پلے۔ ہارن کی تیز آواز نے اسے ہونکا دیا۔ مگر  
اس بار اسے چھانک تک جانا ہی نہیں پڑا۔ گاڑی تقریباً اس کے اوپر ہی جڑھی  
آ رہی تھی۔ بھاگ کر برآمدے کی سیڑھیوں پر نہ چڑھ جاتا تو آج اس کی زندگی کا  
آخری دن ہوتا تھا۔

”ہائیں ہائیں۔ کیا کر رہے ہیں۔؟ کیا بالکل ہی مار دینے کا ارادہ  
ہے۔؟“

گاڑی کو بریک لگے تو بھاگ کر پاس آگیا۔ عاطف کو باہر نکلنے کا موقع ہی  
نہیں دیا۔ کھڑکی میں سرگھبرا کر بڑی عجلت سے بولا۔

”یہ آجکل آپ دن دن بھر کہاں غائب رہتے لگے ہیں۔؟“  
”کہیں بھی رہوں۔ تم میری غمخیزی کیوں کرتے ہو۔؟“ عاطف کے چہرے  
پر کچھ ایسی خوبصورت سی چمک اور مسکراہٹ تھی کہ انظر چونکے بارہ نہ سکا۔

”سچ سچ بتائیے کہاں سے آرہے ہیں۔؟“  
عاطف نے اسے کوئی جواب دینے بنا کچھ گنگناتے ہوئے انجن بند کر کے چابی نکالی۔

انظر بڑی بے قراری سے برآمدے سے چھانک تک کے درمیانی ریل  
میں ٹپل رہا تھا۔ ذرا کبھی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دیتی تو بھاگ کر چھانک  
باہر سڑک پر جھانکنے لگتا۔ پھر حجب وہ آگے گزر جاتی تو یابوسی سے سر ہلا۔  
ہوئے واپس آکر پھر ٹھہنا شروع کر دیتا۔

مشروب پینے والی ایک ٹنکی انگلیوں میں دبی تھی اور بالکل مگرٹ پینے  
اندا میں اس کے کش لے رہا تھا اور پھر ہونٹوں کو دھواں نکالنے کے انداز میں  
کر کے ہافادہ اسی طرح دھواں بھی نکال رہا تھا۔

چہرہ آنا بنجیدہ تھا کہ بالکل کوئی بڑھا سا فلسفی ہی لگ رہا تھا۔ گاہے بگا  
راکھ جھٹکنے کے لیے جب ٹنکی کو جھٹکتا تو ساتھ بڑبڑانا شروع کر دیتا۔

”یہ آجکل عاطف بھائی تجھانے دن دن بھر کہاں غائب رہتے لگے ہیں  
ادھر معاملہ آنا بنجیدہ ہو گیا ہے اور وہ ہیں کہ کوئی احساس ہی نہیں۔ ویسے؟“

صاحب لالہ آپا کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔“  
پھر لمبا سا کش کھینچتا اور منہ آسمان کی سمت اٹھا کر، آنکھیں میچ کر اور ہر

گول کر کے دھواں نکالتا۔ فارغ ہو کر پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔  
”اگر محبت انسان کو ایسا ہی لاپرواہ بنا دیتی ہے تو میں تو کبھی محبت نہ

اور اگر۔۔۔ بھروسہ محال کسی سے آپ ہی آپ ہو رہی گئی تو اس مرد و شہزادہ  
کی خاطر جان کی بازی لگا دوں گا۔ ہماری محبت کی راہ میں جو چٹان حائل

ایسے ہی ہمسفر کی لاس بھی۔ !!

پھر عاطف نے بڑی عقیدت سے، بڑی محبت سے اور بید غلوص سے اس کے دونوں نرم نرم ہاتھ تھام کر اس سے وفا کا عہد کیا تھا۔ زندگی بھر جدا نہ ہونے کی قسم کھائی تھی۔ !

رہتی ہوئی، کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے نگاہ ہٹانے کو عاطف کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بس چلتا تو آنکھوں میں یوں برساتا کہ جب وہ سامنے نہ ہوتی تو تب بھی اس کے دیدار میں غور رہتا۔ !!

پھر وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے بہت دور دور تک گھومتے رہے تھے۔ اس کی سنگت میں پہاڑیوں پر چڑھنے اترنے کا اتنا لطف آیا کہ عاطف کا جی چلنے لگا یونہی زندگی تمام ہو جائے۔

بہت دیر پیدل گھومنے کے بعد عاطف نے اسے گاڑی کی لمبی سیر کرائی۔ بچوں کی طرح بے انتہا خوش ہوتی رہی۔ ارد گرد کے خوبصورت مناظر نے اسے بہت محفوظ کیا۔

ساتھ ساتھ بہت دھیمے دھیمے انداز میں وہ عاطف کو بتاتی رہی کہ اس کی ماں اور وہ گھر میں ایکی تھیں۔ باپ اور بھائی کی خردمی نے اور بھی بہت ساری محرمیاں اس کے مقدرمیں کر دی تھیں۔

اس کا بچپن بھی گھر کی چار دیواری میں بند رہ کر گزرا اور جوانی بھی۔ کسی کی مضبوط انگلی تھام کر شام کو دور تک سیر کرنے اور چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کرنے اور نئی نئی چیزیں منوانے کی اس کے دل میں ہمیشہ حسرت ہی رہی۔

جوان ہوتی تو بھائی کے بغیر اپنی جوانی کو ہر دم غیر محفوظ ہی جاتا۔ تب بھی

”بھائی جان! میں آپ سے بات کر رہی ہوں؟“

”اور اس بات کا جواب میرے پاس نہ ہو تو کیا دوں۔؟“

”آخر آپ کہیں نہ کہیں تو گئے ہی تھے۔؟“

”ہاں۔ گیتا تھا۔“

”کہاں۔؟“

”دور۔۔۔ افق کے اُس پار۔۔۔!!“

”ارے! آپ تو بڑے رومانٹک ہو رہے ہیں۔ کہیں اپنی لالہ سے مل کر توڑ

آ رہے۔؟“

عاطف مکرانے لگا۔۔۔ آنکھوں میں پچھلے تین چار گھنٹوں کا گورا ہوا ایک ایک لمحہ گھوم گیا۔۔۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔

سفید کرتے اور پاچا جے میں وہ آج کتنی سادہ اور معصوم سی لگ رہی تھی۔ کل کی بسورتی اور سوچی سوچی آنکھوں والی لالہ سے بہت مختلف۔ !

ہونٹوں پر مسکراہٹیں تھیں اور چہرے پر قوس و قزح کے سے خوبصورت رنگا

کے عکس۔! باتیں کرنے کے انداز میں شرم و حیا کا دھبہ دھبہ اٹھ رہا۔! کہی

ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔

عاطف اسے دیکھ کر جھنجھکا سا رہ گیا تھا۔ یہ گلابی گلابی رخساروں والی

پرکشش سی لڑکیا۔۔۔ کس طرح اس کا آئیڈیل بنتی جا رہی تھی۔ وہ قوی اکلڑ

انسان۔! بہت کم اس نے لڑکیوں کے متعلق کسی سوچا تھا۔

اور اب لالہ کو جوں جوں قریب سے دیکھ رہا تھا اسے محسوس ہونے لگا تھا

لالہ دلتوں سے اس کے لاشعور میں کسی تھی۔ جیسے زندگی کی طویل راہوں پر



پہلے کے بعد باقی وقت گھر ہی میں گزار دینا کی نگاہوں سے دور اور ہم کہ کسی مرد کا مضبوط سہارا اس کی حفاظت کو موجود نہیں تھا۔

اور اب عاطف نے اسے ایک نئی زندگی سے روشناس کرایا تھا۔ مرد کا مضبوط بازوؤں کا مضبوط سہارا۔ کتنی بڑی نعمت تھی۔ وہ آزادانہ ان کھلی کھلی فضاؤں میں سانس لے رہی تھی۔ کوئی خوف کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک لمبی مدت قفس میں گزارنے کے بعد کسی پہنچی کو اچانک آزاد فضاؤں چھوڑ دیا جائے تو جو حال اس کا ہر گاہ وہی لالہ کا تھا۔ بات بے بات مسکرا بیٹھ ہو سٹوں پہ بکھر رہی تھیں۔

ہر بات اس نے کتنی صاف دلی سے عاطف کو بتادی تھی۔ اور اس کی صاف گوئی عاطف کو اور بھی اس کا گردیدہ بنا گئی۔ دل میں عہد کیا کہ ہمیشہ کیا اس لڑکی کا محافظ بنے گا۔ اس کی ساری محرومیوں کو ختم کر دے گا۔ اور پھر۔۔۔ دل میں یہ عہد کرنے کے بعد اس نے خدا کے آگے بڑی بااٹنی تھیں کہ وہ اسے اس عہد پر قائم رکھے۔ اس سے کہیں کوئی ایسی حرکت نہ ہو جس سے اس مادہ اور معصوم سی لڑکی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔

”بھائی جان! بھائی جان!!“ اظفر زور سے چیخا۔

”یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔؟“

”کچھ نہیں۔“ عاطف اپنے خیالات سے چونکا۔

”کیا سوچ رہے ہیں۔؟“

”بھئی کہا جو کہ کچھ نہیں۔“

”میں کہہ رہا تھا کہ سیمیں آپنی وغیرہ لڑکی کی تصویر لے آئی ہیں مگر میں نہیں

رہیں۔ کہتی ہیں کہ آپ ہی کو دی جائے گی۔ اور میں بڑی دیر سے یہاں آچکا ہوں۔“ اظفر کر رہا ہوں۔ چل کر ان سے تصویر لیں۔“

”لیکن تصویر لے کر کرو گے کیا۔؟“

”کسی نہ کسی طرح تو اس بات کو اب ٹالنا ہی ہے۔“

”آخر کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو کہ تصویر لے کر تم کس طرح اس معاملے کو ختم کر دو گے؟“

”نہیں وہ تصویر دیکھتے ہی ایک دم چلا اٹھے گا کہ اس لڑکی کو اس نے اپنے کالج کے ایک لڑکے کے ساتھ پھرتے دیکھا ہے۔ اور اگر کسی نے اس بات کا یقین نہ کیا تو اس کی شہادت کے لیے ہم نے ایک لڑکے کو تیار بھی کر لیا ہے۔ اسے لا کر خالہ انی کے سامنے پٹھادیں گے۔ چنانچہ وہ لڑکی کے متعلق کچھ من گھڑت اور کچھ اظفر گھڑت قصے بیان کرے گا۔“

”استغفر اللہ۔! بند کر ویہ بکواس۔!!“ عاطف نے اسے ڈانٹ دیا۔

”آپ خفا کیوں ہو گئے۔؟ آپ ہی کے بھلے کے لیے تو ہم سب کچھ کر رہے ہیں۔“ اظفر سر کو کھیلانے لگا۔

”تو بہ تو بہ! ایسی بامیانہ حرکت۔! کسی شریف اور بے گناہ لڑکی کے متعلق ایسی باتیں پھیلا نا گناہ عظیم ہے۔“

”ہم پھیلا کہاں رہے ہیں۔ صرف گھر میں ہی بات ہوگی۔“

”ہاں۔! صرف گھر میں۔! انکار کرنے کے لیے امی ان رشتہ

کرانے والی عورتوں کو بتائیں گی اور پھر ان کے ذریعے گھر گھر اس کی بدنامی ہوگی۔

میں تو تمہیں ایسا کہیں بھی نہ کرنے دوں۔“

”لیکن بھائی جان۔۔۔۔۔“

”لیکن دیکھ کچھ نہیں اظفر۔! اتنا ذہن میں رکھو کہ ہم بھی بہنوں والے ہیں۔ ہمارے تھی۔“

کل کو ہمارے کسی بہن کے ساتھ اگر کوئی ایسی حرکت کرے تو۔۔۔؟“  
 ”میں اس کا خون پی جاؤں گا۔“ اظفر یکدم لال انگارہ ہوتے ہوئے بڑے غلط گانا گانے سے ٹوک رہا تھا اور پھر اپنے حساب سے درست گا کر بتا رہا تھا۔  
 جوش سے بولا۔

”تو پھر پہلے اپنا بلاؤ۔“ عاطف نے اس کا کان پکڑ کر کھینچا۔  
 ”سمجھ میں آئی میری بات۔۔۔ خردوار! آئندہ کسی بے گناہ کی رسوائی کا

”عاطف بھائی۔!“

”بھائی جان آگے۔“ جبین ڈھولک چھوڑا اسی طرح تنگے پاؤں عاطف کے متعلق سوچنا بھی نہیں۔  
 ”مگر میں یہ سب اپنی خاطر تو نہیں کر رہا۔“  
 ”تو یہ گناہ کبیرے میرے سر چڑھانے والے تھے۔؟“  
 عاطف بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی سمت چل دیا۔

”جبین۔! جبین۔!“ نازی پیچھے سے چلائی۔

”اہیں ادھر ہی بلا لیا۔ خود نہ کچھ بتانے بیٹھ جانا۔“

”بتانے کی کیا۔؟ تصویر تو میرے پاس ہے۔“ یسین مسکرا کر بولی۔

اپنا کام چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں دیہیں جا کر انہیں دکھاتی ہوں۔ آؤ نازی! تم بھی۔“

یسین اور نازی اور ان کے پیچھے پیچھے صاحبہ بھی چلی گئی۔ رقیہ بیگم اور رفیعہ

اپنے کام میں متشکک تھیں۔

ذہیم، صاحبہ کے گانے کی تصحیح گا کر رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور منہ

دل رات لگا رہا تھا۔ پورے دو تھر گانے کے بعد آنکھیں کھولیں۔ ارد گرد دیکھا۔

میدان صاف تھا۔ جلدی سے اٹھ کر وہ بھی ادھر ہی چلا۔ راہ میں ہی اظفر نے

ال کا بازو تھام لیا۔

”تصویر دیکھ کر وہ بات نہ کہنا جو ہم نے سوچی تھی۔“ سرگوشی میں بولا۔

اظفر کچھ دیر کھڑا سر کو کھلاتا رہا اور کچھ سوچتا رہا پھر دھیرے دھیرے تڑپا

رقیہ بیگم کے کمرے میں چلا گیا۔

عاطف اور لالہ کی جوڑی کو اس نے کچھ اتنا ذہن میں بسالیا تھا کہ لالہ

اب دنیا کی کوئی بہترین سے بہترین لڑکی بھی عاطف کے ہاتھوں میں بیٹھی دیکھنا اسے

نہ تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خود ہی صاف صاف خالہ امی سے بات

کر دے گا۔

کمرے میں اسی طرح ادھم مچا تھا۔ زرق برق کپڑے بکھرے تھے۔ آ

تو جبین نے مالی کی بیوی سے کہہ کر کہیں سے ڈھولک بھی منگوائی تھی۔ دھپ

”بھائی جان ناراض ہو رہے ہیں کہ کسی بے گناہ کو بدنام کرنا بہت برا فعل ہے۔“  
 ”ویسے یہ تو ٹھیک ہے۔ خود دل ہی دل میں میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔“  
 ”سوچ رہے تھے۔ تو مجھ سے کیوں نہ کہا۔؟ خواہ مخواہ مجھے جھڑکیاں ڈالیں۔“

”اظفر نے اپنی مذمتِ ندیم پر عجب ڈال کر مٹانا چاہی۔“  
 ”کوئی بات نہیں بڑے بھائی چھوٹوں کو جھڑکیاں دیا ہی کرتے ہیں۔ تم کیوں اتنا پریشان ہو رہے ہو۔“

”ہاں۔ یہ تم نے ٹھیک کہا۔ بڑے چھوٹوں کو اکثر ڈانٹتے رہنے میں ناپايد خوشی محسوس کرتے ہیں۔ خواہ ان سے کوئی شہور سرزد ہو نہ ہو۔“

”ہاں۔“ ”ندیم اظفر سے بھی زیادہ دکھی ہو رہا تھا۔“  
 ”یہ بڑوں کی بڑی ہی خراب عادت ہوتی ہے۔ چھوٹوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ’خورد باش برادر سگ مباش‘۔“

”ارے! سگ باش برادر خورد مباش۔“ اظفر نے ہنس ہنس کر دہرا ہوتے ہوئے اس کی غلطی کی تصحیح کی۔

”یار! اب ہنستے ہی تو نہ جاؤ۔ کبھی کبھار زبان غوطہ کھا ہی جاتی ہے۔“ ندیم کھینا سا ہوتے ہوئے سر کھلانے لگا۔ مگر اظفر پھر بھی ہنستا ہی چلا گیا۔

”خورد باش برادر سگ مباش۔!!“  
 قہقہوں کی بے عذاب آوازوں نے اظفر کی ہنسی کو ریک لگا دیے۔ چونکہ پیچھے دیکھا۔ سمیں، نازی، جبین اور صاحبہ ہنستے ہوئے آگے پیچھے واپس چلا

رہی تھیں۔ اظفر اور ندیم کی طرف انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ یہی رقیہ بیگم ۱۷۵  
 اور رفو خالہ کے پاس بڑھی چلی گئیں۔  
 ”بھائی جان تو ایسے شرمیلے ہیں کہ تصویر دیکھتے ہی نہیں تھے۔“ سمیں ہنس ہنس کر مال اور خالہ کو بتانے لگی۔

”پھر ہم سب نے اُمی! انہیں خوب پھیرا، خوب تنگ کیا۔“  
 ”پھر۔؟“ رفو خالہ جیسے اس کی تمہید سے اگلتے ہوئے بولیں۔

”یہ تو بتاؤ کہ اس نے تصویر دیکھ کر کیا کہا۔؟ کیا اسے پسند آئی۔؟“  
 ”کہاں خالہ۔؟ وہی تو بتا رہی ہوں کہ انہوں نے دیکھی ہی نہیں۔ ہم مینر پر لکھ آئی ہیں۔ میرا خیال ہے اب تنہائی پا کر بیٹھے چوری چوری دیکھ رہے ہونگے۔“

”آج تک کسی لڑکے کو لڑکیوں کی طرح شرتائے میں نے نہیں دیکھا تھا۔“ نازی ملکہ لکھنوی ”خالہ امی! کیا مجال جو بھولے سے بھی تصویر کی طرف نظر اٹھائی ہو۔ حالانکہ ہم انکھوں کے سامنے چٹائی رہیں۔“

”ندیم۔!“ اظفر نے اسے پکارا مگر وہ بولنقوں کی طرح منہ کھولے کھڑا ان سب کی باتیں سن رہا تھا۔ ”او ندیم۔!“ اب اظفر نے اسے زور سے کہنی ماری ”کیا ہے۔؟“

”آؤ ہم بھی دیکھیں۔“  
 ”کیا۔؟“

”تصویر۔“  
 ”پھر۔؟ وہی بات کہوں۔؟“

”اجی۔!“ اب کیا فائدہ۔؟ وہ تو ان سب کے لیے کہنا تھی۔ اور یہ بھی عاطف بھائی نے منع کر دیا ہے۔ اب تو صرف تجس کی خاطر دیکھنی ہے

”کہ جس کی اتنی تعریفیں یہ سب کر رہی ہیں — وہ ہے کیا چیز —؟“

”چلو آؤ —“ ندیم نے بھی دل چسپی کا اظہار کیا —

دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے عاطف کے کمرے میں جا پہنچے — وہ کھڑکی پر کرسی ڈالے چپ چاپ بیٹھا تھا — دروازے کی جانب اس کی پشت تھی —

”میرا خیال ہے بیٹھے تصویر دیکھ رہے ہیں —“ ندیم نے انظر سے سرگوشی

”چپ —!“ انظر نے ہنسنوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرایا —

”آؤ پیچھے جا کر دیکھیں کہ کن کن زادیوں سے دیکھ رہے ہیں اور چہرے کے

”اثرات کیا ہیں — دھیان سے — ذرا آہٹ نہ ہو —“

انظر پنچوں کے بل بے آواز چلتے ہوئے عاطف کی پشت پر پہنچ گیا — پھر اٹھ

اٹھاتے ہوئے پیچھے سے گردن بڑھا کر دیکھا — خالی ہاتھ اس کی گود میں پڑے —

دیکھ کر حیب میں ڈال لی ہوگی —! یہ سوچتے ہوئے چپکے سے پہلو میں جاکھڑا ہوا

عاطف نے آنکھیں موندی ہوئی تھیں اور ہنسنوں پر براہی دلا دیر تلمبہ بکرات

”تو اتنی حسین ہے وہ —؟“

”کون —؟“ عاطف نے چونکتے ہوئے پوچھا —

”وہی — جس کی تصویر دیکھنے کے بعد آپ کا اتنا خوبصورت پوز بن گیا —

”کیا مطلب —؟“ عاطف نے تھیکے انداز میں اسے دیکھا —

”بھئی کسی حسین تصویر میں ہی انسان کو مایا ہو تو ایسا فلمی پوز بناتا ہے — ضرور

آپ اس سُن کی صورت کو دیکھ کر بیٹھے ہیں —“

”حسن کی صورت کے بچے —! وہ اسی طرح میٹر پر پڑی ہے —“

”پر سچ کہتے ہیں کہ آپ نے ابھی تک نہیں دیکھی —؟“

”اتنی ذرا سی بات کے لیے جھوٹ بولوں گا —؟“

”انظر —! انظر —!“ ندیم کی گھبرائی ہوئی آواز پر انظر پیچھے مڑا — وہ میز

پر قریب وہی تصویر ہاتھ میں لیے کھڑا تھا —

”ارے! یہ لڑکی تو میں نے دیکھی ہوئی ہے — میرے کلاس فیلو فریاد کے بڑے

بھائی مراد کی گرل فرینڈ ہے — بڑی بچی —!“

انظر ندیم کی بات سن کر ایک دم لپٹا —

”میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ اب یہ بات نہیں کرنی —“ انظر مڑ مڑ کر

عاطف کی جانب دیکھتے ہوئے ندیم کو ڈانٹتے لگا —

”تو میں وہ بات کب کر رہا ہوں —؟ میں تو سچ مح کی بات کر رہا ہوں —“

”سُن رہا ہوں سب کچھ بد معاشو —!“ عاطف اٹھ کر ان کے پاس آگیا اور

نہیں مگر سے یہ باہر نکالنے کے لیے دونوں کا ایک ایک کان پکڑ لیا —

”یہ بات تم میں سے کسی کے منہ سے پھر میں نے سنی تو مجھ سے برا کوئی نہ بھڑکے گا

نہی گاؤ میرے کمرے سے —“

”مگر بھائی جان! سنئے تو ہسی —“ ندیم پریشان ہو ہو کر کہہ رہا تھا —

”خدا کی قسم! میں سچ کہہ رہا ہوں — اس ڈرامے والی بات میں تو حادثہ کی گرل

فرینڈ بنانا تھا — مگر یہ تو میں فریاد کے بھائی مراد کی بات کر رہا ہوں —“

جھوٹی قسم ندیم یا انظر نے کبھی نہیں کھائی تھی — عاطف نے جلدی سے دونوں

کے کان چھوڑ دیئے —

”یہ کیا جو اس کر رہے ہو —؟“

”آپ ہی کی قسم بھائی جان —!“ ندیم کی آواز میں صداقت کا جوش تھا —

”یہ وہی ہے۔۔۔ خدائی قسم وہی ہے۔۔۔ اس کا نام۔۔۔ اس کا نام۔۔۔“

”جی اچھا۔“

نذیم چپ چاپ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔۔۔ عاطف نے میز پر سے تصویر اٹھائی۔۔۔ ان سب کے کہنے کے مطابق لڑکی واقعی بڑی حسین تھی۔ مگر تصویر اڑوانے کے انداز سے ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ ہر قسم کا فیشن کرنے میں بھی کافی ناک ہوگی۔

یقیناً کبھی میری ڈریس سے ہی بال بنوائے ہوں گے۔۔۔ سر پر پورے کا پورا ٹگلہ سا بنا ہوا تھا۔۔۔ سرمہ، لپ اسٹک۔۔۔ گال پر تیل۔۔۔

نجانے کیوں عاطف کو وہ تیل مصنوعی ہی لگ رہا تھا۔۔۔ غرض پورے میک اپ میں تھی۔۔۔ اور ہونٹوں پر بڑی بے باک سی مسکراہٹ۔۔۔ !!

وہ ابھی تصویر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اظفر اور سمیں آگئے۔ سمیں نے اندر آتے ہی عاطف کے ہاتھ میں تصویر دیکھ لی تھی۔۔۔

”ہوں! تو پھر کسی لگی ہماری بھابی۔۔۔؟“ بڑا شوخ سا تبسم سمیں کے ہونٹوں پر کھراتھا۔۔۔

”بہت پیاری۔۔۔“ عاطف کی اس بات پر اظفر چونکا۔۔۔  
”پسند آگئی۔۔۔؟“

”اتنے سارے لوگوں کا انتخاب ہے۔۔۔ کیسے نہ پسند آئے گی۔؟“ عاطف نے تصویر سمیں کے ہاتھ میں دے دی۔۔۔

”ہم سب کو پسند ہی یقین تھا کہ آپ کو بہت ہی پسند آئے گی۔“

”اب مجھے اس کا کوئی حدود و اربعہ وغیرہ بھی تو بتاؤ۔۔۔ میرے ہی ساتھ اس کی شادی ہونے والی ہے اور میں ہی اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔۔۔ نہ نام نہ پتہ۔۔۔ نہ یہ علم کہ کتنے بن بھائی ہیں۔۔۔“

”سوچ سوچ کر کیک پکھا ہٹ بھری چڑبائی آواز میں بولا۔۔۔“

”یا سمیں احمد۔۔۔ ہاں یا سمیں احمد ہی ہے۔۔۔ مجھے یاد آگیا۔“

”ارے! یہ لڑکی کی تصویر ہے لڑکے کی نہیں۔! اظفر زور سے ہنسا۔  
”یا سمیں احمد۔۔۔!“

”احمد اس کے باپ کا نام ہے۔“ نذیم کی بات کا کوئی یقین ہی نہیں رہا تھا۔۔۔ وہ پریشانی سے کبھی عاطف کی طرف اور کبھی اظفر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ارے ہاں! مجھے یاد آیا۔“ اظفر کچھ سوچ کر ایک دم بولا۔۔۔  
”سمیں اپنی نے اس کا یہی نام تو بتلایا تھا۔ یا سمیں۔! اس نے سن لیا۔“

”نہیں۔ میں نے ان کے منہ سے نہیں سنا تھا۔ یہ تو میں نے تصویر دیکھ کر ہے۔ اور نہ صرف اس کا نام مجھے تو اس کے باپ کا بھی معلوم ہے۔ اس کے

بھائی ہیں اور ان کے نام آصف اور کاشف ہیں۔ یا سمیں کی ایک چھوٹی بہن نیلا سمیں اپنی کے کالج میں ایف۔ اے کے سال دوئم کی طالبہ۔۔۔۔۔“

”ارے بس بس! رک جاؤ ذرا۔“ نذیم ایک ہی سانس میں بولے چلا! رہا تھا کہ عاطف نے اُسے ٹوک دیا۔ پھر اظفر سے مخاطب ہوا۔۔۔

”اظفر! تم جا کر سمیں کو بلا لاؤ۔“  
”کیوں۔۔۔؟ انہیں سب کچھ بتائیں گے۔؟“

”نہیں۔ نذیم کی تصدیق کرنے کے لیے۔! ہو سکتا ہے یہ کوئی اور یا کہ  
”ہاں ہاں۔ بے شک پوچھ لیں۔ مجھے خود پر پورا یقین ہے۔“

”سنو۔۔۔! سمیں کے سامنے کوئی بات نہ کرنا۔ اچھا۔۔۔؟“

”نام تو آپ جلتے ہی ہیں کہ اسی کی طرح بہت حسین ہے۔“ یاسمین —  
 ”صرف یاسمین —؟“ ندیم جلدی سے قریب آکر پوچھنے لگا۔  
 ”ہمیں تو صرف انا ہی معلوم ہے۔ سکول کالج میں ساتھ باپ کا لگائیتی ہوگی۔“  
 ”کیا —؟“ ندیم ہی بے تابی سے پھر بولا —

”ہاں —“

دو تین قدم اٹھانے کے بعد یاسمین پھر واپس آگئی —  
 ”یہ تصویر آپ اپنے پاس رکھیے بھائی جان —! یہ ہم آپ ہی کے لیے لے کر آئی ہیں۔“ یاسمین نے تصویر عاطف کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا —  
 ”نہیں یاسمین! یہ میرے پاس اس وقت رہے گی جب اس پر میرا کوئی حق ہوگا۔“  
 ”پرسوں آپ کی منگنی ہے — حق تو ہو گیا۔“  
 ”مکمل حق شادی کے بعد ہوتا ہے۔“ عاطف نے تصویر یاسمین کو واپس

اشارہ کیا —  
 ”دو ہیں — آصف اور کاشف —“ یاسمین مسکراتے ہوئے شرارت سے کہنے لگی —

”فکر نہ کیجئے سبھی کافی فیشن ایبل اور ماڈرن لوگ ہیں — سالے بھی آپ کو پسند آئیں گے اور ایک سمارٹ سی سالی بھی ہے — نام اس کا نیووفر ہے اور وہ میرا ہی کالج میں پڑھتی ہے۔“

یہ سب کچھ سننے کے بعد ندیم کا صبر و ضبط رخصت ہو گیا —  
 ”دیکھ لیا نا — آپ کو یقین نہیں . . . .“

”ندیم! —“ عاطف نے اس کی بات کاٹ دی — ”بڑوں کی بات نہیں بولا کرتے۔“ ساتھ ہی اس نے ندیم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا —  
 ”ندیم کی کس بات کی آپ کو بے یقینی تھی —؟“ یاسمین نے پوچھا —  
 ”کچھ نہیں۔“ عاطف جلدی سے بولا — ”میں کہتا تھا دنیا لوگوں کے لوگ ہوں گے اور ندیم کہتا تھا ماڈرن — بس اسی بات پر بحث ہو گئی۔“

”جیسی آپ کی مرضی —“ یاسمین کو کام کی جلدی تھی اس لیے بحث میں پڑنے کا وقت نہ تھا — تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی —

”دیکھنا نا —! آپ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔“ یاسمین کے جلتے ہی ندیم کو گویا زباں بندی سے رہائی مل گئی — فوراً شکایتی انداز میں بولا —

”بھائی جان! آپ نے یاسمین آپنی کے ساتھ صاف صاف بات کیوں نہ کر دی؟“  
 ”بکرا دھڑا یاسمین آپنی اور نازی آپنی ہی ہیں۔“ انھن جلنے کیلئے اتنی دیر خاموش تھا — وہ بھی عاطف کے پاس آکھڑا ہوا —

”یہ عورت ذات پیٹ کی ذرا ہلکی ہوتی ہے — گھر گھر لڑکی کی بدنامی ہوگی۔“  
 ”طف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا —“

”سنواظ اور ندیم! ہم تینوں کے علاوہ اس گھر میں کسی اور کو اس بات کا علم

نہیں ہونا چاہیے۔“

”اور آپ اس سے شادی کر لیں گے۔“ اظفر نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔

”لیکن اس لڑکی نے تو مراد سے شادی کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔“ ندیم

جلدی سے بولا۔ ”ان سے کہیے ہو جلتے گی۔“

”سیمیں آپ سے سنا نہیں تھا کہ لڑکی نے خود ہی خاص طور پر بھائی جان کیلئے

یہ تصویر دی تھی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ خوشی سے ہی یہاں شادی کرنا

”وہ مراد کیا کرتا ہے۔“ جانے کیا سوچ کر عاطف نے پوچھا۔

”تعلیم کوئی زیادہ نہیں۔ ایٹ اے سے بھاگا ہوا ہے۔ شاید ٹھیکیدار

وغیرہ کرتا ہے۔ مجھے اچھی طرح علم نہیں۔ ویسے کھانا لیتا ہے کہ ٹبی لمبا

کار بھی رکھی ہوئی ہے۔“ پھر ندیم نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

”قرآن نے مجھے بتایا تھا کہ کبھی یا سیمیں کی س لگہ یا عید یا کوئی اور موقع ہوا

مراد اسے بڑے قیمتی قیمتی تحائف دیا کرتا ہے۔“

”اچھا۔! ابھی۔!“ عاطف نے سر ہلاتے ہوئے میٹھی بھائی۔

”تنبہ کیا۔“؟“ ندیم کچھ نہ سمجھ سکا۔

”پہلے خوب اس کی کھائی کھاتی رہی۔ عیش کرتی رہی۔ اور اب شادی کا

فوجی افسر سے کرے گی۔ اس کا مستقبل غیر یقینی۔ ان کا ماشاء اللہ۔ اتنا

ہی ترقی۔ تعلیم۔ عہدہ۔ دولت۔ بڑے فائدے ہیں۔“

جو کچھ عاطف کے ذہن میں آیا تھا وہی بات اظفر نے کہہ دی۔

”چلو چھوڑو اس قصے کو۔ ہم کیوں کسی کے عیبوں کو ظاہر کریں۔“

۸۳ میں بھائی جان! آپ بھی توبہ کرنے دیے۔ اور پھر لڑکیوں یہ معاملہ

”آخر کس طرح نمٹے گا۔“؟ اظفر نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”کوئی اور حل سوچو یا۔! اگر ہمیں اس بات کا علم نہ ہوتا تو پھر بھی مجھے یہ شادی

تو کرنا نہیں تھی۔ اس صورت میں کوئی اور طریقہ سوچتے ہی نا۔“

”ہاں۔۔۔ وہ تو پھر کچھ نہ کچھ کرتے ہی۔“

”تو بس پھر۔۔۔ وہ طریقہ سوچو۔ یہ بڑا جھوٹا سا ہے۔“

”مگر ہے تو حقیقت۔!۔“

”نہیں۔ پھر بھی کسی کو بدنام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ وہ رشتہ کرنے والی

عزیز گھر گھر جاتی ہیں۔ سارے شہر میں بدنامی ہو جائے گی۔ اور ایک لڑکی کی سزا۔

توبہ! توبہ! خدا ہم سے یہ نگاہ نہ ہی کرتے تو بہتر ہے۔“

”چلیں اگر آپ یہ مناسب نہیں سمجھتے تو پھر کچھ اور سوچے لیتے ہیں۔“

اظفر اسی طرح کمرے میں ٹپل ٹپل کر، سگریٹ پی پی کر اور دھواں نکال نکال کر

سوچنے لگا۔ مگر اب چونکہ اس کے ہاتھ میں ٹنگی نہیں تھی۔ اس لیے خالی انگلیوں

کے ہی کش لے رہا تھا۔

عاطف اسی آرام کرسی پر بیٹھا آگے پیچھے جھول رہا تھا اور ندیم بیزار سا ہوا کھڑا

خاموشی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ سیمیں کی ڈھولک اور صاحبہ کی غلط سلط سوں

کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی اور دل بڑی طرح ادھر بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا

”ارے! وہ مارا۔!“ اظفر ہلکتے ہلکتے لیکالیک رک کر چیخا۔ پھر

عاطف کے قریب آتے ہوئے بولا۔

”بھائی جان! اس معاملے کو رفع دفع کرنے کی خاطر اگر آپ کی تھوڑی سی

بدنامی ہو جائے تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔“ عاطف بخمدگی سے سوچنے

جائے وہ کب تک تصور ہی اس صبح دیا میں بھو بارہا — وقت کا باطل نہ تھا  
 اس میں تھا — خود اپنا ہوش نہ تھا تو وقت کا کیسے خیال آتا — !  
 "ارے! یہ تو شاید سورہے ہیں —" سمیں کی آواز اس کے کان میں آئی —  
 "بیٹھے بیٹھے ہی —؟" نازی نے پیچھے سے پوچھا —

"ہاں — بیٹھے بیٹھے ہی —"

"یا سمیں کے تصور میں کھوئے ہوں گے —!"

ساتھ ہی ہنسی اور قہقہے بلند ہوئے —

"اور چڑیلو! یہ کیا ہی ہی ہی لگا رکھی ہے —؟" عاطف نے اسی طرح سٹکیں  
 مونڈے مونڈے کہا —

"آپ جاگ رہے ہیں —؟"

"معلوم نہیں —"

"کیا معلوم نہیں؟ اُٹھیے — آپ کو ادھر اتنی بلاری ہیں —" نازی پاس

آتے ہوئے بولی — "روغ حالہ تو ہر وقت کسی نہ کسی کو اپنے پاس بلاتی ہی رہتی ہیں

جی تو بھی اپنی سیر سے جھپٹ کر لیا کریں —"

ہمیشہ پھوٹے ہی بڑوں سے پاس جایا کرتے ہیں — بڑے چھوٹوں کے پاس

نہیں — "سمیں نا اچھا نہ انداز میں بولی —

"اُٹھیے نا بھائی جان! چلیے فدا — منگنی کی چیزیں دیکھئے — کیسی اعلیٰ ہیں —!"

"ایسی ہی پیاری ہیں جیسی ہماری بھابی —!"

"ماشاء اللہ — ماشاء اللہ —!" عاطف مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا —

"داتی سمیں نازی! میں تمہارے انتخاب کی داد دیتا ہوں —"

"مان گئے نا ہمیں —؟"

لگا — اریہ معاملہ رنج و صغ ہو گیا تو پھر لالہ کے ساتھ اس کی سادی ہو جانا پڑا  
 تھا — کسی رٹکی کو بدنام کرنا اسے گوارا نہ تھا — اور لالہ کی خاطر اگر خود اسے  
 کچھ بدنامی مول لینا پڑ جائے تو یہ کوئی ایسا مہنگا سودا نہ تھا — لالہ کو حاصل کرنا  
 کی خاطر تو وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا —

"پھر —؟ کیا سوچا —؟" انظر نے پانی سے بولا —

"بلکہ کوئی فیصلہ کیجئے — وقت بہت کم ہے —"

"میرا خیال ہے میری کوئی بات نہیں —"

"تو بس پھر ٹھیک ہے — ندیم —! ادھر آؤ —"

"لیکن پہلے مجھے تو بتاؤ کہ کیا کرنے لگے ہو —؟"

"اب یہ آپ نہ پوچھیں —"

"مگر انظر —! سنو تو — میری بات تو سنو —"

عاطف پکارتا ہی رہ گیا انظر نے ایک نہ سنی — ندیم کا بازو تھا ما اور تیری

سے کمرے سے نکل گیا —

عاطف کو اس کے ڈھیٹ پن پر بہت غصہ آیا — بڑبڑاتے ہوئے کرسی

زور زور سے آگے پیچھے چھلانے لگا — اور پھر دو منٹ بھی نہیں گزرے ہوں!

کہ زمین سے سب کچھ محو ہو گیا — تصور نے اسے لالہ کے حضور جا کھڑا کیا —

آئی — اور سب کچھ ہی بھول گیا —

اس سے باتیں ہونے لگیں — پیاری پیاری — اپنائیت اور خلوص بھری —

محبت اور اُلفت کی — باتوں میں ہاتھ آئے — مسکرائیں بھریں — رفا

گلابی ہو گئے — انکھوں میں لکشاں اتر آئی — اور پھر — خمار دہشتی میں سا

دنیا بھوم اٹھی —



عاطف ان کے ساتھ رقیہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوا۔ جبین بدستور ڈھولک بجا رہی تھی۔ اور صاعقہ اپنی بے سُری آواز میں گارہی تھی۔ پال بڑا اور بلی بھی تشریف فرما تھے۔ کبھی کبھی بلی بھی اپنی بلی جیسی مہین سی آواز میں صاعقہ کا ساتھ دینے لگتی۔

"یہ انہوں نے کیا چپاؤں میاؤں لگا رکھی ہے۔؟" عاطف ہنستے ہوئے باگتا ہے انہیں کوئی تکلیف ہے۔۔۔"

"تکلیف کیوں ہوگی۔؟ عین راحت۔۔۔ ایسے دن روز روز تو نہیں کرتے۔ بچوں کو کیوں ٹوکتے ہو۔ انہیں اپنی خوشی پوری کرنے دو۔"

یہ کہتے ہوئے رفوخالہ نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر سیمیں اور نازی اس کے سامنے مکان ہی لٹکا کر بیٹھ گئیں۔ یہ دیکھتے یہ متلوں کے کام کا غور سوٹ۔۔۔ کیسا ہے بھائی جان۔؟ یہ پڑھنے پڑھنے کا کام ہوا ہے اس پر۔

"اور یہ ٹیوشن کی سارٹھی۔ یہ میری پسند کی ہے۔ اس میں تو ہماری بھابی حور لگیں گی۔ حور۔۔۔!!"

"یہ تین لڑی والا مار۔ یہ جھومر۔ دونوں ایسے لگتے ہیں ناجیہ ایمام جوہری کی دکان سے آئے ہوں۔ مگر یہ میری بڑی کے ہیں۔ تیس سال پرانے اس زمانے میں ایسا کھرا سونا ہو کر آتا تھا۔ اب وہ بات کہاں۔؟ چیزیں بڑا خالص نہ رہیں اور انسانوں میں بھی وہ پہلے جیسا غلوں اور محبت نہ رہی۔"

"چلیے آپا! یہ زمانوں کا مقابلہ چھوڑیے۔ دل دکھتا ہے سوچ کر۔!"

"دیکھتے بھائی جان! یہ سوپر۔ یہ انگلش ہے۔ خالہ امی نے بڑے مالوں

"یہ میک آپ کی چیزیں۔۔۔ لپ انک۔۔۔ پاؤڈر۔۔۔ میکا۔۔۔ نیل پالش۔۔۔ جانے کیا کیا کچھ تھا۔۔۔ سب اسے گھیرے میں لیے بیٹھی تھیں۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا۔ کوئی کچھ۔۔۔ عاطف دیکھ سب کچھ رہا تھا۔ مدھم مدھم آوازیں کانوں میں بھی پڑ رہی تھیں مگر ہوش و حواس بالکل غیر حاضر تھے۔ وہ تو بنانے کن پہاڑیوں اور سبزہ زاروں میں گھوم رہے تھے۔؟"

ساتھ ساتھ ہنسنے مذاق بھی کر رہی تھیں۔ چٹپٹ بھی رہیں تھیں۔ رفوخالہ انہیں ڈانٹ رہی تھیں مگر ہنس ہنس کر خود فقرے چت کرنے سے باز نہیں آ رہی تھیں۔ رقیہ بیگم یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور نہال نہال ہوئی جا رہی تھیں۔ سب چیزیں اسے دکھانے کے بعد جبین ڈھولک لے کر عین اس کے سامنے

آ بیٹھی۔ صاعقہ اور بڑا بلی کو پرے ہٹا دیا گیا۔ اب سیمیں اور نازی میدان میں اُتریں پھر ان تینوں نے وہ سماں باندھا کہ عاطف کے ہوش و حواس بھی پہاڑیوں اور سبزہ زاروں سے کھنچ آئے۔ اتنی پیاری ان کی آوازیں تھیں اور اتنے خوبصورت طریقے سے ماہیا۔۔۔ ٹپے۔۔۔ ڈھولا۔۔۔ سسی اور سہرا انہوں نے گایا کہ عاطف عش عش کر اٹھا۔ رفوخالہ ساتھ جھوم جھوم کر بڑی تال سے تالیاں بجا رہی تھیں۔

دو گھنٹے ٹنک یہ نسل جاری رہا۔ کھانے کا وقت ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ رقیہ بیگم نے محض برخواست کرنے کا حکم دے دیا۔ تھکے تھکے سے سانس لیتے ہوئے سب اٹھ کھڑی ہوئیں۔

سیمیں اور نازی منگنی کی چیزیں سنبھالنے لگ گئیں اور جبین کو باورچی خانے میں

جب دونوں عاطف کے بار بار پکارنے کے باوجود اس کے کمرے سے بھاگ  
لگے تھے۔ اور اب رات کے نو بج گئے تھے۔

صاف منہ بسورتی ہوئی آگئی کہ اسے بھوک بہت لگی تھی مگر کھانا ابھی تیار  
نہیں ہوا تھا کیونکہ خاستاں اور اس کی بیوی بھی اگر چپکے سے دروازے میں  
دھولک بیٹھ رہے تھے۔

رقیہ بیگم نے سب لڑکیوں کو باورچی خانے میں بھیج دیا کہ جا کر ہاتھوں باتھ کر  
تیار کریں۔ آج کل کھانے پر وہ کچھ زیادہ ہی اہتمام کرنے لگی تھیں۔ پہلے  
لڑکے کا کام تھا۔ کچھ خوشی زیادہ ہی تھی۔ دوسرے عاطف کے ابا کو ملکہ  
اطلاع دے دی گئی تھی۔ جانے وہ کس وقت آجائیں گی۔ یہ ان کا ہمیشہ کا درس  
تھا کہ چپ چاپتے اچانک ہی آیا کرتے تھے۔

لڑکیاں ادھر چلی گئیں۔ رقیہ بیگم صبح سے کام میں لگی ہوئی تھیں اس لیے  
کمر بیدھی کرنے کو وہیں پینک پر دروازہ ہو گئیں۔ اور رفو خانہ کی سستی تو خاندان  
میں مشہور تھی۔ کام کریں نہ کریں۔ کمر ہر وقت بیدھی کتنی رہتی تھیں۔

سب کو اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتے دیکھ، عاطف اٹھ کر اپنے  
کمرے کی طرف چلا۔ صبح سے سوٹ بوٹ پہنے۔ ٹائی لگائے پھر رہا تھا۔

جب تک کھانا تیار ہو۔ شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالہ لباس پہن کر تھوڑی دیر آرام  
سے بیٹھے۔ باپھر باورچی خانے میں جا کر سب لڑکیوں کی بھاگ دوڑ کا مشاہدہ

اپنے کمرے میں جانے کے لیے راہداری میں سے گزر رہا تھا کہ بیرونی برآمدہ  
سے دوسرے سے اندر داخل ہونے اور بھپاک سے ندیم کے کمرے میں گز

باہر کے برآمدے کی تہی بھیجی ہوئی تھی۔ اس لیے معلوم نہ ہو سکا کہ کون تھے  
انظر اور ندیم کئی گھنٹوں سے غائب تھے۔ اس وقت تقریباً چار بجے

وہ تو شاید گھر میں بھی موجود نہیں تھے۔ موجود ہوتے تو سمیں اور نازی  
کے گانے کی آواز سن کر ضرور آجاتے۔ اور یہ دوسرے۔ یہ یقیناً انظر اور  
ندیم نہیں تھے۔ پھر کون تھے۔ جو چوروں کی مانند ان کے کمرے میں گھس  
گئے تھے۔؟

عاطف کو کبھی خطرے کا احساس ہوا۔ بے آواز بھاگتے ہوئے راہداری  
طے کی اور ندیم کے کمرے کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ وہ اندر  
سے بند تھا۔ مگر کسی کی ہلکی سرگوشیوں اور چپنی چپنی، دبی دبی، گھٹی گھٹی سننی  
کا آواز آرہی تھی۔

عاطف اور بھی چو کنا ہو گیا۔ جو تھوڑا بہت شک تھا وہ بھی جاتا رہا۔  
انظر اور ندیم کو بھلا اپنے کمرے کے اندر بھی یوں انتہائی دھیمی آواز میں کھسپہ  
لنے کی کیا ضرورت تھی۔؟ خطرے کا احساس شدید تر ہو گیا۔

کتنی ہی بار ملازموں کو اور گھر کے دوسرے افراد کو تاکید کی تھی کہ شام ہوتے ہی  
باہر والے دروازے بند کر لیا کریں۔ زمانہ بہت نازک ہے۔ مگر کہا مانتے  
والے دن تو جیسے کوئی پیرا ہی نہیں ہوا تھا۔

عاطف کو غصہ آگیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے عاطف نے خود ہی سب کو  
ان الزام سے بری بھی کر دیا۔ کہ آج شاید کام میں اور ڈھولک وغیرہ کے شوق میں  
کوئی گھسی کو خیال نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھار ایسی بے پرواہی ہو ہی جایا کرتی ہے۔

بہر کیف وہ گھر کا مرد تھا۔ اور اب اسے ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اپنی فم فم

عاطف نے سوچا اسے کوئی ہتھیار ہاتھ میں لے لینا چاہیے تھا۔ کیا پتہ وہ  
نہیں تھے اور کپڑوں کے اندر انہوں نے کچھ چھپا رکھا تھا۔ مگر اب واپس جانے  
کا وقت نہیں تھا۔ خدا پر بھروسہ کر کے عاطف نے اندر چھلانگ لگا دی۔  
دونوں ہی گڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ عاطف گرجا۔

”کون ہو تم۔؟ اور یہاں کیا کرنے آئے ہو۔۔۔؟“

عاطف کو کوئی جواب دینے کی بجائے دونوں ہنسنے لگے۔ بوڑھے کی بڑھاپے  
کی وجہ سے آواز نہک پکپکا رہی تھی مگر پھر بھی مزاج میں کچھ ایسی جولانی تھی کہ ایسے نازک

موقع پر بھی ہنسی رہا تھا۔

ان کی دیدہ دلیری پر عاطف کو بے انتہا غصہ آگیا۔  
”میں پوچھ رہا ہوں تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو۔؟ بغیر کسی کی اجازت لیے  
چرودن کی طرح اسی گھر میں کیوں داخل ہوئے ہو۔ آخر کون ہو تم۔؟“

”کون ہیں ہم۔؟“ بوڑھا پکپکا تی آواز میں حیرت سے چلایا۔

”اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔؟ تم نے اپنی بیوی اور سرس کو بھی پہچاننے  
سے انکار کر دیا۔۔۔؟“

پھر بوڑھا کھانتے ہوئے عورت سے مخاطب ہوا۔

”بیٹی! اپنے خاوند کو منالو۔ ہاتھ جوڑ کر، گلے لگ کر۔ اپنے بچوں کی  
خاطر اس کے پاؤں پڑ جاؤ۔ کچھ کر دو۔ صلح ہونی ہی چاہیے۔“

یہ کہتے ہوئے بوڑھے نے ہاتھ سے عورت کو کوئی اشارہ کیا۔ عاطف شدید  
ناگوار حیران حیران دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ عورت آگے بڑھی اور جلدی سے  
عاطف کے گلے میں باہیں ڈال کر سینے کے ساتھ سر لگا دیا۔

ندیم کے کمرے کی ایک کھڑکی باہر لان میں کھتی تھی۔ دبے دبے پاؤں  
جلدی سے ادھر چلا گیا۔ شاید ندیم کو کہیں جانے سے پہلے کھڑکی بند کرنا یاد  
رہی تھی۔ شیشے والے اور جالی والے دونوں ہی قسم کے کواڑ کھلے تھے۔ الہ  
پر دے تھے ہوئے تھے۔

عاطف نے شکر کیا ورنہ آئے والوں نے کھڑکی ضرور اندر سے بند کر لینا  
پر ددوں کی وجہ سے انہیں خیال ہی نہیں آیا۔

جلدی سے آگے بڑھا اور بہت احتیاط سے کھڑکی کے اوپر چڑھ کر ہولڈ  
پر بیٹھ گیا۔ پھر ذرا سا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ اظفر والے پلنگ پر ایک  
بیٹی تھی۔ اس کا رخ دوسری سمت تھا اس لیے عاطف اس کی شکل نہ دیکھ  
ویسے لباس اور انداز سے کافی ماڈرن معلوم ہو رہی تھی۔ ساڑھی کے بازو  
لمبی سی گردن پر ذرا اونچا بنا ہوا جوڑا اچھا لگ رہا تھا۔

پلنگ کے بالکل سامنے کرسی پر ایک بارشیش بوڑھا براجمان تھا۔  
کو اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اجنبی سی شکل تھی۔ عاطف نے  
اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بے حد سٹپٹا۔ یہ کون تھے۔؟ اور یہاں آکر کیوں بیٹھے ہوئے  
شاید گھر والوں کے سونے کا انتظار تھا اور پھر کچھ کرنے کا ارادہ۔  
اجکل چوریاں بھی تو عجیب عجیب انداز میں ہو رہی تھیں۔ پہلے چور  
مرد ہی ہوا کرتے تھے مگر اب تو یہ پیشہ عورتیں بھی اختیار کرنے لگی تھیں۔  
میں مرد کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”میرے سرتاج! مجھ سے آخر کیا...“

”یہ کیا مصیبت ہے۔“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے عاطف نے  
 مہرے سرتاج! مجھ سے آخر کیا...“

گھبرا کر گلے سے اس کے بازو ہٹائے اور پرے دھکیل دیا۔ کسی دولت مند بن سکتا تھا۔  
 کو لوٹنے کا یہ بھی ایک مہذب طریقہ تھا۔ عاطف نے سوچا۔  
 وہ عورت شاید اس سڑک کی متوقع نہیں تھی۔ دھڑام سے پٹنگ پر  
 گری۔ یا پھر ناز و خمر سے دکھانے کی یہ بھی ایک ادا تھی۔  
 مگر۔ بوڑھا اپنی بیٹی کو سنبھالنے کی بجائے پھر ہی ہی کر کے ہنسنے لگا۔

ہنسی کی زیادتی کی وجہ سے پیٹ پڑ کر دوہرا ہونے لگا۔ اس کا یہ انداز۔  
 عاطف چونکا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھری۔ اور پھر جلدی سے آگے بڑھا۔  
 کراس نے بوڑھے کی داڑھی پکڑ لی۔  
 ”دیکھو میاں! تم اب میری عزت پر۔“

”عزت کے بچے۔“ عاطف نے داڑھی اس کے چہرے سے علیحدہ  
 کئے بعد بڑی پھرتی سے پک کر عورت کے سر پر ہاتھ ڈالا۔ اس کا خوبصورت  
 جوڑا عاطف کے ہاتھ میں تھا۔ پھر جو تھپتھپ کا طوفان اٹھا۔ تو خدا کی پناہ

”بدتمیزو۔“ یہ ہر وہ پکڑیوں بھر رکھا ہے۔ ہمتہاری ہر حرکت زنا  
 ہوتی ہے۔“ عاطف بڑے غور سے دونوں کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہا تھا۔  
 یہ یقیناً اظفر بی کی کارستانی تھی۔ اپنے کالج کا بہترین ڈرامہ آرٹسٹ  
 آنا مکمل اس نے اپنا ایک بوڑھے کا اور تیرم کا عورت کا میک اپ کیا تھا کہ  
 عاطف بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔

”اے بھائی جان! ایک بڑا مزے دار لطیف ہو گیا۔“  
 ہنسی کی زیادتی کی وجہ سے آنکھوں میں جو پانی آ گیا تھا اسے صاف کرتے ہوئے  
 نوجوان بوڑھا بولا۔ ”غزالہ کو میں نے...“

تیرم کے لیے جوان عورت کا روپ بھرنے کا تو خیر آنا مکمل نہیں تھا۔

”غزالہ —؟ عذرا کون؟“ عاطف نے سینا کراٹھ کی بات کاٹ کر  
 ”یہ ندیم — جب تک یہ اس لباس میں رہے گا اس کا نام غزالہ ہوگا۔“

”غزالہ بیگم عجیب بھونڈے انداز میں شرارتے ہوئے کہنے لگی —  
 ”اور اب تو میں عاطف بھائی کے دوسرے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

اور یہ بتانے کے ساتھ ہی ایک بار پھر انظر کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اب ساتھ ندیم  
 بھی نہیں رہا تھا۔ عاطف بڑی حیرت سے دونوں کو دیکھ رہا تھا — ذرا ہنسی  
 تھی تو انظر پھر بولا —

”کچھ نہ پوچھیے جب اس نے عاطف صاحب کی بجائے عاطف بھائی کہا تو میں  
 لپٹا بیٹھا مگر وہ تو اتفاق ایسا ہوا کہ اس وقت غزالہ کی آواز کچھ ضرورت سے  
 زیادہ مبین ہو گئی تھی اور وہ سن نہ سکی تھیں — میں نے جو ایک دم ان کی نظر پجاتے  
 ہوئے اسے آنکھیں نکال کر دیکھا تو اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اب  
 غزالہ گھبرا کر جلدی سے بولی —

”اور اب تو میں عاطف صاحب کے دو بچوں کی ماں بننے والی ہوں۔“  
 یاسمین کی ماں ایک دم حیران ہو کر بھٹی بھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔  
 ”دو بچوں کی ماں —؟“

”ہاں ہاں دو بچوں کی ماں بننے والی ہوں —“ بڑے وثوق سے اس  
 نے کہا۔ اور مجھے ہنسی کا دورہ پڑ گیا — ساتھ ہی پریشانی کے بھانڈا نہ چھوٹ  
 جانے — پھر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو میں نے کھانسی میں دیا یا اور آنکھوں  
 میں آنسو بھر کر بولا —

”بیگم احمد! گھرا جٹنے کا غم بہت بُرا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میری بیٹی کے  
 ہوش دھواں ٹھکانے نہیں رہے۔ دراصل یہ آپ کو بتانا چاہتی ہے کہ یہ عاطف

”مجھ سے سیدھی طرح بات کرو۔“ عاطف خفیہ سا ہو گیا۔  
 ”ہاں تو ندیم کو میں نے اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہاں جا کر اسے کیا کہنا تھا اور مجھے  
 ویسے زیادہ تر بات مجھے ہی کرنا تھی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ نا تجربہ کار ہے۔ اس کیلئے  
 میں نے صرف ایک فقرہ رکھا تھا۔“  
 ”لیکن تم یہ روپ دھار کر گئے کہاں تھے۔؟“ عاطف نے بے تاب

سے پوچھا —  
 ”دیکھئے بھائی جان! پہلے یہ لطیفہ سُن لیں۔ باقی بات پھر تفصیل سے بتاؤں گا  
 ہنسی کے مارے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ آپ کو سن کر شاید کچھ  
 ہو جاوے۔“ انظر پھر ہنسنے لگا۔

”وہ انظر! تم اتنے چالاک ہو۔ بے شمار ڈراموں میں تم جھٹ لے چکے ہو  
 اور میں نے پہلے کبھی . . . . . ندیم نے ہنسنے اور جھینپتے ہوئے کچھ کہنا چا  
 مگر انظر نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔“

”ہاں تو بھائی جان! باقی ساری بات مجھے ہی کرنا تھی اس نے جھجک جھجک  
 اور شر شر کر انہیں صرف اتنا بتا دیا تھا کہ یہ آپ کے دوسرے بچے کی ماں بننے آ  
 ”لاحول ولا قوۃ۔!“ عاطف گڑ بڑایا — ”یہ کیا بھوکا س ہے۔“  
 ”بچئے تو —“ انظر نے بے قراری سے ہاتھ ہلایا —

”اپنے جھٹے کی بات میں نے کردی اور پھر آنکھ سے اسے اشارہ کیا  
 اب وہی فقرہ کہہ دے۔ تو بھائی جان —!“ انظر پھر پیٹ پر ٹک رہی۔

کے دوسرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“ بالکل بوڑھوں کے انداز میں اظہار  
 نے کھانتے ہوئے یہ فقرہ ادا کیا۔  
 ”لیکن آخر یہ سب ہے کیا بچو اس۔“ عاطف کے صبر کا پیمانہ لہریز ہوا  
 گیا تھا۔ انتہائی برہمی سے بولا۔  
 ”پہیلیاں ہی بوجھو اے جارہے ہو۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ کہ یہ کیسے ڈرا  
 کی ریہرسل ہے۔“  
 ”ریہرسل کہاں۔؟ ریہرسل کرنے کا موقع ملتا تو یہ غلطیاں تو نہ سزا  
 ہوتیں۔ اب تو ڈراپ سین بھی ہو گیا۔“  
 پھر اظفر کچھ بخجنگی سے بولا۔  
 ”دیکھیے بھائی جان! آخر آپ نے کسی نہ کسی طرح یاسمین صاحبہ سے بچا  
 تو حاصل کرنا ہی تھا۔؟ مجھے تو یہی راہ بہتر دکھائی دی۔“  
 ”کوئی۔؟“  
 ”میں آپ کا سر ہل گیا۔ ندیم بیوی۔ اور جا کر آپ کے سسرال گیا  
 کہ تین سال پہلے آپ والدین سے چوری چوری غزالہ سے شادی کر چکے ہیں اور بال  
 والے ہیں۔ لہذا وہ اپنی بیٹی کی اگر حیدر عافیت چاہتے ہیں تو اپنے پاس  
 رکھیں۔“  
 ”تم۔ تم۔ وہ۔ کیا نام ہے ان کا۔؟ احمد حسن کے گھر  
 تھے۔؟“ عاطف بے حد ہٹایا ہوا تھا۔ کتنے نڈر تھے دونوں۔  
 ”جی جناب۔!“  
 ”ان حلیوں میں۔؟“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔“  
 ”کمال کرتے ہو تم بھی۔ یہ سیودہ حرکت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔؟“  
 ”یاسمین کا کچا چٹھا کھولنے والی حرکت۔ بھونڈی۔! اور یہ حرکت۔  
 سیودہ۔! پھر آخر اور کس طرح معاملہ سلجھتا۔ عجیب باتیں کرتے ہیں آپ بھی!  
 اظفر کچھ تیز ہو گیا۔  
 ”پرسوں منگنی ہونے والی ہے۔ مزہ آتا جا جو ہو جاتی۔ پھر لالہ خانم کے  
 فراق میں المیہ گیت۔“  
 ”اونوں! کبھی تو زبان کو لگام دیا کرو۔“ عاطف نے اسے گھور کر ندیم  
 کی موجودگی کا احساس دلایا۔  
 پھر ایک دم ہی دونوں نے پلٹ کر ندیم کی طرف دیکھا۔ وہ ان دونوں کی ہونٹوں  
 سے بے نیاز قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا سا رسی کے بل درست کر کر کے خود کو ہر  
 پہلو سے دیکھ رہا تھا۔  
 دونوں کی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ ندیم چونک کر سمجھے مڑا اور انہیں اپنی  
 ہمت دیکھتے پا کر نادم سا ہو گیا۔  
 ”چلو جاؤ! آمار دیہ فضولیات اور مرد بنو۔“ عاطف نے اسے ڈانٹا۔  
 ندیم اپنے کپڑے لے کر جلدی سے کمرے کے ساتھ طاق غسل خانے میں گھس گیا۔  
 ”ویلے بھائی جان! یہ ڈرامہ کھیلنے کا لطف بہت آیا۔“ ندیم کے جانے  
 کے بعد اظفر بولا۔  
 ”صرف دو گھنٹوں میں تیاری کی تھی۔ بڑی مشکل سے سب چیزیں سہرا  
 نہیں۔ سیں اپنی کی کپڑوں کی الماری مقفل تھی۔ پہلے کبھی ڈھونڈی وہ نہ ملی تو پھر

”تم تو پھر بہت بڑے فنکار ہو۔“ عاطف نے طنز سے کہا۔

”ذرا نوازی ہے آپ کی۔“ اظفر جھک کر آداب بجالایا اور پھر بتائے

”بہت دن ہوئے جیپن کے پاس میں نے ایک مصنوعی جوڑا دیکھا تھا۔ اس کا

حاضر کم از کم چار کسوں کی تلاش لانا پڑی۔“ بڑے فخر سے وہ اپنے کارند

بیان کر رہا تھا۔

”اور۔۔۔ یہ وارلھی وغیرہ۔؟“

”یہ۔۔۔؟“ اظفر بڑے انداز سے مکرایا۔

”یہ تو سب میری اپنی چیڑیں ہیں۔“ کالج میں ڈرامے ہوتے رہتے ہیں۔

مردوں کے مختلف قسم کے بھیس بدلنے میں تو مایہ دولت ماہر سمجھے جاتے ہیں

اور اس فن کے تمام ہتھیار اور لوازمات اور ہر ضرورت اپنے پاس موجود رہتی ہے

”بدمعاش۔!“ عاطف مکرادیا۔

”کام بن گیا ہے نا۔“ تو اب ہنس رہے ہیں۔ جو مشکلات ہیں بیڑ

آئیں وہ ہم ہی جاتے ہیں۔“

”تو کس نے تمہیں ان مشکلات میں کودنے کو کہا تھا۔؟“ عاطف بے پروا

سے بولا۔

”آپ پرتس آگیا تھا۔ سوچا شکل کے وقت بھائی ہی بھائی کے کام نہ آیا

تو پھر کیا فائدہ ان رشتوں کا۔!“

”چلو اب جاؤ تم بھی انسان بنو۔“

”تو بھائی جان! آپ تو بڑے ہی ناشکرے ہیں۔ زندگی بھر کے ردگ

اٹنے تو بصورت طریقے سے آپریشن کیا ہے کہ آپ سکھ سے کسے کی اور ساتھ ہی

من کی مرادیں بھی پوری ہو جائیں گی۔“ مگر کیا مجال جو ایک لفظ بھی آپ کی زبان

سے شکر کیے کا نکلا ہو۔“

”احسان جتانے ہو۔؟“ عاطف نے مکرارٹ کو ہونٹوں میں دباتے

ہوئے کہا۔

”کئی نے سچ کہا ہے۔“ اظفر نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”سگ ہاسٹن براؤنر خور دہاش۔! اتنا کچھ کیا اور میاں کسی کو احساس ہی نہیں۔“

”جا کر اپنا حلیہ بدلتے ہو یا جو کس ہی کیے جاؤ گے۔“ ابھی کوئی نہ کوئی

لکانے کا بلا والے کر بلانے آجائے گا۔“

”ندیم تو غسل خانہ فارغ کر دے۔“ اور پھر اظفر بھی اپنا حلیہ بڑے غور

سے آئینے میں دیکھنے لگا۔

اسی آنار میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اظفر ہکا غل خانے کے

دروازے سے ٹکرایا۔“ گردہ اندر سے بند تھا۔“ پھر جلدی اور گھبراہٹ

میں اور کچھ نہ سوچا تو ندیم کا جوڑا اور اپنی وارلھی مونچھیں بغل میں دبائیں اور پلنگ

کے نیچے گھس گیا۔

ہنسی کے مارے عاطف کا برا حال ہو گیا۔

آج پھر عاطف نے اس سے ملنے کا وعدہ لیا ہوا تھا۔ مگر وہ نہیں جا رہی

تھی کہ یوں روز بروز کالج سے غیر حاضر رہے۔

ابھی تک کوئی نوکری ملک نہیں پراگھا۔ ایسا نہ ہو توئی لڑی نہیں  
اکٹھ آتے جاتے دیکھ لے اور پھر بات پھیل جاتے۔ اسی درے۔ وہ آج  
وقت سے کچھ پہلے ہی کالج آگئی تھی۔

وہ اتنی جلد آئی تھی۔ مگر۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ عاطف کی  
گاڑی اس وقت بھی وہاں موجود تھی۔ بے حد پٹائی۔ بہت گھرائی  
اب کیا کرے۔؟ وہیں سے گزر کر اس نے کالج کے چھانک میں

داخل ہونا تھا۔ دور سے ہی دیکھتی چلی آ رہی تھی اور سوچتی تھا کہ کس طرح اس  
کی نظر سے بچ کر اندر چلی جائے۔

دماغ نے وقت پر کام کیا۔ ایک دم خیال آیا کہ سڑک پار کر کے  
دوسری سمت چلی جاتے اور پھر اچھی طرح دوپٹہ اوڑھ کر اور سر جھکا کر  
اور اپنی چال کو ذرا بدل کر جلدی سے وہاں سے گزر جاتے۔ اس کے

علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔  
چنانچہ سڑک پار کر کے دوسری سمت آگئی۔ لاکھ سو چاہتا کہ جہاں  
عاطف کی گاڑی کھڑی تھی اور بالکل نہیں دیکھے گی بس بیگانوں کی طرح  
سر جھکاتے گزر جاتے گی۔ مگر جانے کیا ہوا۔؟ جب عین گاڑی  
کے سامنے پہنچی تو آپ ہی آپ نگاہ اٹھ گئی۔ عاطف ادھر ہی دیکھ  
رہا تھا۔ گھبرا کر سر جھکا یا اور دل کو جلدی سے تسلی دے کہ کہ سڑک کے  
اس پار تھی شاید اتنی دور سے عاطف پہچان نہ سکا ہو۔ تیز تیز قدم  
اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔

۲۰۱ پھاٹک کے سامنے پہنچ کر پھر سڑک پار کرنا تھی۔ اسی طرح سر جھکاتے  
جھکاتے جب پار کرنے لگی تو عین اس کے آگے ہی ایک گاڑی آکر ٹک گئی۔  
”کبکھٹ! اس نے بھی آنا تھا۔“ لالہ نے بڑبڑاتے ہوئے  
پریشان ہو کر ادھر دیکھا جہاں عاطف کی گاڑی کھڑی تھی مگر۔۔۔ وہ  
اب وہاں نہیں تھی۔

”جسے دیکھنا چاہتی ہو وہ یہ ہے۔“ کہیں پاس ہی سے آواز آئی۔  
لالہ نے گھبرا کر قریب کھڑی ہونے والی گاڑی کی طرف دیکھا۔  
عاطف دروازہ کھول کر مسکرا رہا تھا۔

”تم مجھ سے بھاگ کر جا کہاں سکتی ہو۔۔۔۔۔؟“  
”مگر۔۔۔۔۔“

”اگر مگر کچھ نہیں۔۔۔۔۔ جلدی سے بیٹھ جاؤ۔“  
ارادہ بالکل نہیں تھا۔ مگر بیٹھے بنا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔  
پھاٹک کے بالکل سامنے گاڑی کھڑی تھی۔ وہ تو ابھی کالج گئے میں کافی  
وقت تھا اس لیے کوئی زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ ورنہ آج تو ضرور کسی نہ  
کسی نے دیکھ لینا تھا۔

گھبرا کر جلدی سے بیٹھ تو گئی مگر خاصی پریشان تھی۔ عاطف کو بھی  
شاید اس کا احساس تھا اس کے بیٹھتے ہی جلدی سے وہاں سے گاڑی نکال  
لے گیا۔

”آپ کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ روپائیسی ہوتے ہوئے بولی  
”اور نہیں مجھے مجھ سے یوں نہیں بھاگنا چاہیے۔ اگر اتنی ہی جلد مجھ



”میں اب کالج نہیں جاؤنگی۔“  
 بیٹرنگ کانپا۔ عاطف نے جلدی سے بریک لگاتے  
 ”کیوں۔؟ کیا مجھ سے ناراض ہو گئیں۔؟“  
 ”نہیں۔۔۔۔۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“ اس کی طرف جھک کر پوچھنے لگا۔  
 ”آپ کا دل بُرا ہو جاتے گا۔“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ وہ تو بلکہ مجھے خود پر بڑا افسوس ہے کہ مجھ سے ایسی  
 حرکت کیوں سرزد ہوئی۔ تمہاری عزت کا عافظ میں نہ بنو لگا تو اور کون  
 بنے گا۔؟ میں تمہاری زندگی کی راہوں میں بدنامیوں اور رسوائیوں  
 کی دلدل کبھی نہیں پھیلاؤں گا لالہ۔۔۔۔۔! کبھی نہیں۔۔۔۔۔“

عاطف کا لہجہ بے حد پر خلوص تھا۔ دوبارہ گاڑی موڑنے لگا۔  
 ”تم نے اچھا کیا کہ مجھے میری غلطی کا احساس دلادیا۔۔۔۔۔“  
 دوبارہ گاڑی شارٹ ہوئی تو لالہ کا ہاتھ پھر اس کے ہاتھ پر جا رکھا۔  
 اس بار گرفت زیادہ مضبوط تھی۔  
 ”واپس نہ چلیے۔۔۔۔۔“

”ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔۔۔۔۔؟“  
 ”نہیں۔۔۔۔۔ یہ بات نہیں۔۔۔۔۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“  
 ”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ لالہ کچھ کہتے کہتے خاموش سی ہو گئی۔  
 ”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ بلا جھجک کہو۔۔۔۔۔ صاف گولہ کھیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔“

”سے جی بھرنے لگ گیا ہے تو پھر باقی زندگی کا تو خدا ہی حافظ ہے۔“  
 ”مگر۔۔۔۔۔ مگر آپ نے تو اتنی صبح آنے کے متعلق نہیں کہا تھا۔“  
 ”وہ ٹھیک ہے کہ نہیں کہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“ عاطف نے کچھ  
 لگناتے ہوئے ذرہ دیدہ نگاہ سے اسے دیکھا۔

”لیکن اس دل کی لگی کو کیا کروں۔؟ ایک گھنٹے سے یہاں کھڑا  
 تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔۔۔۔۔“

”آپ تو خواہ مخواہ ہی انتظار کرنے لگے۔۔۔۔۔ کچھ میری بدنامی کا  
 آپ کو خیال کرنا چاہیے۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔! عاطف نادام سا ہو گیا۔  
 ”جانے کیا ہو گیا ہے مجھے۔۔۔۔۔؟ رات کو بھی نیند بہت دیر

سے آئی۔ پھر صبح ہی صبح آنکھ کھل گئی۔ بہت دیر نہیں یاد کرتا رہا۔ پم  
 اٹھ کر نماز پڑھی۔ فارغ ہو کر بیٹھا تو تم پھر یاد آئے گئیں۔ اتنی شدت  
 سے کہ دل ایک دم ہی تمہارے پاس پہنچ جانے کو چل گیا۔ اسے بہت  
 سمجھایا۔ بہلایا۔ پھسلایا۔ مگر مانا ہی نہیں۔ پھر تپہ نہیں کیا  
 ہوا۔۔۔۔۔؟ بیٹھ جی معلوم نہیں۔ اٹھا۔ لباس تبدیل کیا۔۔۔۔۔“

یہاں اکھڑا ہوا۔۔۔۔۔“  
 ساتھ ہی عاطف گاڑی واپس موڑنے لگا۔

”واقعی مجھے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ چلو تمہیں کالج چھوڑ دوں۔  
 عاطف گاڑی موڑ رہا تھا کہ لالہ نے سیٹرنگ تھامے اس کے ہاتھ  
 پر اپنا لہڑتا ہاتھ رکھ دیا۔۔۔۔۔ اور کپکپاتی آواز میں بولی۔

۴۰۔ میں کسی بات کا بڑا نہیں مناؤں گا۔ — ”پھر فوراً سا مسکرا کر کہنے لگا۔

”میرا اور تمہارا مشن تو ایسا ہے لالہ۔ کہ ہمیں ایک دوسرے کو اپنے اپنے

ہمال پر چھوڑ دینے کی بجائے خلوص نیت سے ایک دوسرے کے کردار کی خدای کو خوب پی میں بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یونہی زندگی سکھ سے کٹے گی۔ — ہاں شاباش — اب کہد جو کہنا چاہتی ہو۔“

”اب میرا بھی کالج جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔“ لالہ لرزے اٹھو  
سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے بلک پڑی۔

”پتہ نہیں کیوں پڑھاتی سے میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔“

”یہ تو پچھتر بڑی اچھی بات ہے۔ اپنی امی کو بتانا۔“

”کہ اب تمہارا دل پڑھائی میں نہیں لگ رہا۔ وہ جلد تمہاری شادی کر دے گا۔“

لالہ شرمائی اور عاطف نے مسکراتے ہوئے، گنگنائے ہوئے  
سیٹھ سمجھاتے ہوئے، گنگائی کے رفتار تیز کر دی۔

”چلو آج نہیں کشتی کی سیر کروں۔“

”کسی کنویں میں —————“ اے عارف مجھ کو لایا —————“ صاف ظاہر ہے —————“ دربارِ سرورِ عظیم کے —————“

” ہے۔ — دریا پر سی جلیں گے۔ —“

6

سے ہاتھ میں لالہ کے دونوں ہاتھ لے کر ہولے سے دبایا۔  
 ”ان کا آپ نے ناشتہ کر لیا تو پھر میں کام کیسے کیا کروں گی؟“  
 لالہ زبیر گلاب مسکرائی۔

”پھر بڑے پیارے انداز میں مسکرایا۔“  
 ”پھر کشتی میں بیٹھ کر تھہرا دیکھوں ہار پتوار سنبھالے گا اور تم اپنے ان نازک  
 نازک ہاتھوں سے اسے ناشتہ کرانا۔ اچھا۔!“

”ایسی کو تو آپ دوسرے دن گھر سے نکال دیں گے۔“  
 ”اتنا نیچ نہیں ہوں ہاتھ ہی نہیں بے شک پاؤں بھی کہیں چھوڑاؤ۔“  
 عاطف لالہ کو پھر بھی اپنی جان سے لگا کر رکھے گا۔“

عاطف کے لہجے اور ہاتھ کے دباؤ میں بڑا اعتماد اور خلوص تھا۔ لالہ  
 کا سر آپ ہی آپ اس کے مضبوط کندھے سے جالنگا۔  
 گاڑی کی رفتار بڑی لمبی تھی۔ لالہ کا سر عاطف کے شانے پر ٹکا تھا  
 عاطف کا ایک ہاتھ سیٹنگ کو تھامے تھا اور دوسرا لالہ کے بالوں  
 کیل رہا تھا۔

”کتنا سکون تھا اس دنیا میں۔ عاطف کی دنیا میں۔ عاطف  
 کی قربت میں۔“ لالہ نے آنکھیں موند لیں۔

حفاظت کا ایک عجیب قسم کا پرسرست اور پرسکون سا احساس اس کا  
 حواس پر چھانے لگا۔ کوئی ڈر۔ کوئی خوف۔ کوئی پریشانی نہ  
 یوں لگ رہا تھا جیسے بے حد لمبی چھلکی ہو کر بادلوں سے بھی پرے  
 دور ہواؤں میں اڑی جا رہی تھی۔

”دیر یا کہ پر لے کنارے پر ایک چھوٹا سا چائے خانہ ہے۔“  
 سرمستی کے عالم میں بہت ہولے ہولے کہنے لگا۔  
 ”وہاں سے کچھ ٹوس اور ابلے ہوئے انڈے لیں گے۔ ایک  
 لالہ بے اختیار ہنس پڑی۔“

”اب دانت نہ نکالو۔ چلو اصرار تو نہیں کار چلانا سکاؤں۔“

عاطف نے اس کا ہاتھ کھینچ کر سیڑنگ پر رکھ دیا۔

”میں نہیں سیکھتی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ لالہ چلائی

”ایسے ہی ڈر لگتا ہے۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میری بہن

ایک بہادر فوجی کی بیوی ہو گئی۔ خاوند کی مانند نڈر اور دلیر۔“

”تو پھر کوئی ایسی ڈھونڈ لیجئے۔ میں بڑی ڈر پرک ہوں۔“

لالہ نے اپنا ہاتھ ہٹانا چاہا۔ عاطف نے جلدی سے اس کے اوپر اپنا

ہاتھ رکھ دیا۔

”جو ڈھونڈنا تھی وہ ڈھونڈ چکا۔ اب تو اسے ہی انسان بناؤں گا۔“

”ہاتے نہیں۔ میں ڈرائیونگ کبھی بھی نہیں سیکھ سکتی۔“

”ہاتے کیوں نہیں۔ ہر کوئی پہلے بھی سوچتا ہے۔“ اسی کے

انداز میں لولا۔ لالہ کو اس کی شوخی پھر ہنس گئی۔

”لالہ کی بچی! دانت نکالنے میں تم کافی ماہر معلوم ہوتی ہو۔“ پھر

مسکرایا۔ ”لگتا ہے تمہیں کسی نے بتا دیا ہے کہ تمہارے دانت بڑے

خوبصورت ہیں۔“

”کوئی بھی نہیں۔“ لالہ نے شرما کر جلدی سے منہ بند کر لیا۔

ہاتھ ابھی تک سیڑنگ پر عاطف کے ہاتھ کے نیچے دباتھا۔

ایک بار پھر اسے چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر ناکام ہو گئی۔

عاطف مسکراتا رہا اور ہلکی ہلکی رفتار سے گاڑی چلاتا رہا۔

وہ سارا دن انھوں نے دریائے سوات کے کنارے ٹہل کر، باتیں کر کے

لو جھگڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ معصوم معصوم تھرا رہیں اور سوخیاں کر کے  
اور کشتی رانی میں گزارا۔

باتوں ہی باتوں میں عاطف نے لالہ کو ایک دن پہلے والا اظہار اور ندیم

کا قصہ سنایا کہ کس طرح سوانگ بھر کر وہ اس کا رشتہ تڑوانے گئے تھے۔

اُدب اب ایک دو دن تک سیس اور رفوخالہ وغیرہ اس کے گھر آنے والی تھیں۔

”کیا آپ نے انھیں سب کچھ بتا دیا۔“ لالہ نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہاں۔ سب کچھ۔“ عاطف نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائی۔

”بالکل سب کچھ۔“ لالہ کی گھبراہٹ میں اب پریشانی تھی۔

”بالکل سب کچھ۔“

”اوہ! یہ آپ نے کیا کیا۔“ کتنی بدنامی ہو گئی میری۔“

لالہ سچ بچ رو دی۔ آنکھوں سے ایک دم ہی اتنے بڑے بڑے

آنسو نکلنے لگے کہ عاطف پریشان ہو گیا۔

”تم بالکل پاگل ہو لالہ۔“ پہلے ہی تمہیں کہہ چکا ہوں کہ تم میری غیرت

ہو۔ تم میری عزت ہو۔ پھر کیا اپنی ہی عزت کی حفاظت نہ کروں گا؟

”پھر آپ نے انھیں کیا بتایا تھا۔“

”کچھ بھی نہیں۔ البتہ آج رات شاید بات ہو۔“

”پھر پلیز!“ لالہ نے ننھے منے سے لرزتے لرزتے ہاتھ اس کے آگے

جوڑ دیئے۔

”یہ سب کچھ نہ بتائیے گا کہ میں آپ کو ملتی رہی ہوں اور آپ کے ساتھ

یہاں آتی رہی ہوں۔“



” بڑی زبردست گالیاں بھائی جان —! “ ندیم زور سے ہنسا۔

” بھئی کسی نے یہ بات سچ تو نہیں جان لی — “

” سچ کیا — “

” کہ میں چونکہ پہلے ہی شادی کر چکا ہوں اس لیے اب امریکہ جانے سے پہلے

پہلے انھیں میرا فکر کرنے کی ضرورت نہیں — “ عاطف مسکرایا۔

” نہیں نہیں — ایسی کوئی بات نہیں — “ اظفر نے آنکھ مار کر قہقہہ لگا

عاطف کے قریب ہی کھڑا تھا پھر سر کو شیشی میں بولا۔

” فکر نہ کریں آج رات یہ معاملہ بھی طے ہو جائے گا۔ “

” رات کو کیوں — “ ابھی کیوں نہیں — “

” اے رے بے قراری —! “

” میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ “

عاطف اپنی جھینپ مٹانے کے لیے جلدی سے برآمدے کی بیڑھیاں

چڑھنے لگا۔

پہلے اپنے کمرے میں جانے لگا تھا مگر پھر سب کا تماشہ دیکھنے کو جی بنیا

سا ہو گیا۔ مسکراہٹ کو ہونٹوں ہی میں دباتے ہوئے ماں کے کمرے میں داخل

ہوا۔ سبھی وہاں موجود تھیں۔ عاطف کو دیکھتے ہی ایک شور

سناج گیا۔

کوئی اس کے دشمنوں کی تعداد اور جیتے پوچھ رہی تھی۔ کوئی اس کے

دوستوں اور ملنے والوں کے متعلق چچان بین کر رہی تھی کہ کسی کی جوان بہن

بہانے والی تو نہیں تھی۔ جو شاید اسی لیے یہ کھیل کھیلا گیا تھا۔

جتنے منہ اتنے قیافے — اتنی باتیں — اتنے سوالات —

ساتھ ہی ساتھ باسین اور اس کے گھر والوں کو بھی باتیں بنائی جا رہی تھیں کہ ان پر

بھروسہ نہ کیا اور کسی غیر کی باتوں میں آکر رشتے سے جواب دے دیا۔ انھیں

اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع بھی نہ دیا۔

غرض ہر کوئی کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی۔ رقیہ بیگم کو دوسری ہی فکر نے متفکر

کر رکھا تھا کہ عاطف کے جانے کے دن بہت کم رہ گئے تھے اور ابھی تک لڑکی

ہی کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔

رفو خالہ سے بار بار کہہ رہی تھیں کہ کوئی کچھ کرے۔ وہ عاطف کو شادی کیے

بغیر کسی صورت امریکہ نہیں بھیجا پاستی تھیں۔

اسی سلسلے میں ایک بار پھر وہاں کی معاشرت، عورت کی عریانی اور آزادی

اور ان کی وجہ سے وہاں کی فضاؤں میں پلنے والے جراثیم زیر بحث آگئے تھے کہ

کس طرح انجانے میں ہی غیر ارادی طور پر یہاں سے گئے ہوتے نوجوانوں کو

چمٹ جایا کرتے تھے۔

” خالہ امی! میں آپ کی شکل حل کر دوں — “ اظفر جانے کب کا

اندرا کر رقیہ بیگم کے گھٹنے سے لگا بیٹھا تھا۔

” تم تو خاموش ہی رہو تو بہتر ہے۔ “ نازی برہمی سے بولی۔

” معاملہ اتنا سنجیدہ ہے اور تم پھر صفو لال اور بشیراں جیسی کوئی لڑکی لے

لیجو گے۔ “

” ہاں اظفر! تم یہاں سے چلے ہی جاؤ۔ “ اس وقت ہم تمہاری مذاق

بھری باتیں سننے کو بالکل تیار نہیں۔ “

” اچھا ہم بد مزاج ہی تھی — تم بس یہاں سے چلے جاؤ — “  
 ” آخر سارا غصہ مجھ پر کیوں اُتر رہا ہے — رشتہ نہیں ہوا تو اس میں میرا کیا قصور — “  
 ” چہ پیش تو وہاں کسی لڑکی کا باپ بن کر نہیں چلا گیا تھا — “  
 عاطف نے چونک کر اظفر کی دیدہ دلیری کو دیکھا مگر وہ بڑی سنجیدگی سے  
 بڑبڑاتے ہی جا رہا تھا —

”ابھی تو میری کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ہوتی تو یقیناً تم سب نے مجھ پر الزام دھرو دینا تھا۔ میں بیچارہ ہوں ہی بد قسمت۔“

”اگنہنگا کی بات! ہوں۔“ اس کی بڑبڑاہٹ سن کر رقیہ بیگم ہنس پڑیں۔

”نہ جھٹی! اس وقت میرے بیٹے کے پیچھے نہ پڑی رہا کرو تم سب! ہاں خالہ امی! انہیں ذرا سمجھائیے۔“

”اظفر سب کی طرف دیکھوئے اور بھی رقیہ بیگم کے گھٹنے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔“

”پھر؟ بتاؤں ایک لڑکی؟“ اظفر نے لنگھیلوں سے غافل

”کو دیکھا وہ گنگھا میرے ساتھ نشست ٹیکے کھڑا تھا اور سر جھکاتے ہوئے ہونٹوں سے ہونٹوں سے

مسکرا رہا تھا۔

”بھئی اظفر! مذاق نہیں ہو گا بلینز۔! ہم اس وقت بڑے پریشان ہیں۔“  
 سیسے منت بھرے لہجے میں بولی —  
 ”نہیں سیسے۔!“ رقیہ بیگم نے اظفر کی سفارش کی —  
 ”اس کی بھی سنیں تو سہی۔ کیا حرج ہے۔“

ایک بار پھر انظر نے عاطف کی جانب دیکھا — وہ بے پرواہی کا اظہار کرنے کے لیے اب چہرہ اٹھاتے خواہ مخواہ ہی چپٹ کو گھوڑ رہا تھا اور کچھ گنگنا رہا تھا — انظر مسکرا دیا — پھر کھٹکھا کر لالا —

”خالہ امی! لالہ کیسی رہے گی —؟“

”لالہ —! — سیمیں ایکدم چونک پڑی —

”ہاں — کیا کوئی حرج ہے —؟“ انظر یکلخت ہی سنجیدہ ہو گیا۔

”حرج —؟ نہیں — حرج تو کوئی نہیں —“

رقیبہ بیگم نے رفو خالہ کی جانب دیکھا — نازی اور جبین جلدی سے قریب سمٹ آئیں —

” لڑکی تو اچھی ہے۔۔۔۔۔“ رفو خالہ بولیں۔  
” نہ صرف اچھی۔۔۔ بلکہ وہ تو بے حد اچھی ہیں۔۔۔ امی! مجھے تو وہ بہت پسند ہیں۔۔۔“ جبین نے بے ساختگی سے خوشی کا اظہار کیا۔  
” ہاں خالہ امی! اظفر نے بات تو معقول کی ہے۔۔۔“ نازی نے بھی تائید کی۔  
” جناب! اظفر بات ہمیشہ معقول کرتا ہے۔۔۔“  
” اب شیخی نہ مارو۔۔۔! جبین مسکرا کر بولی۔  
” کبھی کبھار کوئی معقول بات منہ سے نکل جاتی ہے تو ایک دم شیخی میں آجاتے ہو۔“  
” اے ہے۔۔۔ اس وقت تو غیر سے محترمہ مسکرا رہی ہیں۔۔۔ چلو  
اسی مسکراہٹ کے حدفے میں تمہاری اس بات کا بڑا مانا کرتے ہیں اس کے بدلے میں  
کوئی کراہی سی نہیں سناتا۔۔۔۔۔“  
” اظفر! چپ بھی کرو۔ ہمیں ذرا بات کرنے دو۔۔۔“ نازی اسے جھڑک





”مجھے معلوم ہے۔“ عاطف وہیں سے بولا۔

”آپ کو۔۔۔؟“ سیمیں نے حیرت سے عاطف کو دیکھا۔ وہ ایک گڑبڑا گیا۔۔۔ اسے تو اس معاملے میں بولنا ہی نہیں تھا۔ مگر۔۔۔ براہ کی اس بے قراری کا۔۔۔! پتہ ہی نہیں چلا۔ کب زبان چھل گئی۔ گھبرا کر جلدی سے بات بنائی۔

”وہ دراصل ایک دن ایک دوست کے ساتھ وہاں سے گزر رہا اسے اس کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔“

”مگر آپ کو یہ کیا معلوم کہ وہ اسی کا گھر تھا۔“ سیمیں تو وکیلوں کا جبرج کرنے لگ گئی تھی۔

عاطف بیٹھا یا۔۔۔ گروہین آدمی تھا۔۔۔ جلد ہی غلطی پرتا بول گیا۔

”خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ بڑی بدمزاج ہے۔۔۔ سوائے تمہارے کسی اور کے گھر نہیں جاتی۔“

”ایسے ہی بدمزاج ہے۔۔۔؟“ جبین جھٹ لالہ کی طرف اشارہ کیا

تنبک کہ بولی۔

”ایسا عاطف سے تو پوچھ لیں۔۔۔“ اس کے بدمزاج کہنے سے شاید رفو خالہ کو کچھ خیال آیا تھا۔

”کچھ جی ہو۔۔۔ اس کی زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اور ہم نے اسے بالکل دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکا ہوا ہے۔“

”مکھی نہیں امی! مکھا۔۔۔“ اظفر کی اس بات پر سیمی ہنس پڑیں۔

”ہاں بیٹے۔۔۔!“ رقیہ بیگم سنجیدگی سے بولیں۔

”لالہ کو تو تم نے اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اس کے متعلق؟“

”امی! آپ جو مناسب سمجھیں۔۔۔“ عاطف سر جھکا کر بڑی فرمانبرداری سے بولا۔

”پھر بھی۔۔۔ کوئی خفخوری سی رستے تو دو۔۔۔ ایسا نہ ہو ہم کوئی غلط فیصلہ نہ بیٹھیں اور پھر تمہاری ساری زندگی برباد ہو۔“

اظفر عاطف کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے جا رہا تھا۔

”خالہ امی! ابھی دیکھا نہیں تھا کیسے کھٹ سے لالہ آیا کا پتہ بتانے کو تیار ہو گئے تھے۔۔۔ صاف ظاہر ہے پسند ہوگی ہی تو اتنی بے قراری سے بولے تھے۔“

پھر اظفر نے شرارت سے آنکھ دہائی۔

”بلکہ ان کی اس بے تابی سے تو مجھے یوں لگا تھا کہ وہ ان کی جان و جگر۔۔۔“

”تم بڑے شہریرہو اظفر۔۔۔!“ عاطف نے اسے گھورا۔

”آپ سے کم ہی ہوں بھائی جان۔۔۔!“ اظفر آنکھوں کو عجیب عجیب انداز میں گھمانے ہوتے بولا۔ ”ادھر ان سے۔۔۔۔۔۔“

”چلو اب بکو نہیں۔۔۔“

عاطف جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اظفر کی زبان اور آنکھوں کے شریر اشاروں سے اسے خطرہ ہی تھا کہ بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ نہ سامنے ہو گا نہ اظفر کی آنکھیں ناچ ناچ کر کوئی راز فاش کریں گی۔

کچھ تو دن بھر کا تنکا ہوا بہت تھا اور کچھ اظفر کی شرارتوں سے خالص اپنے کمرے میں ہی آرام کرتا رہا۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ جلد ہی سو گیا۔ صبح ناشتے کے لیے کمرے سے نکلا تو گھر بھر میں عجیب سی پہل پہل تھی۔ امی

۲۲۱ رفو خالہ اور سبیں، نازی وغیرہ لالہ کے گھر جانے کے لیے تیار ہوتی پھر رہی تھیں۔

” یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔“ عاطف نے شرارت سے پوچھا۔

” لالہ آپا کے گھر جانے کی تیاری۔۔۔۔۔“ جبین خوشی سے کھل کر بولی۔

” کیا آج گھر میں ناشتہ نہیں بنا۔۔۔۔۔“

” فکر کیوں کرتے ہیں۔ ناشتہ کر کے جاتیں گی۔۔۔۔۔“ آپ کی لالہ کو جا کر

” تکلیف نہیں دیں گی۔۔۔۔۔“ نازی نے بھی اسی شوخی سے جواب دیا۔

” وہ تو اس وقت کالج ہو گی۔۔۔۔۔“ سبیں چل انا کر سینڈل پہنتے ہوئے

” ہاتے بیچاری۔۔۔۔۔“ البتہ ساس کی بات مگر۔۔۔۔۔

” ہاتے بیچاری۔۔۔۔۔“ البتہ ہمیں کتنی بوڑھی ہو گی۔۔۔۔۔“ جبین نے کہہ

” تصور میں گم ہوتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

” ویسے میرا تو یہی خیال ہے۔۔۔۔۔“ سبیں نے شریہ نظروں سے عاطف

” کی جانب دیکھا۔۔۔۔۔“ کہ اتہائی پوچھی سی چیز ہو گی۔۔۔۔۔

” مجھے کیوں ایسی شریہ نظروں سے دیکھ رہی ہو۔۔۔۔۔“ تمہاری ہی سہیل

” ماں ہے۔۔۔۔۔“

” میرا بہت دور کا رشتہ ہے۔۔۔۔۔“ آپ کی تو سگی ساس ہو گی۔۔۔۔۔

” میں تو اس کے ساتھ بڑے تماشے کیا کرونگی۔۔۔۔۔“ جبین نے عاطف

” کو چھپڑنے کی غرض سے کہا۔۔۔۔۔

” خواہ مخواہ ہی۔۔۔۔۔“ عاطف بے ساختہ بول پڑا۔

” اتنا زوردار قہقہہ پڑا کہ عاطف کو گھبرا کر اپنے کمرے میں پناہ لینا پڑا

” پھر اس نے ناشتہ بھی اپنے کمرے میں ہی کیا۔ کھانے والے کمرے

” بھائی جان! آپ کی ساس ایمان سے دیکھنے والی پھیز ہے۔۔۔۔۔“ اس قدر

” سب کے مقہوم اور باتوں کی آوازیں اسے آتی رہیں۔۔۔۔۔“ مگر اس

” نے دوبارہ وہاں جانے کی ہمت نہیں کی۔۔۔۔۔

” ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوتے ہی وہ سب ادھر سدھا رگیتیں۔۔۔۔۔“ ندیم

” صبح ہی کالج چلا گیا تھا۔۔۔۔۔“ شاید اظفر بھی ساتھ ہی تھا۔ کہیں دکھائی نہیں دیا۔

” ورنہ اس سے ہی گپ شپ ہوتی۔۔۔۔۔

” آخر عاطف کو کبھی کمرے میں اور کبھی لان میں ٹہل ٹہل کر ان کی والیسی کا

” انتظار کرنا پڑا۔۔۔۔۔“ بڑا بے چین سا تھا۔۔۔۔۔

” لالہ کی مرضی کو تو وہ جانتا تھا۔۔۔۔۔“ مگر۔۔۔۔۔“ اس کی ماں کے متعلق اسے

” کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیا جواب دینے والی تھی۔۔۔۔۔“ ماں کے متعلق کبھی بھی

” لالہ نے کوئی بات اسے نہیں بتائی تھی۔۔۔۔۔“ نہ اس کی طبیعت کے متعلق۔۔۔۔۔

” نہ مزاج کے متعلق۔۔۔۔۔“

” یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ لالہ کے علم میں ہی نہ ہو اور اس کی ماں بچپن سے ہی

” اس کی بات کہیں کچی کہہ چکی ہو۔۔۔۔۔“ وہ اس کے ماحول کے متعلق بھی تو نہیں

” جانتا تھا۔ کہ پرلے گھرانوں کا ساتھ یا آزاد۔۔۔۔۔“ کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ بس

” دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کوئی گڑ بڑ نہ ہو۔ اور لالہ کی ماں مان جائے۔

” اس وقت عاطف باہر لان میں تھا جب سب واپس آئیں۔ سب

” انشتی کھاکھلاتیں اس کے پاس ہی چلی آئیں۔۔۔۔۔“ ان کے مسکراتے چہرے دیکھ

” کر عاطف کے بے قرار دل کو کچھ قرار آ گیا۔۔۔۔۔

” سبیں اور نازی نے آتے ہی اسے گھیر لیا۔۔۔۔۔

” ” بھائی جان! آپ کی ساس ایمان سے دیکھنے والی پھیز ہے۔۔۔۔۔“ اس قدر

لوٹھی — اس قدر پوچھی سی — کہ یوں لگتا ہے جیسے حلوے کا ڈھیر بڑا ہو —  
 ”سیس ہنس ہنس کر دوسری ہوتی جا رہی تھی —  
 ”چلو اتنا شکر ہے کہ میٹھی ہے —“ عاطف شرارت سے مسکرایا —  
 ”ارے کہاں —؟“ نازی جملہ می سے بولی —  
 ”دانت اور بڑھی پسی نہ ہونے کی وجہ سے حلو اکہ رہی ہے — ویلے  
 مزاج تو ہری مرچ کی چٹنی جیسا ہے —“  
 ”یہ بھی اچھا ہے — منہ کا مزہ ہر وقت گزارا رہا کرے گا —  
 ”تو بہ تو بہ! آہ! یہ لڑکا تو ساس کی جوتیاں سیدھی کیا کرے گا —“  
 رفو خالہ نے بھی ہنسنے ہوئے مذاق میں حصہ لیا —  
 ”بڑوں کی جوتیاں سیدھی کرنے میں ہی چھوٹوں کی نجات ہوتی ہے —  
 رقیہ بیگم نے بڑی شفقت سے بیٹے کو دیکھا —  
 ”خدا اسے سلامت رکھے — ایہ اس کا خیال رکھے گا تو اس کی لڑ  
 جھے مال کی طرح جانے گی —“  
 ”ہاں —! دیکھا نا امی نے کتنی اچھی بات کی —“  
 ”ارے خالہ امی! آپ آگئیں —“ اظفر کہیں سے نمودار ہوا —  
 ”دور سے ہی پوچھتا آ رہا تھا —  
 ”پھر کیا بتا —؟ ہاتے جلدی بتائیے — ایک ایک پل لگ  
 وقت گزارا ہے —“  
 ”بیٹے! یہ کوئی گڈے گڈی کی شادی تو نہیں کہ ایک دن میں ط  
 اور دوسرے دن ہو گئی — یہ زندگیوں کے معاملے ہوتے ہیں —

”بھلاہیں کیا جاسکا —“  
 ”پھر بھی —؟ آخر انھوں نے کہا کیا —؟“  
 ”ہم بات کر آئی ہیں — اب انھیں بھی تو سوچنے کے لیے کچھ وقت دینا  
 پاہیتے —“  
 ”پھر وہ کب جواب دیں گے —؟“  
 ”دو تین بار جائیں گے — پھر جوابات ہوتی نہیں بھی معلوم ہو جائے گی —“  
 اس کے سوالات کی بوجھاڑ سے تنگ آ کر رفو خالہ نے جواب دیا اور اٹھ  
 لاند پر چل دیں — شاید کمر سیدھی کرنے کی حاجت ہو گئی تھی — ان کے  
 پیچھے پیچھے رقیہ بیگم بھی چلی گئیں —  
 ”وہ لوگ کیسے ہیں —؟ گھر کیسا ہے —؟ بھتی کچھ تفصیل سے بتائیے نا  
 ہیں آپنی اور نازی آپنی — اکل کال کو آخر ہم بھی بھائی کی سسرال جایا  
 کریں گے —“  
 ”چھوٹا سا بڑا صاف ستھرا گھر ہے ان کا — بڑے اعلیٰ ذوق کا مظہر!  
 اور وہاں بسنے والے صرف تین افراد ہیں — ایک ہماری لالہ —  
 اب اس کی مال اور ایک ملازمہ —! —“  
 ”بس —! — اظفر نے مایوسی سے سر ہلایا — یہ تو کچھ بھی نہ ہوتے —“  
 ”انھیں کوئی پوری فوج پچاہیتے —؟“ عاطف مسکرا کر بولا — ”تو چلو  
 میرے ساتھ —“  
 ”نہیں چلتا —“ اظفر فوراً بولا — ”سیمیں اور نازی بے اختیار ہنس دیں —  
 ”اچھا یہ بتائیے — ان کی ساس کیسی ہے —؟“

” دیکھنے والی چیز — ” انازی نے مسکراتے ہوئے — ” سیمیں کی  
 ” اتنی خوفناک ہے — ” اظفر کی آنکھیں پھیل گئیں۔  
 ” ارے خوفناک نہیں — ” سیمیں عاطف کی طرف کانکھیوں سے دیکھ  
 ” ہوتے بولی — ” بلکہ بہت شاندار — ” انازی  
 ” ایمان سے — ” انازی  
 ” ایمان سے — ” انازی

” ہے کہ جی چاہتا ہے بیٹھے انھیں دیکھتے رہیں اور ان کی باتیں سنتے رہیں۔“  
 ” طبیعت کی کتنی اچھی ہیں سیمیں — ” انازی اس کی تائید میں بولی۔  
 ” حالانکہ بیمار تھیں شاید — ” ٹانگوں پر کھل ڈالے بیٹھی تھیں مگر۔  
 ” پھر بھی مسکرا مسکرا کر بڑے مزے مزے کی باتیں کیں۔“  
 ” ہاں — ” امی اور رفو خالہ تو ان پر بالکل ہی فدا ہو کر آتی ہیں۔“  
 ” واہ بھاتی جان — ” آپ کے تو مزے ہو گئے۔ ” انازی ہنسا۔  
 ” دعائیں دیجئے ہم کو۔“  
 ” جب معاملہ بالکل طے ہو جائے گا تو پھر ضرور دوں گا۔“  
 ” بڑے ہی بخوش ہیں۔“  
 ” کچھ کہہ لو۔“  
 ” عاطف مسکرا مسکرا کر کچھ گلنلانے لگا۔“

” کیوں نازی آپنی — ” اظفر کو جیسے یقین نہیں آیا۔  
 ” ہاں — ” سیمیں ٹھیک کہہ رہی ہے۔“  
 ” مجھے کچھ تفصیل بتائیے نا — ” اگر وہ واقعی اتنی شاندار ہے تو پھر پورا  
 ” بن گئے بھاتی جان کے سسر — ” کیوں بھاتی جان — ” ایہ سسر پورا  
 ” ہے آپ کو — ” اظفر نے سینے پر ہاتھ باندھ کر عاطف کے ساتھ  
 ” ہوتے پوچھا۔“

” جاؤ جاؤ — اپنا راستہ ناپو۔“  
 ” نہ بھتی اظفر! ان کے متعلق ایسی بات نہ کرو۔“  
 ” اے ہے۔ ” اسپیلی کی ماں کی بڑی طرفدار سی ہو رہی ہے۔“  
 ” اسپیلی کی ماں کی بات نہیں — ” وہ ہیں ہی اس قابل۔ ” انازی  
 ” کیا مطلب — ” عاطف نے چونک کر بڑے تجسس سے سیمیں  
 ” جانب دیکھا۔“

” آج چوتھا دن تھا — ” رقیہ بیگم اور رفو خالہ روز ہی لالہ کی ماں کے پاس آ رہی  
 ” تھیں۔ یوں تو اس نے دوسرے ہی دن یہ رشتہ کرنے سے منع دہری کا اظہار  
 ” کر دیا تھا۔ ” مگر وہ پھر بھی ہی اس لگاتے تھیں کہ شاید منت سماجت سے  
 ” ان جاتے۔“

” خیال ہی خیال میں ان سب نے لالہ کو کچھ اس طرح اپنے خاندان میں فٹ  
 ” بٹھالیا تھا کہ اب کسی اور لڑکی کے متعلق لمحہ بھر کے لیے بھی سوچنے کو کوئی تیار نہ تھا

” بھاتی جان یقین کریں۔ ” بڑی ہی اچھی ہیں لالہ کی امی۔ ” اسپیلی  
 ” سی شخصیت کی مالک ہیں اور باتیں کرنے کا انداز دھیما دھیما سا اتنا دل

سے کہنے لگیں —

” بالکل سیمیں، نازی کی طرح — اگر ہم کوئی فریب یا دھوکا آپ سے کریں تو اپنی لڑکیوں سے بھگتیں —“

” اللہ نہ کرے —!“ لالہ کی ماں نرٹپ کر بولیں —

” خدا سب کی بیٹیوں کو سدا سکھی رکھے —!“

” پھر —؟ نہ کوئی آپ کے پاس آیا نہ ہی لالہ کی پہلے کہیں نسبت طے ہو چکی ہے — آخر کوئی تو وجہ ہوگی ہی —؟ کچھ تو بتائیے —“

” وجہ —؟ اب میں آپ کو کیا بتاؤں —؟“ وہ کسی اندرونی دکھ سے

گراہ کر بولیں —

” بس جی ہی نہیں مانتا —!“

” آخر کیوں جی نہیں مانتا —؟“ رفو خالہ طبعی لہجے میں بولیں —

” ہماری خاطر اپنے دل کو سمجھائیے — یقین کیجئے بھئی قدر ہمارے گھر

میں لالہ کی ہوگی اور کہیں نہیں ہو سکتی — بچہ بچہ اس پر جان چڑھتا ہے —“

” خدا آپ سب کا بھلا کرے —! مگر — مگر — اودہ خدا !

میں کیا کروں —؟“ عجب قسم کی پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی —

رقیبہ بیگم نے بڑے غور سے دیکھا —

” آپ جیسی ہی عورت میں بھی ہوں — ایک نہیں چار بیٹیوں کی ماں —“

وہ بڑے خلوص سے بولیں —

” جو کوئی بھی خدشہ آپ کے دل میں ہے بلا جھجک کہہ دیجئے — یقین

کریں پھر میں بیٹے کی ماں بن کر اصرار نہیں کروں گی —“

دوسروں کے علاوہ خود عاطف نے بھی سیمیں کے ذریعے ماں کو صاف صاف کہلوا دیا تھا کہ اگر لالہ کے ساتھ اس کا رشتہ نہ ہو سکا تو پھر وہ شادی کر لگا ہی نہیں — جانے کیوں لالہ اس کی زندگی اور موت کا سوال بن کر رہ گئی تھی۔ جانے کیوں —؟

رقیبہ بیگم خود لالہ کو اپنے گھر میں اپنی بہو کے روپ میں چلتے پھرتے دیکھنے کی منتہی تھیں — بیٹے کی بات سنی تو لالہ کی ماں کے آگے نہ صرف ہاتھ جوڑنے بلکہ پاؤں پر گر کر نہ کو بھی نیا ہو گئیں — بیٹے کی زندگی موت کا سوال خود اپنا بنایا —

” آخر انکار کی کوئی تو وجہ ہوگی —؟“ وہ بڑی منت سے پوچھ رہی تھیں

آج گھر میں سب کو یقین دلا کر آئی تھیں کہ نہ صرف بات ہی سچی کر کے آئیں گی

بلکہ انشاء اللہ تعالیٰ شادی کا دن بھی مقرر کر کے لوٹیں گی —

” ارے آپا! کہیں ان کے پاس بھی تو کوئی باپ بیٹی نہیں پہنچ گئے —؟“

رفو خالہ نے کچھ سوچنے کے بعد لیکا یک چڑھک کر کہا —

” کون سے باپ بیٹی —؟“ لالہ کی ماں نے حیرت سے پوچھا

” جانے کون میرے بیٹے کا دشمن ہے —“ رقیبہ بیگم بڑے ٹھکر مندا مذاں میں

” پہلے ایک جگہ رشتے کی بات سچی ہو گئی تھی مگر وہاں کوئی عورت اور اگر

باپ پہنچ گئے کہ عاطف نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ اس کے بچے بھی ہیں —“

کو بھی اگر کسی ایسی ہی بات کا علم ہوا ہے تو یقین کریں یہ بالکل غلط ہے —

” نہیں — میرے پاس ایسا کوئی نہیں آیا —“

” اب کو سمجھ کیسے بتائیں کہ لالہ ہمیں کتنی عزیز ہے —“ رفو خالہ بڑے

”آپ ضرور پوچھ کر رہیں گی۔“ لالہ کی ماں نے بڑے کرب سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”صرف اس لیے۔۔۔ کہ اگر ہم میں وہ خامی نہ ہوتی جس کی بنا پر انکار کر رہی ہیں تو شاید اپنی صفائی میں کچھ کہہ کر آپ کی غلط فہمی رفع کر دوں پھر قدرے توقف بعد بولیں۔“

اور اگر ہوتی۔۔۔ تو۔۔۔ خدا کی قسم میں ماں لونگی۔۔۔ میں جو بیٹیوں والی ہوں۔۔۔ آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔۔۔“

”مگر۔۔۔ یہ بڑی طویل داستان ہے۔۔۔“ لالہ کی ماں بچکھاتا ہوئے بولیں۔۔۔ وہ انھیں ٹالنا چاہتی تھیں۔۔۔

”اور۔۔۔ میرے بیٹے کی پوری زندگی کا سوال ہے۔۔۔ دو دن پہلے اور اسی طرح بیٹھے گزر جائیں مجھے پرواہ نہیں۔۔۔ میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔۔۔“

”اوہ۔۔۔!“ لالہ کی ماں نے صوفے کی پشت کے ساتھ سر ٹیک دیا۔۔۔ آنکھیں میچ لیں۔۔۔ جانے کس دنیا میں کھو گئی تھیں۔۔۔ بہت دھیرے دھیرے بہت بہت ہولے ہولے پھر ان کے ہونٹ ہلنے لگے۔۔۔

رات بڑی تاریک تھی۔۔۔ فونکے ہی یوں لگ رہا تھا جیسے آدھی رات گزر چکی تھی۔۔۔

کھانے سے فارغ ہو کر امی کسی کام کے لیے برآمدے میں گئیں تو اٹلے پاؤں واپس آگئیں۔۔۔ سردی بہت تھی اور پانی سے بھیگی ہوا اتنی تیز کہ جسم کو چیرتی محسوس ہوتی تھی۔۔۔

اس کے پلنگ کے ساتھ والی کھڑکی کھلی تھی اور برج بستہ ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔۔۔ مگر اسے کوئی احساس نہ تھا۔۔۔

وہ کھلی کھڑکی میں سے باہر تاریکی میں سجانے کیا دیکھ رہی تھی۔۔۔ نظر تو کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔۔۔ مگر وہ پھر بھی گھورے جا رہی تھی۔۔۔

بالوں کی لٹیں پیشانی پر سے گزر کر اب آنکھوں اور چہرے پر بھی بیلغار کر رہی تھیں مگر اسے کوئی ہوش نہ تھا۔۔۔

”عائشہ۔۔۔!“ امی کی آواز نے اسے چوڑکا دیا۔۔۔

”بیٹے۔۔۔ اتنی سردی ہے اور تم نے صرف کبل اوڑھ رکھا ہے۔۔۔ کھڑکی بھی کھلی ہے۔۔۔ مجھے آواز دے لی ہوتی۔۔۔“

عائشہ نے نگاہ ماں کی جانب اٹھائی۔۔۔ خوبصورت آنکھوں میں نمی سے پھٹی تھی۔۔۔ بڑی بے بسی سے بولی۔۔۔

”کہاں ذرا اسی بات کے لیے آپ کو تکلیف دوں امی۔۔۔! اور پھر یہ سردی گرمی کے احساسات تو جاندار چیز کے لیے ہوتے ہیں۔۔۔“ لہجہ بڑا دکھی تھا

”کب تک یہ تکلف برتنی رہو گی۔۔۔؟ جب نہیں سکھ ہی ہے کہ اب یہی زندگی تمہارا مقدر بن چکی ہے تو اس سے سمجھو نہ کرنا سیکھو بیٹی۔۔۔ ایروں ہر وقت پریشان نہ رہا کرو۔۔۔“

ماں کی آوازیں گونگھ کی لہر تھیں مگر لہجے میں قناعت اور شکر گزاری

جلدی سے آگے بڑھ کر پہلے کھرکی کے دونوں پٹ بند کیے اور پھر دوسری چار پانی پر سے لحاف اٹھا کر کمر کے اوپر ہی ڈال دیا۔  
 ”اب اتنی بھی سردی نہیں کہ لحاف اور کمر کے دونوں ہی کی ضرورت پڑے!“  
 عائشہ کی آنکھوں کی نمی اور بھی گہری تھی مگر سہوٹوں پر مسکراہٹ تھی۔  
 صرف ماں کی خاطر۔!

”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہیں کس چیز کی اور کتنی ضرورت ہے۔  
 سردی بڑیوں تک میں گھسی جا رہی ہے اور تم کہتی ہو اتنی نہیں۔“  
 ماں نے بڑے پیار سے بیٹی کی جانب دیکھتے ہوئے لحاف ارد گرد سے درست کیا۔

”میں ذرا عشاء کی نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت پڑ گئی تو بے شک آواز دے لینا۔“  
 ”کیا نماز توڑ کر آجاتیں گی۔“ وہ مسکراتی۔  
 ”تیری خاطر یہ بھی کہ لو لگی۔“  
 اور جو اللہ میاں ناراض ہوگا۔“

”وہ سب کی مجبوری جانتا ہے۔ تیری خاطر نماز توڑ دے گی تو وہ کچھ نہیں کہے گا۔ مجھے یقین ہے۔“

ماں یہ کہتے کہتے باہر نکل گئیں اور عائشہ کی آنکھوں کی سپیوں میں سے موتی رخساروں پر پھسلنے لگے۔ اس نے نیم دراز ہوتے ہوئے جلدیے آنکھیں بند کر لیں اور ستر بچھلی دیوار کے سامنے ٹیک دیا۔

ابھی ماں کو دوسرے کمرے میں گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ عائشہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔  
 امی شاید نماز شروع کر چکی تھیں۔ کیونکہ دستک کے جواب میں نہ انہوں نے کوئی آواز دی تھی اور نہ ہی ان کے پاؤں کی چاپ دروازے تک گئی تھی۔  
 عائشہ مضطرب سی ہو کر برآمدے والے دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔  
 تھوڑے وقفہ بعد دوبارہ دستک ہوئی۔ اب زور سے تھی۔  
 امی اب بھی خاموش تھیں۔ عائشہ کسماکر، پہلو بدل کر، بڑی بے بسی سے خود کو دیکھنے لگی۔ پھر دوسرے کمرے کی جانب نگاہ کی۔ جلدھر ماں نماز پڑھنے گئی تھیں۔ ابھی تک کوئی چاپ کوئی آواز نہ تھی۔  
 تبسری بار پھر دستک ہوئی۔ اب اس میں اور بھی شدت اور عجلت تھی۔ سردی بہت تھی۔ بنائے آنے والا کون تھا۔ جسے یوں باہر کھلے میں انتظار کرنا پڑا ہوا تھا۔  
 ٹھٹھہرا ہوا ہو گا بیچارا۔ اکہیں کوئی تکلیف نہ ہو جائے۔!!  
 لازمہ بھی تو شام ہوتے ہی اپنے گھر سدھار جاتی تھی۔ پریشان ہو کر عائشہ نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

”امی۔۔۔ بے بسی کے مارے اس کے حلق سے چیخ سی نکل گئی۔  
 ”کیا ہے عائشہ۔“ اسی لمحے ماں جوتی کے بغیر ننگے پاؤں بھاگی بھاگی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ”کیا ہوا بیٹی۔“  
 ”اتنے زور زور سے کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔“  
 ”بیٹی! میں نے اسی وقت نماز شروع کی تھی۔ سلام پھیر لیتی۔“

تو کھولتی نا —

”اور اب پھیر لیا —“

”تمہاری بیچ سے میں پریشان ہو کر اسی طرح نماز چھوڑ چلی آئی —“

”کیا ہوا تھا —“

”مجھے تو کچھ نہیں ہوا — آنے والا بیچارہ سردی میں ٹھٹھڑہا ہو گا —“

”مجھے اس کا احساس ہے بیٹی مگر مجبوری ہے — اتنی ذرا سی بات کے لیے

بھی تو اب نماز نہیں توڑ سکتی تھی نا — خدا ناراض ہوتا ہے —“

ماں یہ کہتے ہوئے جلدی سے دروازہ کھولنے کے لیے باہر چلی گئیں —

ماما کی عظمت کے سامنے عائشہ کا سر جھک سا گیا — اس کی خاطر وہ ایلے

ہی کئی بار نماز توڑ چکی تھیں — اس وقت کیا انھیں خدا کا خوف نہیں ہوتا تھا —

مگر — وہ ان کی اولاد تھی — کتنا عظیم ہے یہ ماں کا رشتہ — باہر قسم کی

قربانی دینے کو ہر وقت تیار —!

وہ بھی کچھ سوچ رہی تھی کہ بھاری قدموں کی چاپ کے ساتھ ماں کی سرور

سی آواز سنائی دی —

”مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم خدیجہ کے بیٹے عثمان ہو —

انشاء اللہ اتنے بڑے ہو رہے ہو —“

”عثمان — اکون عثمان —“ عائشہ سوچنے لگی —

ان کا تو کوئی رشتہ دار عثمان نہیں تھا — نہ باپ کی طرف سے نہ ماں کی

رشتہ داری میں سے —!

”جانے کون ہو گا —؟ مجھے کیا —؟“

اپنا سر جھپکتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں —

”ارے! کیا ابھی سے سو گئیں —؟“ ماں کی آواز پر اس نے جلدی سے

آنکھیں کھولیں —

امی سے چند قدم پیچھے دروازے میں وہ کھڑا تھا — اوکوٹ میں اس

کا دراز قداور بھی نمایاں ہو رہا تھا — عائشہ نے جلدی سے دیوار سے ٹکا

ہوا سر اٹھالیا اور مستفسرانہ نگاہوں سے ماں کو دیکھنے لگی — انھوں نے

شاید اس کی نظروں کا سوال پڑھ لیا تھا —

”یہ عثمان ہے —! خدیجہ کا بیٹا —!“

”عثمان —؟ خدیجہ کا بیٹا —؟“

اسے ہنسی آگئی — عثمان تو خیر سامنے کھڑا تھا مگر خدیجہ کو کنسی —؟

وہ تو کسی خدیجہ کو نہیں جانتی تھی — دوسرے ہی لمحے شاید ماں کو اپنی

غلطی کا احساس ہو گیا تھا —

”ہاں لیکن تم جھلا خدیجہ کے متعلق کیا جانو — میرا بھی پاگل پن دیکھو —“

پھر جلدی سے پیچھے مڑیں —

”آؤ نا عثمان —! یہاں بیٹھو —“

کرسی گھسیٹ کر ٹھیک طرح سے رکھی — مگر وہ دوسری چار پائی پر

بیٹھ گیا — جس پر امی کا بستر لگا ہوا تھا —

”کرسی کا تکلف رہنے دیں خالہ جان —! مجھے تو بڑی سخت سردی لگ

رہی ہے —“ ساتھ ہی لحاف کھینچ کر اپنے گھٹنوں پر پھیلا لیا —

”امی اور سب بہن بھائی تو ٹھیک ٹھاک ہیں —؟“ امی اپنی نماز بھول



بھال چکی تھیں۔ عائشہ والے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔  
 ”ہاں۔۔۔ سب ٹھیک ہیں۔“ امی کی بات کا جواب دینے کے  
 بعد عثمان نے عائشہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

” یہ راجہ ہیں نا — “

”تم راہِ بعد کو جانتے ہو۔“

” اچھی ہی بتایا کرتی تھیں کہ آپ کی دو بیٹیاں رابعہ اور عائشہ تھیں اور پھر ایک ۔۔۔۔۔“ پھر وہ خاموش ہو گیا۔

گمروہ بالکل پریسکولن تھیں۔ کتنی صابر تھی اس کی ماں۔

عائشہ نے تنائش بھری نگاہ سے انھیں دیکھا۔ سینے میں کیسے کیسے درد چڑھتا تھا مگر بھر بھری کبھی کسی پر غلط فہمی نہیں ہونے دیتی تھیں۔

”بیٹے۔۔۔ انہیں کھانا تو ابھی کھانا ہی ہوگا۔۔۔“ فضا کی بوجھل نا  
گواہی کی شفقت بھری آواز نے توڑا۔۔۔

”نہیں خالہ جان! میں کھا کر آیا ہوں۔ یوں ناوقت آپ کو کبھی نکلنے نہ دیتا مگر اس طرف ایک دوست کے ہاں آیا تھا۔ سو چامی نے تاک کی مٹھی کہ آپ سے ضرور ملیں۔ پچھلے دو تین مہینے تو سستی میں کاٹ دیتے۔“ پھر مسکراتے لگا۔

” دراصل یہ یقین نہیں تھا کہ آپ کا گھر اتنی جلد مل جائے گا۔ لا  
کے گلی کو بچوں سے اچھی طرح واقف جو نہیں تھا۔ البتہ اب ہوگا۔  
” پھر جیسے تو تمہیں بتایا ہی پڑے گی۔ یوں بھی سردی میں آئے ہو۔

امی اٹھ کر باورچی خانے کی جانب چل دیں۔

” امی! عائشہ کی نگاہ ایک دم ان کے منگے پاؤں پر جا پڑی۔

”آپ جوتی تو پہنیں۔ زمین بہت ٹھنڈی ہے۔“

”چاتے کے لیے بانی رکھ آؤں پھر بائیں دھوکہ پہننتی ہوں۔“  
 امی بادرچی خانے میں چلی گئی تھیں۔ عثمان سے اس کی جان میچان نہیں  
 تھی۔ کیا کرتی۔؟ میزبانی کے اخلاق کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی گفتگو کرتی  
 فرد۔۔۔ مگر کس موضوع پر۔۔۔؟

البتہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نگاہ اٹھا کر اسے دیکھ لیتی۔ اور اگر اس نے نظر مل جاتی تو صرف مسکرا پڑتی۔ پھر اور کرتی بھی کیا۔ ۹

اور وہ — کبھی تو وہ چہرہ اٹھا، چھت کو گھورنے لگ جاتا —  
 جی دیواروں کو — کبھی کمرے میں بھری مختلف چیزوں کو — پھر سگریٹ

بڑی دیر دونوں یونہی آنکھ چوٹی کا سا کھیل کھیلتے رہے۔ آخر کچھ سوچتے

”جتنے اس نے زبان کھولی۔“ آپ کیا کرتی ہیں۔“

”میرا مطلب ہے۔ پڑھ چکیں یا ابھی پڑھ رہی ہیں۔“

ہنایں کہ وہ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی مگر وہ کچھ اس کے ساتھ سمیت گیا کہ ہر حسرت لک کی دل میں ہی رہ گئی۔

سینے سے ایک دُکھ کی لہر اٹھی اور ساری ہستی سے گزرتی ہوئی آنکھوں

میں آکر ٹھہر گئی۔ سر بہت نیچے جھک گیا۔

عثمان جواب کا منتظر ایک ٹک اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

اچھا ہوا۔ اسی وقت امی چائے کی سینی لیے اندر آگئیں اور وہ اس انتہائی مشکل اور تکلیف دہ سوال کا جواب دینے سے بچ گئی۔

عائشہ کا موڈ بڑا خراب ہو رہا تھا۔ چائے پینے سے بھی انکار کر دیا۔ امی نے ایک پیالی عثمان کو بنا کر دی۔ ایک اپنے لیے بنائی۔

دونوں ساتھ ساتھ چائے پیتے رہے اور ساتھ ساتھ باتیں کرتے رہے۔ عثمان کبھی کبھی نگاہ اٹھا کر عائشہ کے سنجیدہ چہرے کو بھی دیکھ لیتا مگر اس کا نہ الٹا

گفتگو میں شامل ہونے کو ہی چاہ رہا تھا نہ ہی اسے عثمان سے کوئی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

البتہ امی اور عثمان کی گفتگو سے، جو کبھی کبھی اس کے کان میں پر جاتی تھی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایم۔ اے کے پہلے سال کا طالب علم تھا اور ہوش

میں رہتا تھا۔

یہ سنا تو لمحہ بھر کے لیے عائشہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ تھوڑے

سے نووہ اناکم عمر معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ابھی صرف بی۔ اے تک ہی تعلیم حاصل

وہ اسے پہلی نگاہ میں ہی سمجھتی تھی کہ تعلیم وغیرہ سے فارغ ہو چکا ہو گا اور کسی ملازمت کے سلسلے میں لاہور آیا ہو گا۔ اس کے چوڑے چنگے چہرے پر کچھ ایسی چٹنگی تھی کہ کوئی اسے ایک آدھ بچے کا باب بھی سمجھ لیتا تو کوئی اچھے کی بات نہ تھی۔

ان کی باتوں سے بیزار ہو کر عائشہ نے کتاب اٹھالی۔ پھر اور کرتی تھی

کیا۔ ہاتھوڑی تھوڑی نیند آتی ہوتی تھی مگر یوں گھر آئے مہمان کو سامنے بٹھا کر خود سو جانا کافی معیوب سامعوس ہوا۔

ساتھ ساتھ جائیاں لے رہی تھی اور ساتھ ساتھ کتاب کے ورق بغیر پڑھے ہی اٹے جا رہی تھی۔

”انہیں شاید نیند آتی ہے۔“ عثمان ٹانگوں پر سے لحاف پرے ہٹا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا خالہ جان! پھر کبھی آؤنگا۔“

”بیٹے! تمہارا اپنا ہی گھر ہے اور اس کے دروازے ہمیشہ تمہیں کھلے ملیں گے جب جی چاہے آ جا یا کرنا۔“

”شکریہ خالہ جان۔“ پھر ایک نگاہ عائشہ پر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

”انشاء اللہ تعالیٰ اکثر آپ کو بور کرنے کے لیے حاضر ہوتا رہا کرونگا۔“

”نہیں نہیں۔ بور کیوں۔“ مجھے تو اتنی خوشی ہوئی ہے تمہارے آنے کی کہ کچھ پوچھو نہیں۔“ امی بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

”آپ بیٹھنے خالہ جان۔“

”دروازے تک چھوڑنے جانا تو میرا اخلاقی فرض ہے۔“

”بڑوں کا نہیں البتہ ہم عمر یا چھوٹوں کا ضرور ہوتا ہے۔“ عائشہ کی جانب عجب انداز میں دیکھتے ہوئے عثمان کمرے سے باہر نکل گیا۔

ماں بیٹی نے چونک کر اسے دیکھا پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش سی رہ گئیں۔ عائشہ نے جلدی سے کتاب چہرے کے آگے پھیلالی۔

”خدا حافظ۔“ برآمدے سے عثمان کی آواز آئی۔

خدا حافظ۔ امی کا لہجہ بڑا پشمرہ سا تھا۔

عائشہ اتنا بھی نہ کہہ سکی۔

”بیٹی! تم سو جاؤ۔ میں نماز پڑھ آؤں۔“

عائشہ نے جلدی سے آنکھیں میچ لیں۔ جانے کیوں اس میں مال سے نظر ملانے کی ہمت نہ تھی۔

پھر اتفاق ایسا ہوا کہ عائشہ کی امی اور خدیجہ ایک ہی پہینے میں بہو بن کر ان کے گھروں میں آگئیں۔ نئی نئی دھنیں۔ دونوں کو جانے ایک دوسرے کی کوئی ادالہ نہ آگئی۔ خوب مہنا پا بڑھا۔

دن میں جب تک دو چار ملاقاتیں نہ ہو جاتیں۔ دونوں ہی کو چین نہ پڑتا۔ دونوں ہی کو ایک دوسرے سے بے انتہا محبت تھی۔ مگر قسمت کی بات۔ ان کا ساتھ بہت دیر نہ رہ سکا۔

اچانک ہی خدیجہ کے خاوند کا تہا دلہ ہو گیا۔ خوب رد و کر ایک دوسرے سے بچھڑیں۔ پھر بہت عرصہ خط و کتابت کے ذریعے ادھی ملاقات ہوتی رہی مگر حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔

دو دو تین تین بچے بھی ہو گئے۔ دونوں اپنی گھر گہستی میں پھنسی چلی گئیں۔ ایسی۔ کہ پھر خط و کتابت بھی بند ہو گئی۔

مگر۔ ان کی وہ ڈیڑھ دو سالہ محبت اتنی مضبوط، اتنی گہری تھی کہ خط و کتابت بند ہونے کے بعد بھی ایک دوسرے کو دل سے محو نہ کر سکیں۔

”امی لگ کر رہی تھیں کہ کچھ عرصہ پہلے انھوں نے اوپر تلے دو تین خط آپ کو لکھے تھے کسی سے انھوں نے عائشہ کے باپ کے حادثہ کا سنا تھا۔ اسی سے متعلق خط تھے۔ مگر آپ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔“

عثمان کہہ رہا تھا۔ اس کے جواب میں امی کی گلو گیس سی آواز اُبھر سی۔

”خط مجھے ملے تھے۔ مگر حالات ایسے ہو گئے کہ میں جواب ہی نہ دے سکی۔ عائشہ کے ابا اس حادثہ سے جانبر نہ ہو سکے تھے اور عائشہ ان دنوں ہسپتال میں تھی۔“

دوسرے دن تین چار بجے کا وقت ہو گا۔ عثمان پھر آ گیا۔ امی باہر دھوپ میں بیٹھی تھیں۔ وہ بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ عائشہ اندر اپنے بستہ میں ہی تھی۔ عثمان اور امی کی باتوں کی آواز اسے سنائی دیتی رہی۔ آج امی اس سے خدیجہ کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ خود عثمان کو بھی اپنی ماں اور عائشہ کی ماں کے درمیان جو رشتہ داری یا تعلق تھا۔ اس کا علم نہ تھا۔ کیونکہ وہ بچپن سے ہی زیادہ تر گھر سے باہر رہنے کا عادی تھا۔ صبح سکول یا کالج چلے جانا اور پچھلے پھر کرکٹ کھیلنے کے لیے گراؤنڈ میں۔ کرکٹ سے بھی اس کی دلچسپی صرف دکھاوے کی تھی۔

ورنہ یہ تو بہانہ تھا گھر سے باہر جانے کی اجازت لینے کا۔ دراصل دونوں ہیں ملی بیٹھ کر گپیں مارنا، سگریٹ پینا اور ناش کھیلنا اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ یہ سب کچھ بڑی فراخ دلی سے اس نے عائشہ کی امی کو بتایا تھا۔ پھر امی اسے اپنے اور خدیجہ کے متعلق بتانے لگیں۔

ان کی آپس میں کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ عائشہ کی وادی اور عثمان کی وادی ایک دوسرے کی پڑوسی تھیں۔ دونوں کا آپس میں بے حد پیار

اور عثمان کی یہ کیوں؟ عائشہ کو لرز اگئی۔  
کہیں امی اسے سب کچھ بتا ہی نہ دیں۔ وہ مضطرب سی ہو کر ماں کو آواز  
دینے ہی والی تھی کہ ملازمہ نے انھیں چائے تیار ہونے کی اطلاع دی۔ ان  
کی بات ادھوری رہ گئی۔

”چلو ادھر بی بی کے کمرے میں لے چلو۔“

امی کے جواب سے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ یقیناً چائے کے لیے  
خود انھیں بھی ادھر آنا تھا۔ عائشہ نے شکریہ کیا کہ ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع  
ہو گیا تھا۔

وہ ادھر آ رہے تھے۔ عائشہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ٹانگوں  
پر کمرل درست کرنے لگی۔ کل رات کی نسبت آج اس کا موڈ بہتر تھا۔

عثمان کے سلام کا جواب اس نے مسکراہٹ سے دیتے ہوئے پچھل رات  
بے پناہ مسروری کے متعلق بھی پوچھا کہ وہ خیر و عافیت سے ہوٹل پہنچ تو گیا تھا۔

پھر وہ اس کی یونیورسٹی اور ہم جماعت لڑکے لڑکیوں کی باتیں کرتی رہ  
یہ بھی پوچھا کہ اس کی جماعت میں کتنے لڑکے اور کتنی لڑکیاں تھیں۔

کافی لمبی چوڑی گفتگو اس سے کر ڈالی۔ چائے کے ساتھ امی نے بڑے  
مرے کے بچوڑے بنائے تھے۔ عثمان عائشہ کی باتوں میں اتنا گم تھا کہ اسے

بھی نہ چلا اور وہ اسی محویت میں سارے بچوڑے چٹ کر گیا۔  
تین چار چائے کی پیالیاں پی ڈالیں اور کتنے ہی سنگریٹ پھونک دینے

اننا کھو گیا تھا اس کی دلچسپی گفتگو میں۔ کہ خود کو بھی بھول گیا۔

وہ بالوں میں بڑے مصروف تھے۔ امی نے ان میں دخل دینا مناسب  
نہ سمجھا۔ اتنے اچھے موڈ میں تھی عائشہ کہ وہ بھی خوش ہو گئیں۔ اور پھر  
موقع غنیمت جانتے ہوئے انھوں نے کسی کام کر لیے۔ ڈھیر ساری نمازیں پڑھ ڈالیں  
”بیٹے۔! کھانا کھاؤ گے نا۔“ امی کی آواز پردوں پر تک پہنچ گئی۔  
”نہیں نہیں۔“ عثمان نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”ارے۔! اٹھ بچ گئے۔ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔“ وہ  
جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”وقت ہو گیا ہے۔ کھانا کھا کر جانا اب۔“ امی نے اصرار کیا۔  
”نہا ہے ان ہوشلوں کا کھانا اتنا اچھا نہیں ہوتا جس کے لیے گھر کا چھوڑ  
کر جاؤ۔“

”نہیں آج ایک لڑکے کے ہاں ہم چند جماعت مدعو ہیں۔ وہاں میرا  
انتظار ہو رہا ہو گیا۔“ پھر عائشہ کی جانب دیکھا۔

”اچھا بھتی۔! اب باقی باتیں کل۔ خدا حافظ۔!“  
عثمان کے کمرے سے نکلتے ہی امی دھیرے سے بولیں۔

”بڑا اچھا لڑکا ہے۔ خدا خذ بچہ کو اس کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔“  
پھر براہ راست عائشہ سے مخاطب ہوئیں۔

”تم خوش رہتی ہو بیٹی! تو مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ میری خاطر ہی ہمیشہ خوش  
رہا کرو۔ اور جو کسی کی خاطر کچھ کرتا ہے تو اس کا اجر خدا سے دیتا ہے۔ تم

پر خدا کی بڑی برکتیں نازل ہونگی۔“  
”برکتیں۔! عجیب سے تقسیم کے ساتھ اس نے ماں کی جانب دیکھا۔

” ہاں — مجھے یقین ہے — پورا یقین —“ ماں کے لہجہ میں توکل تھا۔ ایسا توکل جو کسی انسان کو خدا کے بہت قریب کر دیتا ہے۔ اور وہ کھانا لکانے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ کھانے کے دوران بھی وہ عائشہ کو سمجھاتی رہیں۔ خدا کے انصاف کی داستانیں بیان کرتی رہیں۔ عائشہ چپ چاپ اُن کی باتیں سنتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔

” کھانا کھا دیا نہ — چائے کی تو محفیں ہر وقت ہی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے۔“ عثمان ہی کی خواہش سے وہ اسے نم کہہ کے بڑی بے تکلفی سے غائب کرنے لگی تھی۔ وہ اگر اسی طرح خوش تھا تو اسے کیا فرق پڑتا تھا۔!!

” پھر اٹھ کر بنا دو۔“

” ہیں —؟“ عائشہ بوکھلا کر بولی۔

” ہاں — کیا حرج ہے۔“؟

” مگر — مگر —“ وہ بڑی طرح بیٹھا گئی۔

” امی ابھی نماز سے فارغ ہوئی جاتی ہیں۔“

” نہیں — تم اٹھو — اتنی آرام طلبی اچھی نہیں ہوتی۔ جب دیکھو بستر میں گھسی رہتی ہو۔“

” لیکن عثمان۔۔۔۔۔“ عائشہ کا چہرہ پھیکا سا پڑ گیا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

” کیا ہوا تمہاری طبیعت کو۔۔۔ ہمیشہ ہی اچھی بھلی ہوتی ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتیں کہ کام چودہ ہو اس لیے۔! انہیں خیال ہونا چاہیے عائشہ! کہ اس عمر میں خالہ جان سارا کام کرتی ہیں اور تم ہر وقت بستر میں گھسی رہتی ہو۔“

” ناصحانہ انداز میں یہ کہتے ہوئے عثمان نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

” چلو اٹھو — آج میں تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیونگا۔“

” نہیں نہیں — عثمان! مجھے چھوڑ دو۔“ عائشہ اس کی جانب رُم طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چلائی۔

” میں نے کہہ دیا ہے کہ آج تم چائے بنا دو گی۔ ورنہ پھر میں یہاں سے کبھی

عثمان کی زندہ دل طبیعت نے ان کے گھر میں ایک خاص قسم کی رونق سی کر دی تھی۔ اب تو وہ روز ہی آنے لگا تھا۔ اس کے آجانے سے عائشہ بہت بہل جاتی۔ دونوں میں خوب گپ شپ ہوتی رہتی۔ اس دن عثمان آیا تو بڑی ترنگ میں تھا۔ جانے کیا بات تھی۔؟

” کیا کسی سہ جماعت لڑکی نے کچھ لفٹ دے دی ہے۔؟“ عائشہ نے شوٹا ”ارے! وہ کیا ہمیں لفٹ دیں گی۔ عثمان خود ہی کسی کے قابو میں آنے

والا نہیں۔“

” ایسے دعوے کرنے والے بڑے دیکھے ہیں۔“ عائشہ زبردست سکران۔

” چلو پھر ایک عثمان بھی دیکھ لینا۔ لیکن۔ اگر کبھی دکھائی دے گی تو پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔

” وہ۔۔۔۔۔ تمہاری ملازمہ کہاں ہے۔؟“

” آج اس کی لڑکی بیمار ہے اس لیے چھٹی لے کر چلی گئی۔“

” آج دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ چائے کی بڑی ضرورت محسوس ہوئی۔“

۱۸۴  
بھی نہیں بیا کر دنگا۔“ جانے کیوں وہ اس وقت اتنا خندی ہو رہا تھا۔

”وہ — وہ — مجھے معلوم نہیں تھا۔“

عثمان ہاتھوں میں سر تھا مے بیٹھا تھا۔ اتنا نادم خفا کہ امی سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

”ایسے ہی ضد کر بیٹھا کہ آج عائشہ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیو لگا۔ اور اسی سطلے میں اسے بستر سے باہر نکال رہا تھا کہ —“

اس نے امی کی جانب نگاہ اٹھائی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ غم تھا۔

”اتنے دنوں سے میں یہاں آ رہا ہوں۔ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ اتنی بڑی بات سے آپ نے مجھے بے خبر رکھا۔“

”عائشہ کسی کو بھی نہیں بتانے دیتی بیٹے۔“

”لیکن مجھے تو بتا دیا ہوتا۔“ مجھے آپ نے غیر کیوں سمجھا۔“

اس کے لہجے میں بڑا تاسف تھا اور شکایت تھی۔ پھر وہ اٹھ کر عائشہ کے قریب چلا گیا۔ وہ ابھی تک سسکیاں لیے جا رہی تھی۔ اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔

پلانگ کی پٹی کے ساتھ لگ کر نیچے فرش پر بیٹھتے ہوئے عثمان نے عائشہ کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”مجھے معاف کر دو عائشہ! میں نے تمہارے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہے۔“

”ابھی نے تمہارے جیساں دل کو ٹڑپا دیا ہے۔“ مجھے معاف کر دو۔“

”آج نہیں تو کل کہیں معلوم ہو جی جانا۔“ امی نے عثمان کے دونوں ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے اٹھائے ہوئے کہا۔

”عائشہ تو پاگل ہے۔ کتنی بار کہا کہ جب یہ اس کا مقدر ہی بن گیا ہے

عائشہ کی رحم طلب ڈیڈ بائی آنکھوں نے بھی اس پر کوئی اثر نہ کیا۔ اسے پلانگ سے نیچے اتارنے کے لیے عثمان نے ایک جھٹکے سے قبل ہاتھ پر اس کے بازو کو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ ایک چیخ کے ساتھ عائشہ ہزاروں

”کیا ہوا عائشہ۔؟ کیا ہوا۔؟“ امی بدحواسی کے عالم میں بھاگی آئی۔ عثمان چپٹی چپٹی آنکھوں سے اپنے قدموں میں پڑی عائشہ کو دیکھ رہا تھا۔ گھٹنوں گھٹنوں تک اس کی دونوں ٹانگیں مصنوعی تھیں۔

”عائشہ! میری بچی۔! میری جان۔!۔! امی نے اس کے قریب فرش پر بیٹھتے ہوئے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

”یہ تم گر کیسے گئیں۔؟ اگر کوئی ضرورت پڑ گئی تھی تو مجھے کیوں نہیں بلایا۔“ عثمان مجرم سا بنا کھڑا کبھی امی کے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو دیکھ رہا تھا۔

اور کبھی ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے زمین پر پڑی عائشہ کو۔! ”یہ — یہ — اوہ میرے خدا۔! آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا

خالہ جان۔۔۔“

پھر اس نے امی کو پرے ہٹاتے ہوئے عائشہ کو بازوؤں میں اٹھا کر پلانگ پر لٹا دیا۔ امی جلدی جلدی اس کا کبیل درست کرنے لگیں۔

”کہیں زبا وہ چوٹ تو نہیں آئی۔؟“ امی پریشان ہو ہو کر پوچھ رہی تھی۔ مگر عائشہ نہ رتے ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسکیاں لیے جا رہی تھی۔

”یہ گر کیسے گئی عثمان۔۔۔“



تمہیں ذرا سی بھی تکلیف نہیں ہونے دیتیں۔ ورنہ دنیا میں اسے بھی بہت سارے لوگ ہیں جن سے جسم کا کوئی عضو بھی چھن جاتا ہے اور پھر ان کے پاس سہارا بھی کوئی نہیں ہوتا۔“

عثمان اسی طرح اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرے جا رہا تھا اور کھویا کھویا سا بولے جا رہا تھا۔ عائشہ کی آنکھیں ہنوز بند تھیں مگر سسکیاں تھم چکی تھیں۔

”اس کے علاوہ خدا نے تمہیں دل و دماغ اتنا اچھا دیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے ہی سو کاج سنوارتی ہو۔ اتنی خوبصورت تصویریں بناتی ہو۔ اتنے پیارے سویٹر لپتی ہو۔ اتنے نفیس بھول کاڑھی ہو۔ اتنی دلچسپ اور پیاری باتیں کرتی ہو۔ تمہارے سینے میں اتنا ہمدرد اور پر خلوص دل ہے۔ تمہیں خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ بہت کچھ۔ پگلی اتم توان ٹانگوں کے بغیر بھی مکمل ہو۔“

جانے اس کی زبان میں کوئی سحر تھا یا اس کے خلوص کا نتیجہ۔ عائشہ عجیب قسم کا سکون سا محسوس کر رہی تھی۔

اتنا روئی تھی کہ آنکھیں سوچ گئی تھیں اور پوٹے بھادی ہو رہے تھے عثمان کو دیکھنے کے لیے پلکیں اٹھائیں۔

”خواہ مخواہ ہی رو رو کر اتنی خوبصورت آنکھوں کا متیانا س کر لیا۔“ عثمان نے شاید اسے ہنسانے کے لیے کہا تھا۔ واقعی عائشہ مسکرا دی۔

”چائے پیو گی۔“ اپنے ہاتھ سے بنا کر پلاؤنگا۔“

”ہونہم! اپنے ہاتھ سے۔“ امی بنائے گئی ہوتی ہیں۔“

”بڑی دھوکے باز ہو۔ ہمیں دکھانے کو آنکھیں بند کر رکھیں اور بیچ میں سے دیکھتی رہیں۔“

”نہیں تو۔ ایمان سے دیکھ بالکل نہیں رہی تھی۔ وہ تو امی کے قدموں کی چاپ سے اندازہ کیا تھا کہ باورچی خانے میں گئی ہیں۔“

”ماشاء اللہ کان بڑے تیز پاسے ہیں۔“

”بس اللہ کی دین ہے۔“ عائشہ اپنی فطری شوخی سے بولی۔

”کیا اللہ کی دین ہے۔“ امی چائے کی ٹرے لیے اندر آئیں۔

عائشہ کو مسکراتے دیکھ کر ان کے چہرے پر بھی ردِ فحش آگئی تھی۔

”تیز کان۔“ اس کی بجائے عثمان جلدی سے بولا۔

”ذرا ہوشیار رہا کیجئے خالہ جان۔ ابڑی جاسوس ہے یہ۔“

پھر وہ اسے بہلانے کے لیے بڑی دیر اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں کرتا رہا۔

بلے سر پیر کی۔ چھڑ چھڑ کہ اسے ہنسا تا رہا۔

اس رات اس نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ اور جب بہت رات گئے وہ ہوٹل واپس گیا تو عائشہ کے ذہن پر سے وہ بوجھ اور احساس اتر چکا تھا کہ عثمان کو جب اس کی ٹانگوں کے حادثے کا علم ہوگا تو وہ اسے حقیر جاننے لگے گا۔ اسے کمتر سمجھے گا۔ اور اس کی نگاہ سے وہ گر جائے گی۔

ان کے گھر عثمان کا آنا جانا اسی طرح تھا۔ بلکہ کچھ پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ بڑھائی کے وقت کے علاوہ تقریباً ہر لمحہ انہیں کے پاس



گھر کے اندر جو کھیل کھیلے جاسکتے تھے آہستہ آہستہ ان سب کے لوازمات عائشہ کی خاطر اس نے لاکھنے کیے تھے۔ کبھی دونوں تاش کھیلتے رہتے۔ کبھی لوڈو اور کبھی کیرم یا شطرنج کچھ جاتی۔ وقت کا ایک ایک لمحہ بڑا خوشگوار ہوا جا رہا تھا۔۔۔

جانے یہ سب کچھ عثمان کیوں کر رہا تھا۔ مگر عائشہ بڑی خوش تھی۔ اس کی تنہا اور ویران زندگی میں عثمان کے وجود نے بڑے خوبصورت سے رنگ بکھیر دیئے تھے۔

جب مختلف قسم کے کھیل کھیل کر تھک جاتے یا اکتا جاتے تو پھر دونوں گھنٹوں اور پہروں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔

عثمان سکول اور کالج کے قصے سنایا کرتا۔ عائشہ کے پاس تو سوائے اپنی اس اپاہجی کے اور کچھ بھی سنانے کو نہ تھا۔ بس بیٹھی مسکرا مسکرا کر اسی کی باتیں سنتی رہتی اور جی بہلاتی رہتی۔

کبھی کبھی دل ہی دل میں یہ سوچ کر اداس بھی ہو جاتی کہ زندگی میں اتنا حسن ہوتا ہے اور۔ اور۔ اس کے حقے میں کیا آیا تھا۔ یہ ویرانیاں اور تنہائیاں!۔۔۔

لیکن عثمان کچھ ایسا مزاج شناس واقع ہوا تھا کہ اس کی اداسی کو فوراً تاڑ جاتا اور پھر جھٹ پٹ کوئی بڑا مزیدار سا لطیفہ یا لطیفہ منابات سنا کر اسے ہنسنے مسکانے پر مجبور کر دیتا۔ اس دن بھی وہ بوہی بڑی اداس سی تھی۔ عثمان نے تاش کھیلنے کے لیے

کہا تو اس کا جی نہ چاہا۔ لوڈو، کیرم، شطرنج۔ ہر کھیل کھیلتے سے انکار کر دیا۔ جانے کیوں یہی دل چاہ رہا تھا کہ کھڑکی میں چپ چاپ بیٹھی دُور ٹرک پر آنے جانے والوں کو دیکھتی رہے اور کچھ سوچتی رہے۔ کیا۔؟ بس یہی اوٹ پٹانگ سی باتیں۔ منفی قسم کی!۔۔۔

جب اس نے ہر کھیل کھیلتے سے انکار کر دیا تو عثمان اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کا عائشہ سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ شاید اسی کی اداسی رفع کرنے کے لیے! اسی کا موڈ بحال کرنے کی خاطر!۔۔۔

”وہ دیکھو۔ وہ جو سرخ رنگ کی کار ابھی ابھی گزری ہے نا۔ وہ واکنس وین ہے۔“ اس وقت اور کوئی موضوع نہ ملا تو محض اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے اسے کاروں کے متعلق ہی بتانے لگا۔

”وہ ٹوٹوٹا اور وہ پلکے سے رنگ کی ڈاٹس ہے۔ وہ دیکھو وہ جو سامنے والی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوتی ہے وہ ٹیلور لیٹ ایما لا ہے۔ یہ امریکن گاڑی ہے۔ میرے پاس جب ڈھیر سارے پیسے ہونگے تو یا یہ خرید لوں گا۔ یا پھر مر سڈیز۔“

”اور جو کار کے لیے پیسے ہوتے ہی نہ۔؟“ وہ اسے متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ جلد ہی خود کو بھول اس کی باتوں میں کھو گئی۔

”تو پھر میں سکرٹریز پر خرید لوں گا۔“ وہ جیسا ابھی ابھی کہہ رہا ہے۔ ”عائشہ نے بڑی ہمدردی سے اسے دیکھا۔ کیسے سچا راٹیلور لیٹ یا مر سڈیز خریدنے خریدتے ایک سکورٹر پر ہی قانع ہو گیا تھا!۔۔۔

”کادوں پر۔“ عائشہ کو اپنی دانست میں بڑی اعلیٰ سوچھی۔

”پانگل۔ اکادوں پر تو اکثر براتیں جاتی ہیں۔“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

”میری برات سکوتروں پر جاتے گی۔“

”سکوتروں پر۔“ عائشہ بے اختیار قہقہہ لگا اٹھی۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔“ عثمان کو اس کی ہنسی بے محل معلوم

ہوئی۔ نیکیے انداز میں بولا۔

”دیکھنا تو سہی۔ لوگ دُور دُور سے اس سکوتروں کی برات کو دیکھنے

آئیں گے۔“

”جیسی تمہاری خوشی۔“ عائشہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پا سکی

”لیکن پھر میں تمہاری شادی میں شریک نہیں ہو سکتی۔“

”کیوں۔“ عثمان جلدی سے بولا۔ ”اگر تم شریک نہ ہو تیں تو میں

شادی کرونگا ہی نہیں۔“

”لیکن ان سکوتروں والی برات میں میں کس طرح شامل ہو سکتی ہوں۔“

”میں تمہیں اپنے ساتھ بٹھاؤنگا۔ بڑی حفاظت سے۔ تم فکر کو نہ کرنا۔“

”چلو چھینک ہے۔ جب برات جاتے گی تو تم مجھے ساتھ بٹھاؤ گے مگر پھر

میں وہاں سے واپس کیسے آؤنگی۔“

”اسی طرح۔ جیسے جاتیں گے۔“

”مگر واپسی پر تو تمہاری دہن تمہارے ساتھ بیٹھے گی۔ پھر میں کہاں جاؤنگی۔“

”میرے پاس۔“ سینے پر بڑے زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

”ارے نہیں۔ وہ تو موٹر سائیکل ہے۔ تمہیں سکوتر اور موٹر سائیکل کے

فرق کا بھی علم نہیں۔“ عہد ہو گئی تمہاری۔“

”میں کوئی لڑکا ہوں۔ لوگوں کو یہ سکوتروں وغیرہ کے شوق ہوتے ہیں۔

مجھے کیا معلوم۔ میں تو ہر اس قسم کی سواری کو موٹر سائیکل ہی سمجھتی ہوں۔“

”پانگل ہو تم تو۔ اٹھو و ابھی تمہیں الگ الگ سب کے متعلق بتاتا ہوں“

پھر یکدم انگلی اٹھا کر چلایا۔

”وہ دیکھو۔ وہ جواب موٹر سائیکل قسم کی چیز گزری ہے وہ کوئی ہے۔

یہ بڑی ہلکی چھلکی ہوتی ہے۔ پھر سکوتر کا نمبر آتا ہے اور آخر میں موٹر سائیکل۔“

”اچھا۔“ عائشہ نے گویا سب کچھ سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

”اور میرے پاس کار کے لیے پیسے نہ ہوتے تو میں سکوتر خرید لونگا۔“

پھر نہ جانے اسے کیا سوچھی۔ ایک دم ہی سڑک کی طرف سے نگاہ ہٹانے

ہوتے عائشہ کی جانب رخ کر کے بیٹھ گیا۔

”میں اکثر سوچتا ہوں کہ جب میری شادی ہوگی تو میری برات میرے

سسرال کس طرح جاتے گی۔ کوئی انوکھا سا طریقہ ہونا چاہیے۔“

”کیوں۔“ انوکھا کیوں۔“

”بس ایسے ہی دل چاہتا ہے۔ عام سی برات نہ ہو۔“

”کیوں۔“ تم تو جیسے بڑے خاص ہو۔“

”ہر انسان خود کو خاص سمجھتا ہے۔“

”میں تو نہیں سمجھتی۔“

”تم تو ہو سہی بیوقوف۔ اچھا پھر بتاؤ تا میری برات کس طرح جاتے۔“

” مگر پھر ایک سکوتر پر نہیں کیسے بیٹھ سکیں گے۔“ اس وقت دونوں ہی بچے بنے ہوئے تھے۔

” اسے کسی اور کے ساتھ بٹھا دوں گا۔“

عائشہ کو اتنا زبردست ہنسی کا دورہ پڑا کہ آنکھوں سے پانی رواں ہو گیا۔

” اپنی دلہن کو کسی اور کے ساتھ بٹھا دو گے۔ شاباش عثمان شاباش!“

وہ ہنستی بہتی چلی گئی۔

” یہ میں نے کب کہا کہ اپنی دلہن کو کسی اور کے ساتھ بٹھا دوں گا۔“ تو بہ تو بہ اب تو کبھی بھی نہ کروں۔ اتنی پیاری میری دلہن ہوگی۔ اسے تو اپنی جان کے ساتھ لگا کر رکھوں گا۔“

” پھر میری سمجھ میں تمہاری یہ منطق نہیں آتی۔ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھاؤ گے اور اسے بھی جان سے لگا کر رکھو گے۔“

” وقت آ لینے دو۔ سب کچھ خود بخود ہی سمجھ میں آ جائیگا۔“ وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

اسی لمحے ملازمہ چائے لیے آگئی اور عثمان نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

رات ہوئی تو عائشہ کو بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ عثمان کی عجیب و غریب باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔

بہت دنوں سے عثمان کے گھر سے خط آرہے تھے کہ چند دن کے لیے جا لگاؤ سے مل آئے۔ امی ابا اس کے بغیر بڑے اداس ہو رہے تھے۔ عثمان ہر

لاکر عائشہ کو دکھاتا۔ تعاد پانچ چھ تک پہنچ گئی تو ایک دن عائشہ سے رہا نہ گیا۔

” جب اتنی بار انہوں نے بلایا ہے تو تم چلے کیوں نہیں جاتے۔“

” کتنے اداس ہو جائے گا۔“

” مگر میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

” استغفر اللہ! ماں باپ اور بھائی بہنوں سے ملنے کو کس کا دل نہیں چاہتا ہوگا۔“

” میں نے کب کہا کہ ان سے ملنے کو دل نہیں چاہتا۔“

” ابھی کہا نہیں۔“

” وہ تو کہا ہے کہ یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔“

” کیوں۔“ یونیورسٹی، ہم جماعتوں اور پروفیسروں سے اتنا ہی پیار ہو گیا ہے کہ اب ان سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہتا۔“

” سارا دن کیا انھیں کے پاس گزارتا ہوں۔“ عثمان بڑے طنز سے بولا۔

” پھر کیوں نہیں دل چاہتا۔“

” جس کے پاس وقت کا بیشتر حصہ گزارنا ہوں کیا اس کے لیے ایسا نہیں ہو سکتا۔“

” کس کے پاس گزارتے ہو۔“ عائشہ نے سادگی سے پوچھا۔

” تمہیں یہ علم نہیں تو پھر ٹھیک ہے۔“

وہ یکایک ہی اٹھ کر چلا گیا۔ عائشہ اسے پکارتی رہ گئی مگر نہ اس نے کوئی جواب دیا نہ مڑ کر ہی دیکھا۔ شاید ناراض ہو گیا تھا۔

عائشہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اتنا بڑا ہو گیا تھا مگر بچپن ابھی نہیں گیا تھا۔

۲۵۱ کیسی معصوم سی بابتیں اور حرکتیں کرتا تھا۔ — درادرا سی بات پر دودھ  
چانا تو اس کا رونا دکاہی معمول تھا۔ اب بھی بھلا بات کیا بھولی تھی جو بھلا ہو کہ  
چلا گیا تھا۔

”میں ابھی تمہارے متعلق ہی سوچ رہی تھی“ عائشہ تیزی سے سلامتیاں پلاتے ہوئے بولی۔

”آخر ہر اک کیا ہے عثمان۔۔۔ ایہ کچھلے دو تین دن تم کہاں تھے۔ ۴۶“  
 ”جہنم میں۔“ بڑے جلیے کیٹے انداز میں بولا۔

ہو گئے۔ پھر کیسا وقت گزرا۔ ۹۔“  
 ”بہت اچھا۔“ اسی کیلئے لہجے میں بولا۔ ”تم سناؤ تمہارے یہ دن  
 کیسے گزرے۔ ۹۔“

”میں جو نہیں تھا“

”اگر تم صرف ایک گھنٹہ اور دیر سے آئے تو یہ بھی ہو جانا تھا۔“

مختصر یہی دیر بعد عثمان کا خیال ذہن سے غور ہو گیا تو وہ اپنے کام میں لگ گئی۔ بہت دن ہوئے ایک قصہ مرینا شروع کی تھی مگر عثمان آگیا تھا تو اُسے کچھ کہنے ہی نہیں دیتا تھا۔ بس یہی چاہتا کہ یا اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلے رہے یا باتیں کرتی رہے۔ اس کی غیر موجودگی میں ہی جتنی بنا لیتی۔ بنا لیتی تھی۔ دوسرے اور پھر تفسیرے دن بھی عثمان نہیں آیا۔ وہ روز ہی آتا تھا۔ اس کی کچھ ایسی عادت سی پڑ گئی تھی کہ اس کے نہ آنے سے گھر میں کچھ اداسی سی محسوس ہو رہی تھی۔ دن میں کئی بار اس کا خیال آتا مگر وہ جلد ہی پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ بستر میں بیٹھ بنائی کا کام کر رہی تھی۔  
 عثمان ہی کا میٹر شروع کیا ہوا تھا۔۔۔ ساتھ ساتھ بنتی جا رہی تھی ساتھ ساتھ اسی  
 کے متعلق سوجھتی جا رہی تھی۔

دو تین دن سے آیا نہیں — اس دن روٹھ کر گیا تھا۔ کہیں ہمیشہ کے لیے  
تو ناراض نہیں ہو گیا تھا۔ ۹

دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ اس کے دم قدم سے گھر میں خاصی جھل پھل  
اور رونق سی رہتی تھی۔ اسے ناراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسے اچانا چاہا  
ٹھک۔ ٹھک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ دروازے پر دستک ہو  
رہی تھی۔ جھلا یہ بھی کسی کے آنے کا وقت تھا۔ ہر حالت میں سوچ کر پھر

” مطلب یہ کہ چلا جاؤں —“ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

” توبہ عثمان اتم تو بہت ہی غصیلے ہو۔“ عائشہ نے جلدی سے اس کا

بازو تھام لیا۔

” انسان کو ذرا ٹھنڈا مزاج رکھنا چاہیے۔ یوں بات بے بات روٹھنا

اچھا نہیں لگتا۔“

” مجھ میں اور کیا کیا خامیاں ہیں۔ سب بتا دو۔ تاکہ میں خود کو ٹھیک

کر لوں۔“

” یہ ایک دم اپنی درستی کا خیال کیوں اگیا۔؟“

” اس لیے۔ کہ شاید پھر ہی تمہیں اچھا لگ جاؤں۔“

” یہ تمہیں کس نے کہہ دیا کہ تم مجھے اچھے نہیں لگتے۔“

” تمہارے انداز نے۔“

” غلط سوچتے ہو تم۔“ عائشہ بنحیدگی سے بولی۔

” تم مجھے کبھی بُرے نہیں لگے۔“

” سچ کہہ رہی ہو۔“ ایک دم ہی اس کے چہرے پر رونق سی آگئی۔

” تم جانتے ہی ہو میں نے جھوٹ کبھی نہیں بولا۔“

” اودہ۔“ عثمان نے بڑا لمبا سا سانس لیا۔ ”مجھے سکون اگیا۔“

” اتنی سی بات پر بے سکون تھے۔؟“

” اتنی سی نہیں نا۔“ وہ بڑے معنی خیز انداز میں بولا۔

” عائشہ۔“ ”دوسرے کمرے سے امی نے پکارا۔“

” بیٹی! عثمان سے پوچھو چاتے پیئے گا یا کھانا کھاتے گا۔“

” کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں۔“ البتہ چاتے سے انکار نہیں کر دینا لگا۔

پھر وہ اٹھ کر عائشہ کے پاس جا بیٹھا۔ وہ بناتی کئے جا رہی تھی۔ اس کے

ہاتھوں سے سلطائیاں چھین کر پرے پھینک دیں اور اس کی ناک کو پکڑ کر چہرہ

اپنی جانب گھمایا۔

” کتنی بار کہا ہے کہ جب میں آجا یا کروں تو پھر کسی اور طرف متوجہ نہ ہوا

کر دو۔ میں بڑا حاسد ہوں۔“

” سوچا تھا سو ٹیڑختم ہو جاتے۔ سر دی گز رہی جا رہی ہے۔“

” گزرنے دو۔ میرے پاس اور بہت ہیں۔“ پھر دھیرے سے بولا۔

” تم نے کہا تھا نا کہ امی ابا اتنے دنوں سے بلا رہے ہیں۔ مجھے ضرور گھر

جانا چاہیے۔“

” ہاں۔ پھر کیا جا رہے ہو۔؟“

” ہوں۔“ چار دن کی چھٹی لی ہے۔ ساتھ الوار کا دن ہو جائے گا۔

پانچ دن بہت ہیں۔“

” اچھا کیا ہے۔ والدین کے جذبات کا احترام کرنا ہی چاہیے۔“

” جھٹ تین بجے کی گاڑی سے جا رہا ہوں۔ پہلے تو سوچا تھا کہ چپکے سے

چلا جاؤں۔ پھر۔۔۔۔۔“

” پھر کیا۔؟“

” رہا نہیں گیا۔ دو دن پہلے ہی ناعہ ہو گیا تھا۔ پانچ دن وہاں رہ

آتا۔ پورے سات دن۔ امیری تو موت ہی ہو جاتی۔“

” کیوں۔؟“

”جہانے کیا ہو گیا ہے۔؟ ایک دن بھی تمہاری یہ اول جلول قسم کی باتیں سننے کو نہ ملیں تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ کھوسا گیا ہے۔“

”تو میں اول جلول باتیں کرتی ہوں۔؟“

”ویسے اتنی غفل کی بھی نہیں کرتیں۔“ شریرا نذا میں مسکرایا۔

”تو پھر سننے کیوں آئے ہو۔؟“

”پاگل ہوں۔“

امی چائے کی سینی لیے اندر آگئیں۔ عثمان خاموش ہو گیا۔

”عائشہ! تم بھی چائے پیو گی۔؟“

”پیسے کی کیوں نہیں۔؟ بنا دیں خالہ جان اور نہ یہ ہمیں بھی ہضم نہیں

ہونے دے گی۔“

”اتنی ندید رہی نہیں ہوں۔“

”میں جانتا ہوں اچھی طرح۔“ اور پھر ایک دم چونکا۔ ”یاد رہی نہیں

رہا۔ تمہارے ندید بے پن کا ثبوت تو میری جیب میں پڑا رہ گیا۔“

پتلون کی جیب میں سے ایک چھوٹا سا پیکیٹ نکال کر اس نے عائشہ کی گود

میں اچھال دیا۔ عائشہ کو چلفوزے بے حد پسند تھے۔ عثمان کو معلوم ہوا تو

اکثر اس کی جیبیں چلفوزوں سے ہی بھری رہنے لگیں۔

”اوہ۔؟“ عائشہ بے اختیار کھل اٹھی ”یقیناً کرو پچھلے دو تین دن مانہ

ہی رہا۔“

امی چائے بنا کر پھر اپنے کسی کام کے لیے باہر چلی گئی تھیں۔ عائشہ کو

چائے کا بھی ہوش نہ رہا۔ جلدی جلدی چلفوزوں کا پیکیٹ کھولنے لگی۔

”کھاؤ گے۔؟“

”انہیں چھیلنا اپنے بس کا روگ نہیں۔“ عثمان کو چلفوزے پھیلنے کا کام نہ تھا

نا پسند تھا۔ پھر کچھ سوچ کر مسکرایا۔

”البتہ اگر تم اپنے ہاتھ سے پھیل کر کھلا دو تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔“

”اور جسے اپنے سے ہی فرصت نہ ملے۔“

”پھر ہم ہی تمہاری بھی خدمت کر دیں گے۔ کسی طرح ان سے تمہارا پیٹ

اور نظر بھرے۔“

اور وہ عائشہ کی خاطر اس نا پسندیدہ کام کو بڑے شوق سے کرنے لگا۔

”رہنے دو عثمان۔؟“ عائشہ کو اس پر ترس آگیا۔ ”میں تمہارے لیے

پھیل رہی ہوں۔“

”اور میں تمہارے لیے۔“

”چلو حساب برابر۔؟“ عائشہ ہنس دی۔

”ہاں۔ یوں مل جل کر اور ایک دوسرے کی خدمت کر کے زندگی اچھی

گزرے گی۔“ عثمان نے بڑے معنی خیز انداز میں دھیرے سے کہا۔

”کیا۔؟“ عائشہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

”میرا خیال ہے تم کچھ اونچا سنتی ہو۔“

اسی لمحے امی پھر اندر آگئیں۔ عثمان کی بات شاید سن لی تھی۔ جلدی۔

اونچا تو نہیں سنتی۔ ویسے بعض وقت جان بوجھ کر یہ بے پرواہ بن جایا کرتی تھی۔

عثمان قہقہہ لگا کر ہنس دیا اور عائشہ دونوں کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

یونہی ہنسنی مذاق اور گپ شپ ہوتی رہی۔ امی چائے پی کر نماز کے لیے

پچاس عدد وری کا احساس کچھ زیادہ ہی ہو جاتا تھا۔

اس وقت بھی کچھ ایسی الجھ گئی تھی کہ بیکدم ہی جی چاہنے لگا۔ عثمان فوراً چلا جاتے۔ مگر اسے تو جانے کیا ہو گیا تھا۔ لسی کی طرح چپکا ہی جا رہا تھا۔

نجانے کیوں۔

”اے عائشہ بی بی! اٹھو مجھے خدا حافظ تو کہو۔ پورے پانچ دن کے لیے جا رہا ہوں۔“

”جا رہے ہو تو میں کیا کروں۔“ یہ کہنے کو بڑے زور سے عائشہ

کا دل چاہتا تھا مگر لحاظ کر گئی۔ اسے مان سے اس کے کہا تھا۔ اس کا مان رکھنا ہی پڑا۔ دل

کی نرمی فوراً اڑے گئی۔ جلدی سے چہرے پر سے کبل ہٹا لیا۔

”لاؤ ہاتھ طلاؤ۔“ عثمان نے اپنا ہڈا سا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا۔

عائشہ نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے اپنا نازک سا

ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اتنی گرم جوشی سے اس نے ہاتھ ملایا کہ

ہاتھ کو اپنا موڈ ٹھیک کرنا ہی پڑا۔ سب کچھ ذہن سے جھٹک اس کا سفر

خیریت سے کٹنے کی عادی۔

”شکریہ۔“ عثمان نے بڑی گہری نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے مدہم

سے لہجے میں کہا۔ ”مجھے یاد کر دو گی نا۔“

”تو مجھلا کیسے یاد نہیں کر دوں گی۔“ روز آتے ہو۔ اتنی عادی ہو گئی

ہوں تمہاری۔“ بغیر کسی بناوٹ کے بڑے خلوص سے بولی۔

”ایک دن نہ آؤ تو نگاہیں تلاش کرتی رہتی ہیں۔“

اٹھ گئیں۔ عثمان اس کے پاس ہی بیٹھا رہا۔ رات کے بارہ بج گئے۔ اسی

نماز اور وظیفے وغیرہ سے فارغ ہو کر آئیں تو عثمان کو دیکھ کر حیران سی رہ گئیں۔

”ارے! تم ابھی تک یہیں ہو اور میں سبھی جا چکے ہو گے۔“

”خالہ جان! مجھے صبح دو بجے کی گاڑی پکڑنا ہے۔ اگر سو جانا تو پھر آنکھ

نہیں کھلنا تھی۔ اس لیے سوچا کہ عائشہ کے ساتھ ذرا گپ ہانک لوں۔“

پھر سنس کر فوراً دیدہ لگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس احمق کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ سننے سننے انسان اکتا نہیں۔“

”کبھی تم مجھے پاگل کہتے ہو کبھی احمق اور کبھی کچھ۔“ عائشہ ناراضگی کے

لہجے میں بولی۔

”جو کچھ ہو، وہ تو ڈنکے کی چوٹ کہو نگا۔“

”اور اگر اتنی ہی بری ہوں تو پھر یہاں کیوں آتے ہو۔“

”میں تو اپنی خالہ کے پاس آتا ہوں۔“ عثمان زبردستی مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا

”تو پھر آئندہ مجھ سے بات بھی نہ کرنا۔“ عائشہ نے چہرے پر کبل جھینچ لیا۔

”بیٹی! وہ مذاق کر رہا ہے اور تم سنجیدہ ہوتی جا رہی ہو۔“ امی چاتے

کی پیالیاں سینٹی میں رکھ کر باورچی خانے میں جاتے جاتے بولیں۔

”ہاں۔ دیکھئے تو خالہ جان! مجھے یہ کہتی ہے کہ بہت جلد روٹھ جاتا ہوں

اور خود کو نہیں دیکھتی کہ کیا ہے۔“

”میں جو کچھ ہوں وہ جانتی ہوں۔ بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

عائشہ کبل کے اندر سے بولی۔

کبھی کبھی بغیر کسی بات کے ہی اس کا مزاج بگڑ جاتا۔ شاید لاشعور میں

۲۶۵ یہ دونوں ماں بیٹیاں بے صرری سمیٹاں — نہ کہیں انا جاننا نہ کسی سے دشمنی — جب کوئی ملاہنس کر بول لیا —

۲۶۴ کٹے گا — خدا حافظ — ا — اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

اور عائشہ تو بلکہ اپنی محرومیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہر ایک کے کام ہی آنے کی کوشش کرتی — بیٹھے بیٹھے ہی جو کچھ کسی کا سنوار سکتی کبھی دریغ نہ کرتی —

کسی کا سوئیٹر بن دیا تو کسی کا کوئی کپڑا اسی دیا — کوئی خط کھوانے آجاتی تو کوئی یونہی اپنی دکھ بھری داستان ہی سنانے بیٹھ جاتی — صرف اس لیے کہ جواب میں عائشہ سے ایسے ہمدردی اور تسلی بھرے بیٹھے بول ملتے کہ سب دکھ اور غم گویا ایک دم ہی رفع ہو جاتے — کچھ ایسا ہی احساس لے کر ہر کوئی اس کے پاس سے اٹھتا۔

پھر ایسے انسان کے لیے کیوں کوئی دل میں بغض و عناد رکھتا — ؟ یوں بھی بیچاری ایسی مجبور سی ہستی تھی کہ ہر کسی کو خیال آجاتا — اور ساتھ دالے کراہہ دار تو تھے ہی دل کے اچھے لوگ — بوقت ضرورت فوراً آمو جو بجاتے۔ اتنی رات گئے ادھر سے دروازے پر دستک ہوتی تھی — یقیناً کسی اشد ضرورت ہی کے تحت ہوتی ہوگی —

”کون ہے — ؟“ عائشہ بڑی تشویش سے پوچھنے لگی۔  
”آئی! دروازہ کھول لے — آپ کا فون آیا ہے —“ اُن کے دس گیاؤ مار لے کر پرویز کی آواز تھی۔

عائشہ کھیر گئی۔ امی نماز پڑھ رہی تھیں — دروازہ کون کھولے — ؟  
ادھر اس وقت فون — اُنجانے کس کا تھا اور کیوں کیا گیا تھا — ؟ خدا خیر می کرے۔

عثمان کے جانے سے واقعی کچھ بے رونقی سی ہو گئی تھی — وقت ہی نہیں کٹ رہا تھا — آجاتا تھا تو اس کی باتوں اور ہنسی دل لگی ہیں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا — اور اب — جیسے تھم کر رہ گیا تھا —

یوں بھی جب سے آنے لگا تھا عائشہ کو اپنی محرومی کا خیال بہت کم آتا تھا۔ دنیا جہاں کی باتیں وہ اسے سنا ڈالتا — ایک کمرے ہی میں پڑا رہنے کیوہ سے وہ بیرونی دنیا سے گویا کٹ ہی گئی تھی — جس کا اسے ہر لمحہ احساس رہتا تھا اور پھر وہ اس احساس کے بوجھ تلے دب کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ مگر اب تو یوں اسے ہر بات اور ہر واقعہ کا علم ہوتا جیسے دوسروں کی مانند وہ خود اپنی ٹانگوں سے گھوم پھر کر آتی تھی — عثمان تو جیسے اس کی ٹانگیں ہی بن گیا تھا —

دو دن گزر گئے — عثمان کے آنے میں ابھی تین دن باقی تھے — وہ انگلیوں پہ گن گن کر گزار رہی تھی —

رات کے نو ساڑھے نو کا وقت تھا — کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر امی نے اسے لمبر پر لٹا دیا تھا اور خود نماز پڑھنے چلی گئی تھیں۔

دروازے پر دستک ہوئی — عائشہ کا یہ کمرہ کونٹھی کے اس حصے کے ساتھ ملتی تھا جدھر دوسرے کراہہ دار رہتے تھے — بڑے اچھے لوگ تھے اور ان سے ان کے خاصے تعلقات تھے۔



ایک ہاتھ میں چونکا اور دوسرے میں فون اٹھائے لمبی تار میں الجھنا الجھنا اس کے پاس آ پہنچا۔

عائشہ نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر رسیو رکھ لیا۔  
”ہیلو۔۔۔!“

”کون بول رہا ہے۔“ ”دوسری طرف سے آواز آئی۔

”آپ کون ہیں اور کس سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”اوہو! تو یہ تم ہی ہو۔! ٹھیک پہچانا ہے نا عائشہ۔“

”لیکن۔۔۔“ عائشہ بے حد گھبرا گئی۔ اتنی بے تکلفی سے سب نے کون اس سے مخاطب تھا۔ ”لرزتی آواز میں بولی۔

”لیکن آپ کون ہیں۔“

”بس! دو ہی دن میں بھول گئیں۔ ارے! میں تمہارا عثمان ہوں۔“

”اوہ! عثمان! میں تمہاری آواز پہچان ہی نہیں سکی۔ فون میں سننے کا پہلا

اتفاق ہے نا۔!“

”اور مجھے بھی تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ مگر میرا جذبہ دیکھو۔ کیسے فائنٹ

پہچان لیا۔“

”سناؤ کیا حال چال ہے۔“ ”امی اور بہنیں سب ٹھیک ٹھاک ہیں نا۔“

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مگر ان کی چھوڑو تم اپنی سناؤ۔ خوش ہو۔“

”بس! جو سمجھ لو۔“

”خالہ جان کیسی ہیں۔“

”ٹھیک ہیں۔“

پرنشان ہو کر ماں کو آواز دینے ہی والی تھی کہ اوسر سے دھکا لگنے پر دروازہ کھل گیا۔

امی کی عادت تھی کہ عائشہ کو اکیلے چھوڑنے وقت اس کمرے کی چٹخنی ضرور

گرا دیا کرتیں۔ جانے کس وقت ضرورت پڑ جائے۔!

ان کی اس عادت پر عائشہ نے کئی بار نکتہ چینی بھی کی تھی۔ کئی بار خفا بھی ہوئی تھی کہ امی کیوں اسے اتنی بچی سمجھتی تھیں یا اتنی ہی گئی گزری کہ یوں غافل بن کر قی پھرتی تھیں۔

ان کا ہر وقت اتنا بھی خیال رکھنا اسے گراں گزرتا۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ دنیا کی ناکارہ ترین مخلوق تھی۔ اپنی ہستی پر سے رہا سہا اعتماد بھی اٹھنے لگتا۔ کتنی ہی بار یہ بات اس نے ماں کو سمجھائی تھی مگر وہ پھر بھی باز نہیں آتی تھیں شاید وہ اپنی مانتا سے مجبور تھیں۔ اور اس وقت اس نے ماں کی اس احتیاط کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

”اپنی! آپ کا فون آیا ہے۔ خالہ جان کہاں ہیں۔“ ”معصوم سا مسکراتا چہرہ دروازے پر کھڑا نظر آیا۔

”امی تو دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہی ہیں۔“ عائشہ تکیے سے

سر اونچا کر کے بڑے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم یوں کرو۔ جا کر فون خود رسیو کر لو۔ کہنا جو پیغام ہے دے دیں۔“

”یہاں آپ کے پاس ہی نہ لے آؤں۔“ ”لڑکے نے کہا اور عائشہ کا ہول

سنے بغیر ہی واپس بھاگ گیا۔

عائشہ نے ابھی سوچنا شروع ہی کیا تھا کہ کس کا فون ہو سکتا تھا۔ پر

”کیا کر رہی ہیں؟“

”نماز پڑھ رہی ہیں۔ اس وقت کی ان کی نماز بڑی لمبی ہوتی ہے۔“

”یعنی کہ پھر میدان بالکل صاف ہے۔“ اس کی آواز میں خوشی کی آواز  
”کیا مطلب؟“ عائشہ متحیر سی ہو گئی۔

”مطلب یہ کہ خوب باتیں ہو سکتی ہیں۔“

”تو اچھی کب باتیں کرنے سے منع کرتی ہیں؟“  
”کرتی تو نہیں۔ لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کے سامنے نہیں کی  
”کیسی باتیں؟“ عائشہ قدرے پٹائی۔

”اچھانی الحال چھوڑو اس قصے کو اور کوئی مزید اسی بات سناؤ۔“

”کیا سناؤں؟“

”کچھ۔ کچھ بولو۔ بولتی چلی جاؤ۔ جو منہ میں آئے کہتی جاؤ۔  
ان دونوں میں ہی تمہاری آواز سننے کو کان بری طرح ترس گئے۔

”ایسی ہی تو اعلیٰ میری آواز ہے۔!“

”یہ میں نہیں جانتا کہ اعلیٰ ہے یا خراب۔! بس سننا چاہتا ہوں۔  
رات کے وقت اتنی دور صرف اسی لیے آیا ہوں۔“

”کہاں سے بول رہے ہو۔؟“

”ٹیلیگراف آفس سے۔“

”اور تمہارا گھر کہاں ہے۔؟“

”یہاں سے کوئی چار میل کا فاصلہ ہو گا۔“ پھر قدرے جھنجھلا کر بولا

”کیا بے نیکی سوالات کیے جا رہی ہو۔۔۔ کوئی دھنگ کی با  
ابھی عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ ٹیلیفون آپریٹر کی آواز آئی۔ اس

۲۶۹ لڑکھ کمال کے تین منٹ پورے ہونے کی اطلاع دی تھی۔ عثمان نے جلدی  
تین منٹ اور دینے کا کہہ دیا۔

”یہ اتنا وقت اور کیوں لے لیا۔؟“ عائشہ نے پوچھا۔

”تمہاری بکواس سننے کے لیے۔“ شوخی سے بولا۔

”میری بکواس اتنی قیمتی نہیں کہ اس کے لیے اتنے پیسے خرچ کیے جائیں۔“

”یہ تو میں ہی جانتا ہوں تاکہ کتنی قیمتی ہے۔؟“

”غیر مذاق چھوڑو۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ ایسی غلط قسم کی فضول خرچی  
اچھی نہیں ہوتی۔“

”اچھا پھر ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔“ بڑے غصے میں اس نے  
ریلو پر رخ دیا۔

”عثمان! عثمان! سنو تو۔ کیا ناراض ہو گئے۔؟“

مگر اس کو کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تو جا چکا تھا۔ عائشہ ایک دو لمحے  
کے لیے ہاتھ میں پکڑے ریلوے کو دیکھتی رہی پھر افسردہ ہوتے ہوئے واپس  
رکھ دیا۔

پرویز ابھی تک فون اٹھاتے پاس کھڑا تھا۔ عثمان سے باتوں میں  
ایک طرف ہوتی کہ اسے بٹھانے کا بھی خیال نہ رہا۔ کچھ شرمندگی سے اس کی  
ہنر دکھایا۔ مگر وہ اسی پرنازاں مسکراتا ہوا واپس جا رہا تھا کہ اس نے  
اپنے کام کیا تھا۔

اس عائشہ کا جو اسے بہت پیار کیا کرتی تھی اور اکثر میٹھی میٹھی چیزیں کھانے  
کے لیے بھی دیا کرتی تھی۔ اسے اس کا احساس تک نہیں تھا کہ عائشہ نے

اتنی دیر اسے فون اٹھانے کھڑا رکھا تھا۔

نماز سے فارغ ہو کر امی اندر آئیں۔

”کس سے باتیں کر رہی تھیں۔ کیا ادھر سے کوئی آیا تھا۔؟“

”پر دیر آیا تھا۔“

”کیا کہتا تھا۔؟“

”عثمان کا فون تھا۔“

”خیر تو ہے۔؟“

”ہاں۔“

”پھر۔؟ کوئی خاص بات تھی۔؟“

”نہیں۔۔۔ ویسے ہی خیر خیریت پوچھ رہا تھا۔“

جانے کیا وجہ تھی۔؟ موڈ بڑا خراب ہو گیا تھا۔ کوئی اور بات کرنے

کو جی نہ چاہا۔۔۔ لمف کیلینج کر سونے کے لیے کروٹ بدل لی۔

”بڑا نیک لڑکا ہے۔ کتنا ہمارا خیال رکھتا ہے۔ خدا اس کا بھلا

امی اپنے آپ سے ہی باتیں کیے جا رہی تھیں۔ پھر عائشہ کو کروٹ

بدلتے دیکھا تو اٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بتی گل کر دی۔

اس رات بڑی دیر تک عائشہ کو نیند نہ آ سکی۔ یہ آخر عثمان چاہتا

تھا۔؟ اس کی باتیں اتنی عجیب و غریب ہو کر تھیں کہ گھنٹوں سو

پر بھی عائشہ کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکتا۔

اب بھلا یہ بڑا نیک کال کرنے کا کیا تک تھا۔ صرف پانچ چھ دن کے

کیا تھا۔ اس کے بعد تو پھر یہیں آنا تھا۔ خواہ مخواہ چار چھ منٹ کی باتوں کے

اتنی تکلیف اٹھانی۔ اتنی رقم خرچ کی۔! وہی اس کے کسی اور کام آتی۔

ہوٹل میں رہنے والے دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کی طرح اس کی جیب بھی

لاکڑ خالی ہی رہتی تھی۔ فون کرنے کے لیے جانے کہاں سے لیے تھے۔؟

معمول کے مطابق ادھر ادھر کے بہانے بنا کر ماں سے ہی ہتھیائے ہوں گے۔

پاک ہی تو تھا۔! اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایسی فضول خرچیوں کا فائدہ۔

یہی کچھ سوچتے سوچتے بہت رات تک اسے نیند نہ آئی۔ اگلا سارا دن

بھی بڑی کسل مندی میں گزرا۔ کوئی بھی تو کام نہ ہو سکا۔ زیادہ وقت

چپ چاپ بیٹھ کر اور عثمان کے متعلق ہی سوچ کر گزارا۔

آج اسے کتنے تین دن ہوتے تھے۔ صرف دو چھٹیاں اس کی باقی رہ گئی

تھیں۔ یعنی پرسوں شام اس نے واپس آ جانا تھا۔ یہ سوچ کر عائشہ کو اندر

ہما اندر بڑی خوشی سی محسوس ہوئی۔ صرف کل کا دن درمیان میں تھا۔

اور پھر پرسوں۔۔۔ پرسوں وہ آنے والا تھا۔

اس نے سوچا امی سے کہہ کر کوئی اچھی سی اور اس کی پسند کی چیز بچوائے

گی۔ رات کا کھانا اسے یہیں کھانے کو کہنے گی۔ پھر اس سے بہت ڈیپر

مادی باتیں کرے گی۔

اس کے والدین کی۔ بہنوں اور دوسرے رشتہ داروں کی۔ اس کے

شہر کی۔ اس کے ارد گرد رہنے والوں کی۔ اس بڑی نمائش کی باتیں اس

سے سنے گی جو اس کے شہر میں ان دنوں لگی ہوئی تھی اور جس کے متعلق عثمان نے

وعدہ کیا تھا کہ اتنی تفصیل سے اسے سب کچھ بتائے گا کہ وہ یہ سمجھنے پر مجبور

ہو جائے گی جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی تھی۔

” اداس ہو گیا تھا۔“

” اتنے سارے لوگوں میں اداس ہو گئے تھے۔“

” بعض وقت انسان بہت سارے لوگوں میں بھی اداس ہو جاتا ہے اور بعض

وقت تنہا رہ کر بھی نہیں ہوتا۔“

” ہر معاملے میں تمہاری منطق نرالی ہوتی ہے۔“

” تم نے یہ تو مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ اتنے ڈھیر سارے لوگوں میں رہ کر بھی میں

کیوں اداس ہو گیا تھا۔“

عثمان بڑی دانستگی سے بولا۔

” کیوں۔“

” تمہارے بغیر۔ صرف تمہارے لیے۔“

” اتنی ہی توشا انداز چیز ہوں۔“ عائشہ نے بے حد دکھی لہجہ میں کہا۔

” تمہیں ہزار بار کہا ہے کہ مجھ سے اس انداز میں بات نہ کیا کرو۔ کیا کمی ہے

تم میں۔“

” کوئی ڈھکی چھپی نہیں جو نظر انداز کر دی جائے۔ سبھی جانتے ہیں۔“

” اور تمہیں یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ تم میں اور بڑی خوبیاں ہیں۔ اتنی زیادہ۔“

کہ تمہاری یہ کمی ان میں یوں چھپ جاتی ہے کہ پھر ڈھونڈنے سے بھی دکھائی نہیں

دیتی۔ تم لاکھوں کرڈروں میں سے اچھی ہو۔“

” یہ آتے ہی کیا ذکر چھیڑ دیا۔“ امی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

” میں نے نہیں خالہ جان! اس احق نے چھیڑا ہے۔ دیکھ لیں کتنی بیوقوف

ہے۔ اتنے دن بعد آیا ہوں۔ بجائے اس کے کہ کوئی خاطر تواضع کرتی ایسی دل

انہیں سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

عائشہ! دیکھو تو کون آیا ہے۔!“

عائشہ نے نگاہ اٹھائی۔ امی سے دو قدم پیچھے عثمان کھڑا مسکرا رہا تھا۔

” ارے!“ وہ ششدر سی رہ گئی۔ ”تمہیں تو پرسوں آنا تھا۔!“

” کیا میرا دو دن پہلے آنا اچھا نہیں لگا۔“

عثمان مسکراتے ہوئے اس کے قریب ہی آ بیٹھا۔ امی چائے وغیرہ

کا انتظام کرنے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

” سناؤ۔ کیسی رہیں۔“ عثمان نے جھک کر بڑی گہری گہری

نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ چہرے

کیا سو بھی۔ جب میں سے دھلا دھلا یا سفید براق سادہ مال نکال کر عائشہ

کی کلائی پر پٹیا اور کس کر گرہ لگا دی۔ عائشہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

” یہ کیا کر رہے ہو۔“

” کچھ نہیں۔ ایسے ہی۔!“ بچوں ایسی معصوم سی مسکراہٹ اس

کے ہونٹوں پر پھیل رہی تھی۔

” بتاؤ نا۔ مجھے یاد کیا تھا۔“

” ہاں۔“ عائشہ اسے دیکھتے ہوئے رومال کھولنے لگی تو عثمان

نے جلدی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

” اونہوں۔ ارہنے دو۔“ عائشہ نے حیرت سے عثمان کو دیکھا۔

” لیکن عثمان! تم دو دن پہلے ہی کیسے آ گئے۔“ ابھی تو تمہاری چٹیاں

باقی تھیں۔“

دکھانے کی باتیں لے بیٹھی۔“

”خاطر تواضع ابھی ہوئی جاتی ہے۔“ احمی ہنس کر بولیں۔ ”میں نے

لامذمہ کو باز رہا جیسا ہے۔ سبھی تمہاری پسند کی چیزیں منگواتی ہیں۔“

”خالہ جان! میں نے اس خاطر تواضع کے متعلق نہیں کہا۔ میں تو اس کی زبان

کے متعلق کہہ رہا تھا۔ مجھے یہ تو اس نے کبھی بھی ڈھنگ سے بات نہیں کی۔“

پھر عائشہ کے چہرے کو گھور کر شریرا نڈاز میں مسکرایا۔

”اگر زبان اتنی کڑوی ہے تو کسی سے باتیں کرنے وقت تھوڑی سی پلینی منہ

میں رکھ لیا کرو۔ میں نے یہ نسخہ خواتین کے کسی ماہنامے میں پڑھا تھا۔ تم

بھی اس سے فائدہ حاصل کر سکتی ہو۔“

احمی اور عائشہ بے اختیار ہنس دیں۔

”سچی عثمان! تمہاری ایسی ہی زندگی سے بھرپور باتیں سننے کے لیے میں

اداس ہو گئی تھی۔“

احمی پرلے کونے میں میز پر سے کچھ اٹھا رہی تھیں۔ عثمان نے ان کی طرف

دیکھتے ہوئے عائشہ کے قریب جھک کر دھیرے سے پوچھا۔ ”بس! صرف ا

”اس سے بڑی اور کیا خوبی کسی انسان میں ہو سکتی ہے جو میرے جیسی اوتھورا

زندگی رکھنے والے کو بھی زندہ رہنے پر مجبور کر دے۔“

”چلو اتنا تو فائدہ ہوا میرا۔“ عثمان نے دزدیدہ نگاہوں سے عائشہ کو

دیکھتے ہوئے اٹھ کر سامنے والی میز پر پڑا بیگٹ اٹھالیا۔

”یہ دیکھو تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔“

اتنی پیاری سفید اونٹنی کہ عائشہ دیکھتے ہی پھرک اٹھی۔ انڈوں سے

لگے نئے نئے چوزوں کی مانند نرم نرم اور ملائم ملائم اُون کے گولے تھے۔

مائتہ اٹھا کر رخساروں پر پھیرنے لگی۔

”پنہ آتی۔“ عثمان نے اس کی اس حرکت کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا

”ہاں۔ بہت۔“ اور پھر چونکی۔ ”مگر۔ یہ تم کہاں سے لے آئے؟“

”بازار سے۔“

”اتنی قیمتی۔!“

”پھر کیا ہے۔“

”مگر اتنی بڑی رقم تمہارے لیے کہاں سے آگئی۔“

”جانے کہاں سے۔ تمہارے لیے خود بخود آگئی۔ اب اس کا ایک بڑا

ہی خوبصورت نمونہ بنانا۔ ایسا۔ ایسا۔“ کچھ سوچنے لگا۔

”کیسا۔“ عائشہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”اپنے جیسا پیارا۔“ اور عائشہ جھینپ گئی۔

”چائے تھنڈی ہو رہی ہے۔“ موضوع بدلنے کے لیے اس کی توجہ

ادھر مبذول کرادی۔

اس رات عثمان ہوشل بھی نہیں گیا۔ اس کی دودن کی ابھی چھٹی باقی

تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ دودن یہیں رہ کر گزارے گا۔ بھلا کسی کو

کیا اعتراض ہو سکتا تھا!

رات کو کوئی ایک دو بجے، وہ بھی بڑی مشکل سے کہہ کہہ کرامی نے اسے

سونے کے لیے جھبھا۔ ورنہ وہ تو پچھلے تین دن کی کسر نکالنے پر تلا بیٹھا تھا۔

ماری رات جاگنے کا ارادہ تھا۔ جس وقت سے آیا تھا سلسل باتیں کیے جا رہا

تھا۔ نہ وہ کرتے تھکا تھا اور نہ عائشہ سوتے!

رات کو دیر سے سونا اور صبح دیر سے اٹھنا تو اس کا ہمیشہ کا معمول تھا۔  
 دس بجے تک پڑا سوتا رہا۔ امی نے دو تین بار ناشتہ تیار کیا مگر وہ جاگنا  
 آخر تھک ہار کر وہ اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ گیارہ  
 کے قریب اپنے آپ ہی نیند کھلی تو اٹھ کر سیدھا عائشہ کے کمرے میں چلا آیا۔  
 عائشہ کھڑکی کے سامنے کرسی ڈالے بیٹھی کوئی تصویر بنا رہی تھی پیچھے سے  
 آکر اس کے ہاتھ سے برش چھینا اور رنگوں کی چھوٹی سی ٹرے میں رکھ دیا۔  
 پھر اس کی کرسی کا رخ اپنی جانب موڑتے ہوئے بولا۔

”عثمان آگیا ہے عائشہ! اب اپنے سب کام چھوڑ دو۔“  
 ”تمہاری یہ عادت بڑی ہی خراب ہے عثمان! کہ تم جب آ جاؤ تو کوئی کام  
 نہیں کرنے دیتے۔“

”میرے علاوہ تمہاری توجہ کسی اور طرف مبذول ہو۔ یہ مجھ سے  
 پروا نہایت نہیں ہو سکتا۔“  
 ”آخر کیوں؟“

”بس میری کمزوری سمجھ لو۔“ اس کی کرسی کے قریب والی چارپائی پر  
 لیٹ کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

”جھوک لگ رہی ہے کوئی ناشتہ واشتہ نہیں ملے گا۔“  
 ”وہ سامنے ٹرے پڑا ہوا ہے۔ دیکھ لو اگر کسی کام کا ہے تو شوق سے مہم  
 کر جاؤ۔“ عائشہ نے ذرا نیکی سے لہجے میں کہا۔

”اس وقت مزاج یا رکچہ گرم گرم ہے شاید۔“ عثمان نے جھک  
 کر ٹرے پر چلائے اس کے منحنی بھرے پھرے کو دیکھا۔

۲۷۵ ”تین بار امی نے ناشتہ بنایا ہے۔ یقیناً پھر ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔“ عثمان اٹھ کر ناشتے کی سینی دیں لے آیا۔  
 ”ہم ملنگ قسم کے انسان ہیں۔ بس چائے تمہارے مزاج کی طرح گرم  
 گرم مل جائے۔ اور کسی چیز کی پروا نہ نہیں۔“  
 عائشہ کے آگے مینر گھسیٹ کر ٹرے رکھ دیا۔  
 ”لو بھی ذرا اپنے ان خوبصورت اور مبارک ہاتھوں سے ہمیں ناشتہ تو  
 کراؤ۔“

”جناب کے اپنے ہاتھ کہاں گئے ہیں۔؟“  
 ”پاس ہی ہیں۔ لیکن یہ والے بھی غیر نہیں۔“ عائشہ کے ہاتھوں کو  
 انگلی سے چھیڑتے ہوئے بولا۔ ”یہ اپنوں سے بھی زیادہ اپنے ہیں۔  
 لوشا باش اتو سر پر مھن لگا۔“  
 ”لیکن میرے تو ہاتھ خراب ہیں۔ یہ دیکھو رنگ لگا ہوا ہے۔“  
 ”یہیں پانی لا کر ابھی دھلا دیتا ہوں۔“  
 ”اتنی تکلیف جو کرو گے۔ اس سے بہتر ہے خود ہی لگا کر کھا لو۔“  
 ”نہیں۔“

عجب ضدی انسان تھا۔ اٹھ کر چلپی اور پانی لے آیا پچھتی چلاتی  
 کے زبردستی ہاتھ دھلائے۔ پھر خود ہی ٹولے سے جلدی جلدی خشک  
 کرنے کے بعد مھن اور توسوں والی پٹی اس کے آگے رکھ دیں۔  
 اپنی ادھوری تصویر کی جانب بڑی حسرت سے دیکھتے ہوئے عائشہ جلدی  
 جلدی توسوں پر مھن لگانے لگی۔

” اودھ گیا دیکھ رہی ہو۔ دھیان سے۔ کہیں انگلیاں نہ کاٹ لینا۔ “  
 ” کٹ چاتیں پھر کیا ہے۔ مجھے اپنی ہستی اتنی عزیز نہیں جو سنبھال سنبھال کر رکھوں۔ “

” تمہیں نہ ہو۔ مجھے تو ہے۔ “

عائشہ نے چونک کر عثمان کی جانب دیکھا۔ وہ بڑے غور سے اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ گھبرا کر، سٹپا کر اس نے جلدی سے مکھن لگا توں اور تلے ہوتے انڈے کی پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔

” یوں نہیں۔ آج سارا ناشتہ تم ہی مجھے کراؤ گی۔ “ یہ کہتے ہوئے عثمان نے بڑا سامنے کھول دیا۔

” بڑے ہی ہڈ حرام ہو۔ “

” اس میں ہڈ حرامی کی کیا بات ہے۔ یہ دیکھو میں نے ابھی تک ہاتھ نہیں دھوئے۔ “

” اتنا کچھ کر کے میرے جو دھلائے تھے۔ اس کی بجائے اپنے دھو لیتے۔ “

عائشہ نے اس کے منہ میں توں کا بڑا سا نوالہ دیتے ہوئے کہا۔  
 ” ان ہاتھوں سے کھائے ہیں جو مزہ ہے وہ انہوں سے بھی نہ آتا۔ “  
 عثمان بڑے مزے سے کھانے لگا۔

” ذرا اپنی طازمہ کو آواز دو کہ گرم گرم چائے لاتے۔ آج وہ بھی تنہا ہے ہاتھ سے پیو نہ گا۔ “

” اور مجھے تو جیسے اپنا کوئی کام ہی نہیں۔ “

” کیا کام ہے۔ “

” یہ تصویر مکمل کر رہی ہے۔ “

” یہ پھر بھی ہوتی رہے گی۔ “

” پھر بھی نہیں۔ آج ہونا ضروری ہے۔ “

” کیوں۔ “

” ساتھ والے جو چچا ہیں نا۔ پرویز کے ابا۔ انہوں نے کسی دوکاندار سے

بات کی ہے۔ وہ میری تصویریں اچھے داموں بیچ دیا کرے گا۔ “

” کیا۔ “ عثمان ثابت کا ثابت نوالہ نگلے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

” تم تصویریں بنا بنا کر بیچا کر دو گی۔ “

” کیا حرج۔ ہر انسان کو چاہیے کہ اپنا بوجھ خود اٹھائے۔ “

عائشہ دیکھ رہی تھی میں بولی۔

” میں اور کچھ نہیں کر سکتی۔ یوں گھر بیٹھے اگر کوئی روزی کا فریہ بن جائے

تو کیا بڑا ہے۔ ہر ایک بڑھی مال کے ناتواں کندھوں کا بھاری بوجھ بنی

رہنچی۔ “ آنکھوں میں آنسو لیے اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

” اور پھر کیا پتہ کہ میری زندگی کتنی ہے۔ شاید بہت طویل ہو۔ اس

کے لیے کوئی نہ کوئی بندوبست ہونا ہی چاہیے۔ “

” میرے ہوتے ہوئے تم یہ کہہ رہی ہو عائشہ ! “

” مال۔ اور اپنی امی کے ہوتے ہوئے بھی کہہ رہی ہوں۔ انسان کو

حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ نہ بھینٹہ میری مال میرے پاس رہ سکتی ہے اور نہ

ہی تم میرا عمر بھر کا بوجھ اٹھا سکو گے۔ “

” کیوں نہیں۔ “

کیا کروں میرے لیے۔؟ کوئی ماہوار وظیفہ مقرر کر دوں۔؟ کاہل ہوا  
سے بولی۔۔۔

”ماہوار وظیفے کا کیا مطلب۔؟ میرا سب کچھ صرف تمہارے لیے ہوگا۔“  
”اٹنا ایشیا۔!“ عائشہ زور سے ہنس پڑی۔

”میرے جذبات کا مذاق نہ اڑاؤ عائشہ۔!“ عثمان بے حد سنجیدہ تھا۔  
”میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔“

”اور عثمان! میں بھی سچ کہہ رہی ہوں کہ اسی کی زندگی تک ہی ماموں بہادی  
کفالت کریں گے۔ اس کے اہل میں کسی کا احسان نہیں لونگی۔ پھر مجھے اپنے  
لیے ایک پناہ گاہ، ایک گھر کی ضرورت ہوگی۔ اور گھر اخراجات سے چلتا  
ہے اور اخراجات آمدن سے۔!“

”کہہ جو رہا ہوں کہ میں تمہیں گھر دوں گا۔ پھر اتنی دوزخ سوچنے کی تمہیں  
کیا ضرورت ہے۔؟“

”تم مجھے گھر دو گے۔؟“ عائشہ بے اختیار قہقہہ لگا اٹھی مگر ساتھ ہی اس  
کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

”گھر گھر والی کا ہونا ہے عثمان! تم مجھے کیسے دے دو گے۔؟“  
”اور جو میرے گھر والی نہیں ہوتیں۔“ عثمان اس کے قریب بیٹھتے  
ہوئے بہت دھیرے سے بولا۔

”پھر تو سب کچھ تمہارا ہی ہوگا۔ گھر بھی اُد میں بھی۔ صرف اُد  
صرف تمہارا۔!“

”عثمان کبھی تو تک کی بات کیا کرو۔“ عائشہ کو پھر ہنسی آگئی۔

”تم مذاق سمجھ رہی ہو مگر میں اپنی پوری زندگی میں اتنا سنجیدہ کبھی نہیں ہوا  
تھا جتنا اس وقت ہوں۔“  
”عثمان۔!“

اس نے تو بڑے اطمینان اور سکون سے یہ کہہ دیا تھا مگر عائشہ بری طرح سٹپٹا  
گئی۔ یہ اس نے کیسی انہونی سی بات کر دی تھی۔ ایسا لا باالی پن بھی کیا ہوا  
کہ بغیر سوچے سمجھے بات منہ سے نکال دی جائے۔ یہ کس طرح ممکن تھا۔؟  
ایک لڑکی، گھر والی اس وقت بنتی ہے جب اس کی شادی ہو اور شادی  
میں مع سلامت اور تندرست لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ بھلا اس جیسی بغیر ٹانگوں  
کی لڑکی کی شادی۔! یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے  
بھی نہیں۔

اور عثمان نے کیسے ایک دم ہی کہہ دیا تھا۔ اس کا پاگل پن ہی تو تھا۔!  
”اگر واقعی تم سنجیدہ ہو تو آئندہ ایسی بات کبھی منہ سے نہ نکالنا۔“ عائشہ  
نے سختی بھری سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں۔؟ کیوں نہ ایسی بات منہ سے نکالوں۔؟“ عثمان تند ہلچے  
پل بولا۔

”وہی بات کیا کرتے ہیں جو ممکن ہو۔!“  
”آخر اس میں ناممکن کیا ہے۔؟“ عثمان جھنجھلا اٹھا۔

”میری حالت کا تمہیں اچھی طرح علم بھی ہے۔ پھر بھی پوچھ رہے ہو کہ  
”امکن کیا ہے۔؟“

”ہاں۔ تمہاری حالت کو اچھی طرح جاننے کے باوجود کہہ رہا ہوں۔“



کیا ہے نہیں۔؟“ عثمان بڑے اطمینان سے بولا۔

”دیکھو عثمان! ایسی باتیں کہہ گئے مجھے مزید دکھی نہ کرو۔“ عائشہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”سنو عائشہ! تم یہ خیالی کبھی بھی دل میں نہ لایا کرو کہ تم دوسرے انسانوں سے مختلف ہو۔ سوچو تو سہی۔ اگر میری شادی کسی اچھی بھلی تندرست لڑکی سے ہو جائے اور پھر شادی کے بعد اسے ایسا حادثہ پیش آجائے۔

پھر۔؟ پھر کیا ہیں اسے چھوڑ دوں گا۔؟“ عثمان بے حد سنجیدہ تھا۔

”یا اگر ہماری شادی ہو جائے اور مجھے کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے تو بے یقین ہے کہ تم بھی مجھے چھوڑ نہ دو گی۔ یہ بالکل سچی باتیں ہوتی ہیں۔“

عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ سوچتی رہی اور چپکے چپکے روتی رہا عثمان نے بڑھ کر دھال سے اس کے آنسو پونچھے۔

”تم رورہی ہو۔ میں کوئی نہیں دکھ دینے کے لیے یہ قدم اٹھا رہا ہوں پاگل لڑکی! میرا جو چاہتا ہے کہ تمہاری بھولی دنیا جہاں کی خوشیوں۔“

بھروسوں۔“

”میں اپنی خوشیوں کی خاطر نہیں کبھی بھی یہ قربانی نہیں دینے دوں گی۔“ قربانی۔ کونسی قربانی۔؟“ عثمان نے حیرت سے اسے گھرا۔

”مجھے جیسی لڑکی کے ساتھ پوری زندگی وابستہ کر لینا قربانی نہیں تو کیا ہے۔؟“

”پھر وہی بات۔ ابھی اتنا لمبا چوڑا لیکچر دیا ہے۔ خیر وار! آئندہ بات زبان سے نہ نکالنا۔ میں اتنا عظیم نہیں ہوں کہ کسی کے لیے کوئی ایثار کر

میں ایک عام انسان ہوں۔ مجھے تم سے پیار ہے عائشہ! اور اپنی اسی محبت کی تسکین

کی خاطر میں نہیں اپنا ناچا ہوتا ہوں۔“

یہ انکشاف عائشہ کے لیے اور بھی حیران کن تھا۔ عثمان جیسا صحت مند، خوبرو اور دلکش شخصیت والا نوجوان عائشہ جیسی اپنا بچ ہستی سے کس طرح بھٹ کر

سکتا تھا۔؟ کس طرح۔؟

تیس چوبیس سال کے قریب اس کی عمر ہو گئی تھی۔ آج تک کبھی بھی تو کسی نے اس کے متعلق یوں نہیں سوچا تھا۔ کبھی بھی تو کسی کے دل میں اس کیلئے

ایسے سین جذبات نہیں ابھرتے تھے۔

خاندان میں بہت سارے لڑکے تھے۔ نہ کسی لڑکے نے اس کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور نہ ہی کسی لڑکے کی ماں نے اسے

اپنی بہو بنانے کے متعلق سوچا تھا۔

جب تک یہ حادثہ نہیں ہوا تھا خاندان کے تقریباً ہر لڑکے کی ماں نے وقتاً فوقتاً عائشہ کی ماں کے کان میں یہ بات کہہ ڈالی ہوتی تھی کہ عائشہ کو وہ اپنی

بہو بنانے کی خواہش مند تھیں۔ اور یہ اس وقت کی بات تھی جب عائشہ ابھی صرف گیارہ بارہ سال ہی کی تھی۔

گھر۔ پھر جب اسے یہ اندہناک حادثہ پیش آیا تو کسی نے بھروسے

سے بھی کبھی اپنی ہی ہوتی بات کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سب

کے بیٹے جوان ہوتے رہے اور جلد جلد لڑکیاں تلاش کر کر کے ان کی منگیاں

اور شادیاں ہوتی رہیں۔

عائشہ کی ماں نے بھی کسی کو کسی کا وعدہ یا دہ نہیں دلایا۔ کس منہ سے دلائیں۔

ان کا اپنا ہی مال ناقص اور عیب دار ہو گیا تھا۔ وہ کسی کی بے عیب اولاد کے سر کس طرح منڈھ دیتیں۔ یہ ان کے کندھوں کا بوجھ تھا اور وہ خود ہی اٹھانا چاہتی تھیں۔

اور ماں کی سوچوں کے ساتھ ساتھ عائشہ کی سوچیں بھی ڈھلتی گئیں۔ ماں بوڑھی تھی اس لیے اس کے کندھوں سے اپنا بوجھ اٹھا کر اپنی زندگی خود بنانے کے عزم و مقصد سے مضبوط تر ہوتے گئے۔

بہت روز وہ یہ سوچا کی کہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ کس طرح پہنانے اس کے لیے تو سب سے پہلے اسے خود کفیل ہونا تھا۔ مگر۔ وہ کہیں آبا نہیں سکتی تھی کہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت ہی کر لیتی۔ البتہ گھر میں بیٹھ کر کچھ کر سکتی تھی۔ کیا کرتی؟

سلائی کڑھانی کر کے کچھ کمانے کی کوشش کرتی تو وہ ماں نے نہیں کرنے دینا تھا۔ کیونکہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں اس میں کسی لڑکی یا عورت کا اس طرح کما کر معیوب سمجھا جاتا تھا۔ خاندان کے لوگوں کے تو یاتین بنانا کر ان کا جینا حرام کر دینا تھا۔

اسے اپنی تو کوئی پرواہ نہیں تھی مگر ماں کی عزت اور مرحوم باپ کے نام کو بڑے لگنے کے خیال نے اس ارادہ سے باز رکھا۔ پھر۔ پھر کیا کرے؟

انھیں سوچوں نے اسے بہت عرصہ پریشان رکھا اور پھر ایک دن اس کو اپنی پریشانی کا مداوا کرنے کی راہ سوچ گئی۔

عائشہ چپ چاپ کھڑکی میں بیٹھی سڑک پر آنے جانے والوں کو بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی۔ پرویز کی امی ادھر آگئیں۔

عائشہ! ان کی آواز فوراً سرت سے کہلبادی تھی۔ یہ دیکھو۔

ایک بڑی خوبصورت ٹیکسٹ ان کے ہاتھ میں تھی۔ عائشہ غور سے دیکھنے لگی۔ یہ آپ نے کہاں سے لی؟

پہلے یہ بتاؤ کہ کیسی ہے؟

بے حد پیادی۔! عائشہ نے پورے خلوص سے کہا۔

گول کمر سے میں سجانے کے لیے خریدی ہے۔

کتنے کی؟

دو سو روپے کی۔

دو سو روپے کی؟ عائشہ متحیر سی ہو گئی۔ اتنی زیادہ قیمت! یہ فوٹو گراف نہیں ہے عائشہ! یہ دیکھو۔ ہاتھ کی بنی ہوئی ہے۔

وہ عائشہ کے قریب کرتے ہوئے اس کی خوبصورتی اور فن کی باریکیاں اسے سمجھانے لگیں۔

اس لحاظ سے تو دو سو روپے میں کافی سستی ہے۔ دراصل وہ دکاندار پرویز کے ابو کا واقف ہے۔ ورنہ اس کی قیمت تو تین چار سو بھی زیادہ نہیں۔

پینٹنگ دکھا کر، عائشہ کی پسندیدگی پا کر وہ تو خوشی خوشی واپس چلی گئیں اور عائشہ کی سوچوں کو ایک نئی راہ مل گئی۔

اگر کوشش کرے تو کیا وہ اس فن کو نہیں سیکھ سکتی؟ وہ بھی تو کسی انسان کے ہاتھ ہی کی بنائی ہوئی تھی۔ اور یہ فن اس کی معاشی فکروں کو بھی دور کر سکتا تھا۔ دوسرے ہی دن ماں سے کہہ کر اس نے مقصدی سے متعلق کچھ کتابیں گوائیں اور ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ شروع شروع میں اس نے فیل سے خاکے بنائے

جو اس کی توقع سے کچھ بہتر ہی بن گئے۔ پھر اس نے برش اور پانی والے  
رنگے منگو اکہ کاغذوں پر پریکٹس شروع کر دی۔

عنفت اور ہمت سے انسان کیا نہیں کر سکتا۔ عائشہ کو ایسی لگن لگی کہ چند  
ہفتوں میں ہی بغیر کسی اسناد سے سیکھے اور تربیت لیے ہی چھوٹی چھوٹی آئین  
پینٹنگ بنانے لگی۔ کچھ عرصہ بعد وہ بہت بڑا اچھا دیا تھا۔ وہ جب کسی سے  
ایک چیز چھین لیتا ہے تو دوسری طرف سے اس کی کسر ضرور نکال دیتا ہے۔ وہ  
بڑا منصف ہے۔ اور عائشہ کو وہ سن اس نے اتنا خوبصورت دیا تھا کہ بہت جلد  
پرویو کی امی جو پینٹنگ خرید کر لاتی تھیں اکثر و بیشتر اسے منگو اکہ دیکھتی رہتی۔ یہ  
اس نے سوچ لیا تھا کہ جب اس معیار کی بنائے گی تو پھر کسی نہ کسی سے کہہ کر اسے  
فروخت کرنے کا بندوبست کرے گی۔ فی الحال اس نے ماں سے بھی کوئی بات  
نہیں کی تھی کہ وہ کیوں یہ سب کر رہی تھی۔

ادریوں اس نے اپنی زندگی کا دھارا اس سمت موڑ لیا تھا۔ اپنی پوری زندگی  
کا پلان اس نے بنالیا تھا۔ شادی کے متعلق تو اس نے کبھی جھوٹے سبب بھی نہیں  
سوچا تھا۔ یہ عثمان نے کیسی بات کر دی تھی۔ یہ اس کی کس دھکتی رگ  
کو چھیر دیا تھا اس نے۔

”کیا سوچ رہی ہو۔“ عثمان بڑے والہانہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔  
”مجھے کچھ نہیں سوچنا۔ بس تم آئندہ ایسی بات نہ کرنا۔“ عائشہ تلخی۔  
”اپنی زبان تم نے شک بند رکھو مگر میری پرکیوں پابندی لگاتی ہو۔ میں تو  
اپنے دل کی بات ضرور کہوں گا اور اعلیٰ الاعلان کہوں گا۔ کوئی گناہ کی بات نہیں  
بالکل جائز اور مناسب ہے۔“  
”اوہ عثمان۔“ ابا خدا کے لیے مجھے میری مجبور می کامزید احساس نہ دلاؤ۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔“ کیا مجبور می مجبور می کیے جا رہی ہو۔“  
اور اسی لمحے امی اندر آ گئیں۔ عثمان اس کے پاس سے اٹھ کر اپنی جگہ پر  
اٹھا۔ وہ بالکل پر سکون اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ عائشہ کچھ پریشان سی تھی  
کیا بات ہے عائشہ۔“ امی نے عورت سے اس کے چہرے اور کم اورد  
انکھوں کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھر کر پوچھا۔

”کہیں پھر دورہ تو نہیں پڑا ہوا۔“ اسے پریشان دیکھ کر امی بھی کچھ رنجیدہ  
سی ہو گئی تھیں۔

”نہیں خالہ جان! آپ غلط سمجھیں۔ آج کا دورہ دوسری نوعیت کا ہے۔“  
عثمان مسکراتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولا۔

”کس نوعیت کا۔“ امی نے براہ راست عثمان سے ہی پوچھ لیا۔  
جانے عثمان کیا بتانے والا تھا۔ عائشہ نے گھبرا کر نگاہ اٹھائی۔ وہ اسی  
کی جانب دیکھ کر کچھ کہنے لگا تھا۔ عائشہ نے بڑی احتیاط سے ماں سے چھپا  
کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔  
”عثمان! تم نے مجھے نہیں بتایا کہ عائشہ کو کیا ہوا ہے۔“ امی نے پھر پوچھا  
عائشہ کی ذرا سی پریشانی بھی انھیں بڑی طرح تڑپا دیا کرتی تھی۔  
عثمان مسکرایا۔

خالہ جان! عائشہ کا فلم دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے مگر آپ کے ڈر سے کہہ  
ہیں سکتی۔ رور وکر میری منیتیں کر رہی تھی کہ آپ سے اجازت دلا دوں۔“  
عثمان نے کیسے اپنے آپ ہی گھڑی تھی۔ عائشہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔  
اس نے جلدی سے دوسری جانب رخ پھیر لیا۔

” تو تو اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ میں نے کبھی تمہاری کوئی خواہش رد بھی کی ہے۔ تمہارا دل چاہتا ہے تو سو بار جاؤ مگر۔“ اور پھر اسی چپ سی ہر گتیں۔ عثمان شاید ان کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ جھٹ سے بولا۔

” آپ پریشان نہ ہوں۔ اس کو لے جانے کا ذمہ میرا۔ بس آپ کی اجازت چاہتی تھی۔“ پھر عائشہ کی جانب بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

” جب تک اپنی زندگی ہے۔ انشاء اللہ اسے کبھی کوئی احساس نہیں ہوئے دو لگا۔ یہ غلیں بھی دیکھا کرے گی۔ یہ شاپنگ بھی کیا کرے گی۔ یہ پیکر بھی منایا کرے گی۔ عائشہ کی ہر خواہش پوری ہوگی۔ انشاء اللہ۔“

کی انکو بھی سہی چمک اس کے چہرے پر تھی۔

” خدا تمہیں سلامت رکھے عثمان! کتنا تمہیں ہمارا خیال ہے۔“ امی اسے دعائیں دیتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

” یہ تم نے کیا کہہ دیا عثمان۔“ امی کے جاتے ہی عائشہ جلدی سے اب کیا ہوگا۔“

” ہونا کیا ہے۔“ عثمان لا پرواہی سے کہنے لگا۔ ”آج شام عائشہ اور عثمان فلم دیکھنے جائیں گے۔“

” مگر۔ مگر۔“ عائشہ گھبرا گھبرا کر آبدیدہ لگا ہوں سے اپنی ٹانگوں دیکھنے لگی۔ ”میں کیسے جاسکتی ہوں۔“

” کہا جو کہ یہ ذمہ داری میری۔!“

” نہیں۔ نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔“

” سنو۔“ عثمان نے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بڑی نرمی سے کہ

” بس مجھے اتنا بتا دو کہ فلم دیکھنے کو تمہارا دل چاہتا ہے نا۔“ جانے میرا کیا کیا کرنے کو دل چاہتا ہے۔“ عائشہ بڑے کرب سے بولی۔ مگر۔ کچھ نہیں سکتی۔“

” کیوں نہیں کر سکتیں۔ سب کچھ ہو سکتا ہے عائشہ! سب کچھ۔ بس اذرا ہمت کرو۔ اپنے میں اعتماد پیدا کرو۔ پھر تمہاری کوئی کمی نہیں ہے گی۔“

” اودہ عثمان! خدا کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

” کیوں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں۔ جو قدم بڑھایا ہے وہ اب مجھے ترک بھی نہیں ہٹے گا۔ کبھی بھی نہیں۔ لہذا آج سے تم بس عثمان کے نرم و نرم پریہو۔“

” خواہ مخواہ ہی۔“ آپ ہی آپ عثمان اس کا حق دار بن بیٹھا تھا۔ عائشہ انسی آگئی۔

” یہ دانتوں کی نمائش کیوں لگا دی۔“ میں کوئی غلط نہیں کہہ رہا۔ عثمان لڑبان سے ایک بار جو نکل جاتا ہے وہ ہمیشہ پورا ہو کے رہتا ہے۔ مرو کی زبان رکھتا ہوں منہ میں۔! سمجھ آتی۔“ عائشہ کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

” شام چھ بجے تیار رہنا۔ ہم فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔“ عثمان لا پرواہی سے گنگنا تا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور عائشہ دھک دھک کرتے دل کو لیے بیٹھی پریشان ہوتی رہی۔

آخر وہ کس قسم کا انسان تھا۔ لا پرواہ اور لاابالی۔! مگر اتنا پُر خلوص

اور اتنا گہرا۔۔۔ اس کی ہمدردی میں اتنا بڑا قدم اٹھالے گا۔ یہ حالت  
کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

بہر حال عثمان کا خلوص اور ہمدردی ایک طرف مگر اسے اس کے انظار  
مجھ سے جذبات سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ اپنی تو اس کی  
زندگی جیسی تھی اس کا اپنا اندر۔۔۔ مگر اس نے سوچ لیا کہ وہ عثمان کی زندگی  
کبھی تباہ نہ ہونے دے۔

عثمان اچھے کھاتے پیتے کھرانے کا چشتم و چراغ تھا۔ ایم۔ اے میں پڑھ  
رہا تھا۔ تعلیمی لحاظ سے بھی کسی سے کم نہ تھا۔ وجہ تھی خدا نے ایسی دنا  
تھی کہ سینکڑوں میں اس کی شخصیت نمایاں ہوتی تھی۔

اسے تو اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی تھی۔ امیر خاندان کی۔ اعلیٰ تعلیم  
اور خوبصورت۔ مگر شکمہ ہر طرح مشکل۔۔۔ پھر یہ ادھوری سی حالت کم  
شمار قطار میں تھی۔!!

یہ تو سراسر عثمان کا باگل بن تھا اور یا پھر بچپن۔ کہ وہ شغلے کو بچنے لگتا  
کر رہا تھا اور اسے یہ علم نہیں تھا کہ وہ اسے جلا ڈالے گا۔

عائشہ نے بہت سوچ بچار کے بعد دل سے یہ فیصلہ کر لیا کہ دھیرے  
ہولے ہولے سمجھا سچا کر عثمان کو اس کی اس بے جا ضد سے باز کر لے گی۔  
عثمان اس کی بات بڑی مانتا تھا۔ یہ عائشہ کو معلوم تھا۔ اور سمجھاتا  
سے وہ ایک نہ ایک دن یقیناً اسے راہ راست پر لے آئے گی۔ اس  
اسے یقین تھا۔

وعدے کے مطابق عثمان عین فلم کے وقت ٹیکسی لے کر گیا۔

۲۹۱ "چلو عائشہ! ٹیکسی آگئی۔" عثمان باہر سے ہی چلاتا ہوا کہ رے میں  
داخل ہوا۔

"گم۔ گم۔" عائشہ لیٹی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی مگر بڑا کر اٹھ  
بیٹھی۔ "میں تو نہیں جا رہی۔"

"کیوں۔" عثمان نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔  
"لیکن میں جا کیسے سکتی ہوں۔"

"ابھی بتاتا ہوں۔"

اور عائشہ جیٹتی ہی رہ گئی مگر عثمان نے ایک نہ سنی۔ اسے بازوؤں میں اٹھا،  
لیٹا کر ٹیکسی میں بٹھا دیا۔

"ایسے۔" اس کی ٹانگوں پر کبل اور ہاتھ ہوتے ہوئے مسکرا کر اس کی آنکھوں  
میں جھانکا۔

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ عثمان کے منہ سے جو بات نکل جائے وہ ٹل  
نہیں سکتی۔ اس کے لیے راہیں بھی ہموار کر فی جانتا ہوں۔ مرد ہوں مرد!"  
"لیکن امی سے تو پوچھا نہیں۔"

"نکد نہ کرو۔ ان کی اجازت کے بغیر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ میں  
ان سے پوچھ چکا ہوں۔"

پھر خود بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ عائشہ بے حد گھبراتی ہوئی تھی۔  
"چلو جی! غفل سینما میں چلو۔" ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت دیتے ہوئے  
عثمان نے عائشہ کا لہزنا کانپنا ہاتھ مقام لیا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں بُرا نہیں ہوں۔ دیکھ لینا میرے ساتھ رہ کر تم

عائشہ تصور سے ہی سرخ ہوئی جا رہی تھی۔

”میں کیسے لوگوں کی نگاہوں کا مقابلہ کر سکتی تھی؟“

”آنکھیں بند کر لینا۔“ عثمان نے بڑی آسان ترکیب بتا دی۔

دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس دیتے۔

ٹیکسی رکی۔ عثمان اسے بڑی سہولت سے اٹھا کر ہال میں لے گیا۔

جہاں جہاں سے گزرا لوگ ٹھٹھک ٹھٹھک کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے

رہے مگر عثمان نے ذرا پرواہ نہ کی۔

عائشہ چونکی۔ کیا واقعی عثمان کو اس سے اتنی زیادہ محبت تھی؟

اس اپنا بچہ ہستی سے۔ عثمان کی عظمت کے آگے عقیدت سے اس کا سر

جھک گیا۔

ہال کی بتیاں گل ہوتیں۔ چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔

پرنیوز ریل چلنے لگی۔ عثمان اس کی جانب جھک آیا۔ دھیرے سے اس

کا ہاتھ تھاما اور پردے پر دیکھنے کی بجائے اس مدھم مدھم سی روشنی میں عائشہ

کے معصوم سے پرکشش چہرے کو بڑے پیار اور وارفتگی سے دیکھنے لگا۔

”عائشہ! تجھے اتنا بتا دو کہ مجھ سے نہیں پیار ہے یا نہیں۔؟ آخر یہ جو

تم مسلسل انکار کیے جا رہی ہو تو اس کی وجہ کیا ہے۔؟“

”ہزار بار میں تمہیں وجہ بتا چکی ہوں۔“

”مطلب یہ کہ میری بہتری کی خاطر تم مان نہیں رہیں۔ ویسے میں تمہیں

بڑا نہیں لگتا۔“

”یہ میں نے کب کہا کہ تم مجھے بڑے لگتے ہو۔؟“

۲۹۲ ہمیشہ خوش رہو گی۔ ہمیشہ۔۔۔“

اس نے عائشہ کا ہاتھ زور سے دبایا اور دوسرا بازو اس کے شانوں پر

پھیلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”میں تمہیں دنیا کی ہر چیز دکھاؤں گا عائشہ! تمہیں ہر تفریح کرادوں گا۔ تمہارے

لیسے ہر عیش مبتلا کر دوں گا۔“

”لیکن عثمان۔!“ عائشہ سٹپتے ہوئے پریشانی سے بولی۔

”یہاں گھر سے تو تم نے مجھے اٹھا کر ٹیکسی میں بٹھالیا ہے مگر وہاں سینما ہال

میں کیا کر دوں گے۔؟ وہاں میں کیسے اندر جاؤں گی۔؟“

”یونہی میرے بازوؤں میں۔“ بے حد پیار سے کہنے لگا۔

”اوہ میرے خدا۔!“ عائشہ نے اپنے لہڑنے ہاتھوں میں چہرہ چھایا

”وہاں تو اتنے سارے لوگ ہوں گے۔ سب کیا کہیں گے۔؟“

”کیا کہیں گے۔؟“ عثمان تیز ہو کر بولا۔ ”کیا تمہارا دل نہیں ہے۔؟“

کیا اس میں خواہشیں اور ارمان نہیں ہیں۔؟ جس طرح باقی سب کو

کرنے کا اور اپنے لیے خوشیاں فراہم کرنے کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح

تمہیں بھی ہے۔ کوئی کچھ کہہ کے تو دیکھو۔!“

عثمان نے سینہ تان کر بڑے جوش سے اس پر ہاتھ رکھا۔

”تم عثمان کے ساتھ جا رہی ہو۔ عثمان کے ساتھ۔“

”اور کیا کہیں مجھے یوں لیجا لے ہوئے حادثہ محسوس ہو گی۔؟“

”جنت لڑکی۔! اگر محسوس ہونا ہوتی تو تمہیں گھر سے ہی لے کر نہ چلتا۔“

”لیکن مجھے تو لوں گو دہن سوار ہو کر جاتے ہوئے بڑی سخت شرم آئے گی۔“

” میں تمہیں خالی خولی اچھا ہی لگتا نہیں چاہتا۔ بلکہ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ ویسی ہی محبت نہیں بھی مجھ سے ہو جیسی مجھے تم سے ہے۔“

عائشہ پر بے پروا نگاہیں جماتے خاموش بیٹھی اشتہارات دیکھتی رہی۔ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ عثمان اس کی خاموشی سے بیزار ہوتے ہوئے جھنجھلا کر بولا۔

” یہ اشتہارات شاید مجھ سے زیادہ اچھے ہیں۔“

” تم سے اچھا کوئی بھی نہیں عثمان۔ عائشہ کی نگاہیں تو کوئی بھی نہیں۔“

” سچ کہتی ہو۔“ عثمان کی خوشی بے قابو ہو گئی۔

” جھوٹ کیوں بولونگی۔“ عائشہ اسی طرح سامنے نگاہیں جماتے

سنجیدگی سے بولی۔

پھر اس نے عثمان کا ہاتھ اپنے دونوں نازک نازک ہاتھوں میں تھام کر دیا۔

” یہ کبھی بھی نہ سوچنا کہ مجھے تم سے نفرت ہو سکتی ہے۔ مجھے تم سے محبت

ہے عثمان! اور یہی محبت مجھے اس انکار پر مجبور کر رہی ہے۔“

اس نے دل کی بات صاف کہہ دی۔ وفور مسرت سے عثمان بوکھلا

سا گیا۔ عائشہ کو بھی اس سے محبت تھی۔ یہ بڑا روح پرور اور جہاں افزا

انکشاف تھا۔

” اوہ عائشہ۔“ اس نے بے خود ہوتے ہوئے عائشہ کے ہاتھ اپنے

پکپکاتے ہونٹوں سے لگا لیے۔

وقت ہوئے ہوئے، دھیرے دھیرے اور کبھی بڑی سرعت سے گزرتا رہا۔

اپنے پاس کرنے کے بعد عثمان وہیں کسی کالج میں لیکچرر ہو گیا۔ اب بھی پڑھانے

لے وقت کے علاوہ ایک ایک لمحہ اس کا عائشہ کے پاس ہی گزرتا تھا۔

عائشہ سے شادی کرنے کی ضد اس کی اسی طرح قائم تھی۔ چار سال

لے طویل عرصے نے بھی اس کے اس فیصلے میں کوئی رد و بدل نہ کیا۔

عائشہ کے لیے وہی چاہت، وہی امنٹ محبت اور وہی پر خلوص پیار

لے کے دل میں تھا۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہوا اٹھتا۔ پیار سیر

ہاں تو اس کے سر ہانے بیٹھ کر اور راتیں جاگ جاگ کر گزار دیتا۔

کبھی کبھار چٹھی پر گھر جاتا تو دو دن بعد ہی اس کے لیے بے چین ہو کر واپس آجاتا۔

بننے اسے کیا ہو گیا تھا۔؟

عائشہ نے ہر طرح اسے سمجھایا۔ اپنی زندگی کی کٹھن راہوں کی تصویر کھینچ

اس کے سامنے رکھ دی۔ کہ اس سے شادی کی صورت میں عثمان کو کن کن کٹھن مراحل

سے گزرنا پڑے گا۔

نزدہ گھر گھر ہستی بنیہال سکتی تھی اور نہ بچے۔! وہ کنواری تھی لیکن اس

نے صرف عثمان کو سمجھانے کی خاطر اپنی فطری شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے

ایمان تک کہہ دیا کہ ہو سکتا تھا وہ اس حالت میں اس کے لیے بچے بھی پیدا

کے۔

اور بچوں کی خواہش کرنا تو ہر انسان کی فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ یوں

عثمان کو گھر گھر ہستی کا آرام مل سکے گا اور نہ اس کی زندگی کے چین میں معصوم معصوم

پھر اس نے عائشہ کو اسی دن کا ایک واقعہ سنایا —  
 عثمان اور اس کا ایک دوست بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ باتوں باتوں  
 میں اپنا مک ہی وہ پوچھنے لگا کہ عائشہ عثمان کی کون تھی؟  
 عثمان بڑا حیران ہوا۔ عائشہ کے متعلق اس نے آج تک کسی کو کچھ نہیں  
 بتایا تھا پھر اس کو اس کے نام کا علم کیسے ہوا۔؟ گھبرا کر اس سے پوچھا —  
 وہ تہمتہ مار کر ہنسنے ہوئے بولا —

”تم باتیں تو مجھ سے کر رہے ہو مگر میز پر انگلی سے عائشہ! عائشہ! مسلسل لکھتے  
 جا رہے ہو — سینکڑوں بار ہی لکھ ڈالا ہو گا۔ یقیناً اس سہتی کا تمہاری فات  
 سے کوئی گہرا تعلق ہے۔“  
 پھر عثمان بڑی نرمی سے اسے سمجھانے لگا۔

”اس سے بڑا ثبوت میری سچی محبت کا اور کیا ہو گا عائشہ! کہ میں لاشعوی  
 طور پر بھی تمہارے ہی نام کا ورد کرتا رہتا ہے۔ کچھ اس طرح تم میرے من میں بس  
 چلی ہو۔ اور تم پھر بھی مجھے کہتی ہو کہ جذبات کی رویں بہ رہا ہوں۔“  
 عثمان اٹھ کھڑا ہوا۔ رات کے بارہ بج گئے تھے اور اسے ابھی اگلے دن  
 کے لیے لیکچر تیار کرنا تھا۔

”بس! آج کی رات تمہیں دے رہا ہوں۔ کل ہماری اس چار سالہ طویل بحث  
 کا آخری دن ہو گا۔ اس عرصے میں جو کوئی دلائل پیش کرنے والے رہ گئے ہوں  
 وہ سوچ رکھنا۔ انشاء اللہ تمہاری ہر دلیل کا مدلل جواب دوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے عثمان چلا گیا۔ عائشہ پھر سوچوں میں کھو گئی۔ کب تک  
 ہل ایل عثمان کے ساتھ ملکان ہوتی رہے گی۔ آخر اس نے ماں سے یہ بات

مسکراہٹوں کے پھول کھلیں گے۔ پھر آخر ایسی روکھی پھینکی سی زندگی کو اپنا  
 کیا کرے گا وہ۔؟  
 مگر عثمان کے پائے استقلال پھر بھی نہ ڈگمگاتے —

”مجھے اور کچھ نہیں چاہیے عائشہ! سوائے تمہارے۔!!“  
 ”اوہ عثمان! لیکن میں خود کو تمہاری اس ہمدردی کے قابل نہیں سمجھتا۔“  
 ”ہمدردی! ہمدردی!“ عثمان غصے سے پیچ پڑا۔ ”آخر میں  
 کس طرح یقین دلاؤں کہ ہمدردی نہیں مجھے تم سے پیار ہے عائشہ! — پلا  
 محبت۔!! تم میری تمناؤں کا مرکز ہو۔! تم میری آرزوؤں کی جان ہو۔!  
 میں نہ تمہاری ہمدردی میں یہ قدم اٹھا رہا ہوں نہ کسی ایثار کے لیے۔ یا  
 تو خود اپنی محبت کو پانا چاہتا ہوں۔ اس محبت کو جو مجھے تم سے ہے۔“  
 ”عثمان! جذبات کی رویں بہ کر کیسے گئے فیصلے دیر پا نہیں ہوتے۔ فنا  
 کے لیے کچھ سوچ سنبھلو۔“

”جذبات کی رویں۔؟ بڑا افسوس ہے عائشہ! تم مجھے ابھی تک نہیں  
 سیکھیں۔ بس جذبات کی رویں بہ رہا ہوں۔؟“ عثمان بڑے دکھ سے بولا  
 ”اگر ایسی بات ہوتی تو میں کب کا بدل چکا ہوتا۔ یونیورسٹی میں میرے ماہ  
 لڑکیاں پڑھتی رہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر لائق اور خوبصورت لگی۔ میں  
 کہیں بھی پھیل سکتا تھا۔ اور اب بھی میرا واسطہ زیادہ تر لڑکیوں سے ہی پڑتا  
 ہے مگر۔ میں اب بھی وہی عثمان ہوں۔ آج سے چار سال پہلے والا۔  
 بلکہ اس سے بھی مضبوط تر۔! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ تمہارے سحر نے کس طرز  
 میرے ہوش و حواس کو مسحور کر رکھا ہے۔“



کرنے کا فیصلہ کر لیا —

ہو سکتا ہے وہ کوئی بہتر راستہ دکھائے — وہ خود تو عثمان کے ساتھ سر  
کھپا کھپا کر پاگل ہو چکی تھی — اور پھر اس رات اس نے ماں سے بات کر بیٹھال  
ماں نے سب کچھ سنا — بڑی دیر سوچوں میں کھوئی رہیں —

”امی! آپ نے کچھ کہا نہیں —“

”کیا کہوں بیٹے —؟“

”پھر بھی — کچھ تو رائے دیجئے —“

”میں تو کہتی ہوں عثمان کی بات مان لو —“

”کیا مطلب —؟“ عائشہ ایک دم تیز ہو گئی — ”وہ اندھے کنویں میں گر  
رہا ہے اور میں چپ چاپ اسے گر جانے دوں — میں — جو اس کی دشمن نہیں  
ہوں — مجھے عثمان بہت عزیز ہے امی —!“

”اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اس کی بات مان لو — وہ بڑا مخلص ہے —

دوسرے —“ امی کچھ سوچتے سوچتے رک کر بولیں —

”بیٹی! میں بوڑھی ہو گئی — آج مردوں کی دوسرا دن — اور تمہارے سر  
پر ابھی جوانی ہے — کیا علم تمہاری ابھی اور کتنی عمر باقی ہے — کہاں در در  
بھٹک لو گی —؟ عثمان تمہارا سہارا بن جائے گا — اور خاوند سے بہتر سہارا داد  
کوئی نہیں ہوتا عائشہ —!“

”اوہ امی! آخر آپ میری ہی ماں نہیں نا — آپ نے بھی میرے ہی فائدے  
کے متعلق سوچا — اور وہ جو دنیا کی بے شمار نعمتوں سے محروم ہو جائے گا — اگ  
آپ کو خیال نہ آیا —“

”ہم اسے مجبور تو نہیں کر رہے عائشہ! یہ اس کی اپنی ہی خواہش ہے —“  
”مگر امی! یہ ہر انسان کا فرض ہے کہ دوسرے کو غلط راستے پر چلتا دیکھے تو  
ان کی رہنمائی کرے —“

”اور اگر وہ یہ مانتے ہی نہ کہ غلط راستہ پر ہے —؟“

”مگر میں تو سمجھتی ہوں ناکہ اس نے غلط راستے کا انتخاب کیا ہے — یہ اسکی

نزل نہیں —“  
”اب پھر میں کیا کہہ سکتی ہوں —؟“ امی کچھ الجھ سی گئیں —

”بہر حال میں وہی کر دوں گی جس میں تمہاری خوشی ہوگی —“

”آپ شاید ناراض ہو گئیں امی —؟“

”نہیں بیٹی! تم سے بھلا ناراض کیوں ہوں گی — بس ذرا اپنی بے بسی کا  
بال اٹا لیتا تھا —“

”اپنی یا میری —“ تلخ سا تبسم عائشہ کے لبوں پر پھیل گیا —

”تمہاری بھی تو میری ہی ہوتی —“ امی آہ بھر کر بولیں —

”یہ حادثہ نہ ہو گیا ہوتا تو یقین کر دو میں خود خدیجہ سے کہہ کر عثمان کو مانگ لیتی۔

بے عثمان بہت پسند ہے — گراب — وہ منہ ہی نہیں رہا کہ کچھ کہ سکوں —“

امی نے سونے کے لیے پر لی طرف رخ پھیر لیا — لیکن عائشہ جان گئی تھی

اسنے کے بہانے وہ چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھیں —

”اے کاش! میں اس حادثے میں رابعہ کی طرح بالکل ہی ختم ہو گئی ہوتی۔

بال میرے ساتھ میری ماں کو بھی سدا کا روگ تو نہ لگ جاتا — کوئی مرتبہ

لپچے رہ جانے والوں کو آہستہ آہستہ صبر آ رہی جاتا ہے مگر یہ جیتی جاگتی موت!

۳۰۰ اود خدا! یہ تو نے کس اذیت میں ہم دونوں ماں بیٹی کو ڈال دیا —  
 ماں بہت دھیمے دھیمے اور چپکے چپکے سسکتی رہی اور آنسو بہاتی رہی کہ  
 عائشہ سر نہ ہو جائے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ عائشہ کا احساس اتنا حساس  
 تھا کہ جب کبھی بھی اس پر ایسی حالت طاری ہوتی وہ بے خبر نہ رہ سکی —  
 ماں کے آنسوؤں میں ڈوبتی ابھرتی وہ گزری ہوئی زندگی کے ان کناروں  
 سے جاٹکرائی جہاں اس کی حیات کی ناؤ لٹکھڑائی تھی۔ پھر — ڈوبتے ڈوبتے پڑ  
 تو گئی تھی مگر اپنا بہت کچھ کھو بیٹھی تھی —  
 دس بارہ سال پہلے یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ اس وقت دسویں جماعت  
 میں پڑھتی تھی — سکول کی بڑی ذہین اور ہوشیار طالبہ تھی — کھیلوں میں،  
 ڈراموں میں، ہر جگہ پیش پیش رہتی — مگر —  
 وہ دن بڑا ہی منحوس تھا۔ عائشہ اور اس کی چھوٹی بہن رابعہ باپ کے  
 ساتھ موٹر میں سیر کے لیے نکلی تھیں — جانے کیا ہوا — اس ٹرک والے  
 کی غلطی تھی یا اس کے باپ کی ڈرائیونگ کمزور — کہ — مقدر کی خرابی —  
 دونوں آمنے سامنے ٹکرا گئے —  
 پھر سب کچھ ہی تو ختم ہو گیا — زندگی کی ہر دل چسپی، ہر ارمان اور ہر تمنا  
 گھٹ کر رہ گئی —  
 اپا بھی کے ساتھ ساتھ اس حادثے نے یتیمی اور تنہائی بھی اسے دے دی  
 تھی — ایسا شفق باپ اور اتنی پیاری سی بہنٹی مسکراتی بہن رابعہ کی دائمی جلا  
 کوئی تم تکلیف دہ نہیں تھی —  
 اور اب — ماں کی واحد خوشی اور زندگی گزارنے کا بہانہ، یہی بیٹی کا

والی عائشہ رہ گئی تھی — اس نے اسی ٹوٹی پھوٹی زندگی کو سینے سے لگا کر اپنی خوشیوں  
 کا مرکز بنالیا —  
 ماں کے وقت کا ہر لمحہ اس کی نگہداشت اور دیکھ بھال میں گزرنے لگا — اپنی  
 بلا بھر اس نے عائشہ کی سہولت کے لیے ہر سامان مہیا کیا — گوشت پرست کی  
 انگلیں نہیں رہی تھیں تو لکڑی کی لگوادی گئیں — ساتھ بیسکھوں کا انتظام بھی  
 ہو گیا — مگر پھر بھی عائشہ اپنی حساس طبیعت کے باعث زمانے کا ساتھ نہ دے  
 سکی — چند قدم چلنے کے بعد ہی منہ کے بل گر پڑی —  
 اپنی لازمہ کے ساتھ وہ جب بیسکھوں کے سہارے بہت مشکل سے اور  
 بہت آہستہ آہستہ گھر سے سکول کے لیے نکلتی تو ہر راہ چلنے والی آنکھ چند لمحوں کیلئے  
 رک کر اسے ضرور دیکھتی — کئی تو مارے ہمدردی کے اس سے پوچھ بھی بیٹھتے کہ  
 اس کی ٹانگوں کو کیا ہوا تھا —  
 سکول میں وہ وہی دس سال والی پرانی طالبہ تھی مگر اب ہر رات کی اور ہر اتانی  
 اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے بغور دیکھنا گویا اپنا فرض سمجھتی — اور  
 اس فرض کے بعد اکثر اس سے ہمدردی بھی کرتیں —  
 کوئی اس کا بستہ اٹھانے کی پیش کش کرتی تو کوئی اس کا کوئی اور کام کرنے  
 کو تیار ہو جاتی — کبھی جماعت میں وہ کام ٹھیک نہ کرتی تو اتانی اسے کچھ نہ  
 لکھتی — اس پر ترس کھا کر اسے ہمیشہ معاف کر دیا جاتا جبکہ ایسی ہی غلطی پر دوسری  
 کسی لڑکی کو خوب سزا ملتی —  
 اس حادثہ کے بعد جانے عائشہ کی طبیعت اتنی حساس کیوں ہو گئی تھی — یہ  
 اب ہمدردیاں اور ترس وہ برداشت نہ کر پاتی —

کیوں اس کے ساتھ باقی سب لڑکیوں سے علیحدہ سلوک کیا جاتا تھا۔  
کیوں اسے دوسروں جیسا نہیں سمجھا جاتا تھا۔؟ اس لیے۔ کہ اس کا  
ٹانگیں نہیں تھیں۔ اور یوں وہ قابلِ رحم عنصر بن گئی تھی۔

اس کا جی چاہتا کہ کوئی غلطی کرنے پر اسے دوسری لڑکیوں ہی کی طرح سزا  
ملے۔ اس سے پیشتر ہی کی طرح جماعت کے چھوٹے چھوٹے کام اتانی لگے  
اپنی باڑی پر بلیک بورڈ صاف کرنا۔ سب لڑکیوں کے گھر کے کام کی  
کاپیاں اکٹھی کرنا۔ اتانی کے آنے سے پہلے رستہ چاک اور قلم دوات وغیرہ  
مینپر ترتیب سے لگانا۔

ان سب چھوٹے چھوٹے کاموں سے اسے کتنی لذت ملا کرتی تھی اور کتنی  
مسرت حاصل ہوا کرتی تھی۔ مگر اب یہ سب کچھ اس سے چھوٹ گیا تھا۔  
صرف اس کی ہمدردی میں۔

مگر دوسروں کی یہی ہمدردیاں اور رحم اسے ہر لمحہ اس محرومی کا احساس  
دلاتے رہتے جسے وہ اپنے ذہن سے خارج کر دینا چاہتی تھی۔ وہ اس علاقہ  
کو فراموش کر دینا چاہتی تھی۔ اس کی تکلیف دہ یادیں دماغ سے کھرچ ڈالنا  
چاہتی تھی۔ مگر دوسرے زبردستی کیے دے رہے تھے۔

وہ دوسروں ہی کی طرح اپنی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ تاکہ اپنا بھی کامیاب  
کی موت دینے والا احساس مٹ جائے مگر۔ ان رحم بھری نگاہوں نے اُس  
عام لوگوں جیسی زندگی سے بہت دور کر دیا تھا۔ کوئی بھی اس کے دل کا حا  
نہ جان سکا کہ وہ کیا چاہتی تھی۔؟

اور پھر۔ ایک دو مہینے سے زیادہ وہ اس ماحول کے ساتھ نباہ نہ سکا

۳۰۳ اس نے سکول چانا چھوڑ دیا اور گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر رہ گئی۔  
مگر پھر بھی اسے پرسکون زندگی نہ ملی۔ عزیز، رشتہ دار، آنے والے والے  
ملنے ملانے والے۔ ہر کوئی تو اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ رکھتا تھا۔ ان کے  
دلوں میں اس کے لیے پیار و محبت ہو نہ ہو مگر رحم اور ترس ہر ایک کی نگاہ میں ضرور  
موجود رہتا تھا۔

”بائے بیچاری۔!“

یہ لفظ تو گویا اس کے نام کے ساتھ تخلص بن کر رہ گیا تھا۔ پھر کوئی کہتا  
”پچ پچ پچ۔!“ شکل کتنی پیاری ہے مگر یہ دکھ۔! بائے توبہ توبہ! اللہ رحم کرے!  
اور اس کا دل چاہتا تھا کسی کی نگاہ اس کے اس عیب کی جانب نہ اٹھے۔  
اسے بھی ایک عام اور نارمل انسان جیسا رہنے ملے۔ کوئی اس سے محبت کرے  
اور کوئی نفرت۔! مگر اس کا مقصد تو صرف رحم بن کر رہ گیا تھا۔  
اسی لیے اس جذبے سے، جس کا نام رحم اور ہمدردی ہے، اسے نفرت  
ہو گئی تھی۔ شدید نفرت۔! اس کا بس چلتا تو نفرت میں سے یہ لفظ ہی نکال  
دیتی۔ ہر دل سے یہ جذبہ نوج ڈالتی، جس نے پھیل کر اس کی پوری ہستی  
لوہوں اپنی پیٹ میں لے لیا تھا کہ اسے کسی اور جذبے کی لذت کے لیے چھوڑا  
ہی نہ تھا۔ کیسے کیسے وہ ان لذتوں کو ترستی تھی۔! یہ تو صرف اس کا اپنا  
دل ہی جانتا تھا۔

پھر اس نے گھر میں آنے جانے والوں کے سامنے بھی چلنا پھرنا چھوڑ دیا۔  
مارا دن ٹانگوں پر کھیل ڈالے کبھی اس پلنگ پر کبھی اس چارپائی پر اور کبھی اس کرسی  
پٹیٹی رہتی۔ تاکہ اس کی اپنا بھی اور مغذوری کسی کی نگاہ میں نہ آنے اور پھر

کوئی اس کے ساتھ ہمدردی نہ کرے — کوئی اس پر ترس نہ کھائے —  
 اتنی ہر وقت سمجھاتی رہتیں کہ آخر یوں کیسے زندگی گزارنی چاہیے تھی مگر وہ  
 اپنے ذہن اور اس میں جنم لینے والے احساسات کو کیا کرتی — ماں کی نصیحت پر ہم  
 تو وہ کان نہ دھرنے دیتے تھے —

کبھی کبھار تو امی کی نصیحتیں بہت ہی الٹا اثر کرتیں — اس کا دل چاہنے لگا  
 کہ موقع ملے تو اپنی زندگی کا ابھی خاتمہ کر ڈالے — خواہ مخواہ ماں کو بھی دیکھ  
 کیا ہوا تھا — کیا فائدہ تھا اس کی زندگی کا —؟

خود اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی بوجھ ہی تو بن کر رہ گئی تھی  
 اسے دوسروں کے سر سے یہ بوجھ اتار دینا چاہیے تھا — مگر کبھی ممکن ہی نہ ملا۔  
 امی ایک منٹ کو اسے اکیلا نہ چھوڑتی تھیں — انہوں نے تو ساری دنیا کو  
 اس کی خاطر تاج دیا تھا — سب رشتہ دار، ملنے ملانے والوں کو بھلا، بس ایک  
 اسی کی ہو کر رہ گئی تھیں —

شاید ماما اتنے ہی شدید جذبے کا نام ہے — اور وہ اگر کبھی کسی سے  
 ہنس بول لیتی تھی تو صرف ماں کی اس ماما کی خاطر —! ورنہ اس کا لبر پلٹاؤ  
 بالکل ہی تاریک الدنیا ہو جاتی —

اور اب — اب اسی دنیا کا ایک باسی اس کے لیے جذبہ محبت کا تحفہ  
 لے کر آیا تھا — وہ تحفہ، جو اسے کبھی نہیں ملا تھا — ایسا نادر و نایاب —! —  
 قبول کر لینے کو دل تو بہت چاہتا تھا مگر — اپنے لیے خوشیاں سمیٹ کر وہ دینا  
 کا دامن خالی نہیں کرنا چاہتی تھی —

چار پانچ سال کا طویل عرصہ اس نے عثمان کے ساتھ گزارا تھا اس نے اُسے  
 اپنی تھیں — اسے طہلیں دکھائی تھیں — جتنا وقت موجود رہتا اس دوسروں سے  
 نام نہاد رہتا — پیاری پیاری باتیں کر کے اس کا دل بہلاتا رہتا — دیکھ  
 بیت خراب ہو جاتی تو اپنے اوپر کھانا پینا حرام کر لیتا —  
 اس کی ایسی ایسی توجہات نے اسے عائشہ کی نگاہ میں بڑا عزیز بنا دیا تھا۔  
 یہ اسی لیے عائشہ اس عزیز ترین بہتی کی زندگی خود اپنی ہی وجہ سے ناکام و نامراد نہیں  
 مانا چاہتی تھی —

حالانکہ اس کی ماں کی بھی یہی خواہش تھی — اس کے باوجود وہ ایسا نہیں  
 پابندی تھی — کسی صورت بھی نہیں — کسی طور بھی نہیں —!!  
 یہی کچھ سوچتے سوچتے وہ جانے کب نیند کی دلدلیوں میں کھو گئی —

معمول کے مطابق عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور عثمان  
 عیشہ کی طرح مسکراتا ہوا عائشہ کے کمرے میں چلا آیا — سیاہ پتلون اور سفید  
 بند گلی کے سویٹر میں بے حد سمارٹ اور پرکشش لگ رہا تھا —  
 ”توبہ توبہ! کبھی جو ایک آدھ منٹ ادھر ادھر ہو جائے — ایسا بھی  
 اذیت کا پابند میں نے اور کوئی نہیں دیکھا —“

”عبادت کے وقت کی پابندی نہ کی جائے تو اللہ میاں ناراض ہوتا ہے —“  
 وہ اگر بڑی بے تکلفی سے اس کے پاس بیٹھ گیا —  
 ”جی جناب! یہاں آکر عبادت ہی تو کرتے ہیں — کبھی میں نے غاڑ پڑھتے  
 تو دیکھا نہیں —“

”تمہارے پاس جو وقت گزر جائے میں اسے ہی عبادت سمجھتا ہوں —“

کوئی اس کے رعبائشہ کی آنکھوں میں جھانکا —

عائشہ! تم نے مجھے زندگی کے بڑے خوبصورت درس دیے ہیں۔ میرے کردار کو تم نے بڑے پیارے طریقے سے سنوارا ہے۔“

”میں نے —؟“

”ہاں تم نے — تمہیں تے۔“ عثمان نے اس کا کان پکڑ کر سہلے سے کھینچا۔

”تم بیوقوف لڑکی! میری کسی بات کا یقین کیوں نہیں کرتیں جبکہ میں نے تمہیں پلے

دل اور پہلی ہی نگاہ میں قابل اعتماد سمجھ لیا تھا۔“

”کیوں —؟“

”جانے کیوں — بس اتنا معلوم ہے کہ جب پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا تھا

تو اسی وقت تمہیں اپنا دوست بنانے کی خواہش دل میں پیدا ہوئی تھی۔“

”دوست —؟“ عائشہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ”اور میں —؟“

”مذاق نہ اڑاؤ۔ سچ کہہ رہا ہوں — تمہارے چہرے پر کچھ ایسی ہی ملاہٹ

اور اپنائیت مجھے دکھائی دی تھی۔“

”پھر —؟“ عائشہ ہنستی ہی جا رہی تھی۔

”اور پھر اسی لیے میں اکثر یہاں موجود رہنے لگا۔ جانے کیا ہو جاتا تھا۔

کالچ کا وقت ختم ہوتے ہی خود بخود میرے قدم اس گھر کی سمت اٹھنے لگتے۔

کوئی انجانائی قوت مجھے یہاں کھینچ لے آتی۔“

”لیکن اس سے یہ کیسے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارے کردار کو میں نے سنوارا ہے؟“

”میں روز یہاں آتا تھا۔ اس وجہ سے ہم دونوں آپس میں کافی بے تکلف

ہو گئے۔ میں نے اپنی بہت ساری باتیں تمہیں سنائیں۔ جانے کیوں میں

نے تمہارے سامنے اپنے کردار کی وہ خامیاں بھی کھول کر رکھ دیں جو دوسروں سے

بچاتا تھا۔“ عثمان کے چہرے پر صداقت کی چمک تھی۔ عائشہ اسے دیکھ

بارہی تھی اور بڑے دھیان سے اس کی باتیں سنے جا رہی تھی۔

”پھر تم نے میری اکثر خامیوں کو انتہائی خلوص اور محبت سے دور کر دیا۔

اگر اب میں پہلے سے بہت بہتر انسان ہوں۔ اس کا مجھے اعتراف ہے۔ اور

ایک لیے تمہارے پاس گزارے ہوئے وقت کو میں عبادت سمجھتا ہوں۔ نیک

اور مابرا رہا ہوں۔“

عائشہ پہلے تو حیران حیران اسے دیکھتی رہی اور پھر ہلے ہوئے اس کے

زبان کی سطح پر چار بار پنج سال پہلے کے واقعات ابھرنے لگے تب عثمان شروع شروع

ان کے گہرے لگتا تھا۔

ایک دن آیا تو بڑا مسرور سا تھا۔ عائشہ کے پاس بیٹھ کر بڑے رازدارانہ

الفاظ میں اسے بتانے لگا۔

”یہ دیکھو۔ کل رات یہاں سے جا کر صرف ایک گھنٹہ محفل جمی تھی اور میں

نے ساڑھے چار روپے کھالیے۔“

”کیا مطلب —؟“

”فلاشس کھیلی تھی۔“

”فلاشس —؟“ عائشہ چونکی۔ ”عثمان تم فلاشس کھیلنا کرتے ہو؟“

”ہاں۔ کیا حرج ہے۔ اب تو میرا زیادہ وقت یہاں گزر جاتا ہے مگر

پہلے تو ہم ہوسٹل کے لڑکے دو دو دن مسلسل کھیلنا کرتے تھے۔ بڑا مزہ آتا ہے۔“

”لیکن فلاشس تو جوا ہوتا ہے۔؟“

”دوست یار مل کر کھیل لیتے ہیں۔ فرق کیا پڑتا ہے۔“

”مگر جو اگھینا لنا ہے عثمان۔“

”ہم جوئے کی خاطر تو نہیں کھیلتے۔ وہ تو صرف کھیل میں دلچسپی پیدا کرنے

کے لیے پیٹ لگا لیتے ہیں۔“

”بچہ چچ۔ بہت بری بات۔ آج تم دلچسپی کی خاطر کھیلتے ہو کل پتہ بنا لوگے۔“

”خواہ مخواہ ہی۔“

”خواہ مخواہ کیوں؟ یہ تو ہو گا۔“

”چلو جب ہو گا دیکھنا جائے گا۔“ عثمان لا پرواہی سے بولا۔

”فی الحال تو یہ بتاؤ کہ کیا کھاؤ گی۔؟ ان پیسوں سے تمہاری دعوت کروں گا۔“

”توبہ استغفار۔! اس حرام کی رقم کو تو میں ہاتھ بھی نہ لگاؤں۔ دعوت

کرانا تو دور کی بات ہے۔“

”کیا۔؟“ عثمان اب چونکا۔

”ہاں۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ جوئے میں جیتی ہوئی رقم حرام ہوتی

ہے۔ اور حرام اپنے آپ پر خرچ کرنا گناہ عظیم۔!“

”اوہ! تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟“

”کیا۔؟“

”کہ تم فلاں کھینا اچھا نہیں سمجھتیں۔“

”نہ صرف فلاں کھینا بلکہ ہر وہ کھیل جس پر پیسے لگا کر مارا یا جیتا جائے میں

باز نہیں سمجھتی۔ مجھے حرام کی کھانی سے نفرت ہے عثمان۔! اخلاقی کی رقم میں ۳۰۹

ایک پیسہ بھی حرام شامل ہو جاتا ہے تو پھر برکت اٹھ جاتی ہے۔“

عثمان کچھ چپ سا ہو گیا۔ ہاتھ میں وہ ساڑھے چار روپے تھے اور سر

جھکائے بیٹھا انہیں دیکھے جا رہا تھا اور کچھ سوچتا جا رہا تھا۔ بہت دیر وہ بیٹھا بیٹھا

رہا۔ آخر عائشہ پوچھ ہی بیٹھی۔

”کیا بات ہے۔؟“

”مجھے معاف کر دو عائشہ۔! عثمان نے جھجکا ہوا سر اٹھایا۔ بید بخیز

ہو رہا تھا۔ کچھ نادم سا بھی تھا۔

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد کبھی فلاں نہیں کھیلوں گا۔“

اُس نے عائشہ کے نرم و نازک ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ جو اس کے خلوصیت کا خاصہ تھا۔!

عائشہ کو اس کے اس فیصلے پر بڑی خوشی ہوئی۔ اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کے ہاتھ

پر رکھ کر تھپتھپایا۔

”پکا وعدہ ہے نا۔؟“

”ہاں عائشہ! بالکل پکا وعدہ۔ تم سے میں نے نہ کبھی جھوٹ بولا ہے اور

نہ بول سکتا ہوں۔“

غیب سی اس کی حالت تھی۔ پریشان اور شرمندہ شرمندہ سا۔! کچھ

خاموش خاموش بھی۔!! عائشہ بڑے غور سے اس کے چہرے پر پھیلی اس

شرمندی اور اداسی کو دیکھ رہی تھی۔ جانے وہ کتنے عرصہ سے کھیل رہا تھا۔ اور

اب ایک دم سے ہی چھوڑ دینے سے شاید اداس تھا۔

کوئی بھی ایسی لت پڑ جائے بڑی بُری ہوتی ہے۔ مشکل سے ہی چھٹی ہے  
زبردستی کی جائے تو انسان کوئی اور غلط راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ عائشہ  
نے کچھ سوچا۔

”اگر کبھی بہت کھیلنے کو چاہے تو میرے ساتھ کھیل لیا کرنا عثمان!“  
”تمہارے ساتھ —؟“ وہ متحیر لگا ہوں سے اسے دیکھنے لگا۔  
”ہاں —“

”مگر تمہیں تو اس سے نفرت ہے۔“

”تمہارے ساتھ کھیل لیا کر دے گی۔“

”اور تمہارا وہ عقیدہ کہ گناہ ہونا ہے۔“

”بہم گناہ کے رنگ میں قصور اکھیلیں گے۔“

”پھر اور کیسے؟“

”جھوٹ موٹ کے پیسے لگا کر۔“

”ہاں۔ یوں ٹھیک ہے۔“ عثمان خوش ہو گیا۔

پھر اسی وقت اس نے عائشہ کو فطاش کھیلنا سکھائی۔ عائشہ نے عثمان  
کی خاطر بڑی خوشی سے سیکھ لی۔

پھر حیب کبھی بہت جی چاہتا تو بڑی مصیبت سے عائشہ سے فرمائش کرتا۔  
بالکل دوستوں کے انداز میں۔!

”آؤ پار! ذرا فطاش سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔“

”کیا کھیلیں گے؟“

”وہی اپنا قومی کھیل۔!“

حیب سے پیسے نکال کر کچھ عائشہ کو دے دیتا اور کچھ اپنے آگے رکھ لیتا۔  
پھر کتنی کتنی دیر دونوں کھیلے رہتے۔ پوری سنجیدگی سے حساب کتاب ہوتا۔  
عثمان ہارتا تو عائشہ اسے چھیڑتی، ہنستی، مذاق کرتی اور عائشہ ہارتی تو عثمان جیتی  
ہوتی رقم ہاتھوں میں اچھا اچھا کر اسے چڑاتا۔ آخر میں پوری کی پوری رقم  
عثمان کی جیب میں واپس چل جاتی۔ اور یوں کھیل میں لپٹی بھی قائم رہتی  
اور کوئی گناہ بھی نہ ہو پاتا۔!

پھر ایک دن عثمان نے عائشہ کو بتایا کہ پچھلی رات ہوٹل میں جب تاش  
کی مُنل جی تو وہ شامل نہ ہوا۔ سب کے لیے یہ بڑی اچنبھے کی بات تھی۔ اسے  
فردا ذرا بر ایک نے بہت مجبور کیا مگر عائشہ سے کیا ہوا وعدہ اس نے پورا کیا۔  
ایک بھی بازی نہیں کھیلی۔

آخر کیوں —؟ یہ اتنا بڑا انقلاب اس میں کیسے آگیا تھا اور کیوں آگیا تھا؟  
اس سے باقاعدہ پوچھ گچھ ہوتی۔

”کسی سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ آئندہ کبھی پیسے لگا کر تاش نہیں کھیلوں گا۔“  
”کس سے؟“ ”سبھی پوچھتے رہے مگر وہ بھلا عائشہ کا نام بنا سکتا تھا۔  
گوں مول کر کے ٹال گیا۔“

وہ سگریٹ بہت زیادہ پیتا تھا۔ دن میں کئی کئی ڈبیاں پھونک ڈالتا۔  
گھر سے یونیورسٹی کی فیس اور ہوٹل کے اخراجات کے علاوہ جتنا حیب خرچ  
ملتا۔ ایک ایک پیسہ سگڑیوں پر ہی خرچ ہوتا۔ ایک سگریٹ ختم ہوتا تو  
اس کے ساتھ ہی دوسرا سلگ اٹھتا۔

”راتنے زیادہ سگریٹ نہ پیا کرو عثمان!“ ایک دن عائشہ نے باتوں باتوں میں  
”کیوں؟“

”سنا ہے صحت کے لیے بہت مضر ہوتے ہیں۔“

”کئی سالوں سے اسی طرح پی رہا ہوں۔ اچھا بھلا ہی ہوں۔ ابھی تک تو

کوئی بیماری نہیں لگی۔“

”خدا نہ کرے کوئی بیماری لگے۔“

”تو بس پھر چلنے دو۔“

”نہیں لگی تو لگ تو سکتی ہے نا۔“

”ہم بہت ڈھیٹ ہیں عائشہ بی بی۔!“

”نہیں عثمان اتنی زیادتی سے سگریٹ بننا اچھا نہیں ہوتا۔“

”تو کیا چھوڑ دوں؟ صحت وغیرہ کی مجھے پروا نہیں۔ البتہ۔ اگر تم کہتی

ہو تو ابھی چھوڑے دیتا ہوں۔“ ہاتھ میں پکڑا ہوا پورے کا پورا سلگتا سگریٹ اس

نے ایش ٹرے میں مسل دیا۔

”نہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ایک دم ہی اور بالکل ہی چھوڑ دو۔ مرد گریٹ

پیتا مجھے اچھا لگتا ہے۔ لیکن اتنی زیادتی سے نہیں کہ.....“

عائشہ کی بات بھی اس نے پوری نہیں ہونے دی۔ پہلے ہی بول پڑا۔

”اچھا بھئی آئندہ سے زیادتی ختم۔ یوں کرتے ہیں تم میرا راشن مقرر کر دو۔

ایک سگریٹ بھی زیادہ پی جاؤں تو جو چور کی سزا وہ میری۔“

جب بھی ان کے ہاں آتا چارچھ گھنٹوں کا سگریٹوں کا سامان لے کر آیا کرتا تھا۔

جھٹ پٹ جیب میں سے چار ڈبیاں نکال کر اس کے آگے پھینک دیں۔

”آج کے راشن سے جو زیادہ ہیں وہ کل پرسوں کے لیے رکھ لو۔“

عائشہ کو اس کی فرمانبرداری پر بڑا پیار آیا تھا۔ حالانکہ اس سرسری سے

ذکر کے بعد اس موضوع پر ان کے درمیان پھر کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر وہ قول کا

آٹا پکا لکھلا کہ خود بخود وہی سگریٹ کم کر دیے۔

ہفتے میں تین چار فلیں تو ضرور دیکھ لیا کرتا تھا۔ عائشہ کو یاد آیا وہ بھی اس

نے بہت کم کردی تھیں۔ صرف عائشہ کے کہنے پر۔!

والدین سے کالج اور ہوسٹل کی فیس کے علاوہ جیب خرچ بھی کافی ملتا تھا مگر

پھر بھی وہ اکثر قرضدار رہتا۔ کئی کئی مہینوں کی فیسیں یونی فلاح، سگریٹوں اور فلموں

پر برباد کر چھوڑتا تھا۔

پھر اس سے قرض مانگ، اس سے ادھار لے۔ کسی سے بے عزتی کر،

لی کی خود کر، وقت پر فیس نہ دینے کی وجہ سے کئی بار کالج سے بھی نام کٹا۔

اور یہ سب کچھ وہ خود ہی عائشہ کو بتایا کرتا تھا۔ انہیں وجوہات کی بنا پر

بڑھائی کی طرف سے بھی توجہ ہٹ گئی۔ وقت پر ایم۔ اے کے امتحان کی تیاری

نہیں۔ تیار ہی نہیں تھی تو داخلہ بھی نہ دیا۔

عائشہ کو جب معلوم ہوا تو بے حد پریشان ہوئی۔ بہت پیار سے اسے

بُھاتی رہی۔

”زندگی اتنی ارزاں نہیں اور وقت اتنا فالتو نہیں عثمان! کہ یوں بے دریغی

سے سب کچھ برباد کر دیا جائے۔“

”کہا جو کہ تیاری نہیں ہو سکی۔ پھر داخلہ دے کر پیسے ضائع کرنے کا فائدہ؟“



بڑی لاپرواہی سے بولا۔

”مگر یہ بھی تو سوچو کہ تمہارے والدین سنیں گے تو کتنا پریشان ہوں گے۔ اتنا روپیہ تم پر خرچ رہے ہیں۔ تمہاری جدائی بسہ رہے ہیں۔ ان سب کا صلہ انہیں تم یہ دو گے۔؟“

اتنے خلوص، اتنی معصومیت اور پیار سے انداز میں اس نے کہا تھا کہ عائشہ اس لمحے اپنی یہ ٹوٹی پھوٹی بے کاری زندگی بھی بڑی کارآمد محسوس ہوئی تھی۔ پہلے جو کبھی کسی نمازیں کو تاہی بت لیا کرتی تھی اب وہ صرف عثمان کی خاطر بہت پابند ہو گئی تھی۔ رات دن اس کی کامیابی کی دعائیں مانگا کرتی۔

شاید اسی کی دعاؤں کا اثر تھا۔ ویسے عثمان تو پورے وثوق سے کہتا تھا کہ اس کی دعاؤں کا ثمرہ تھا جو صرف دو مہینے کی محنت سے اس نے بڑے اچھے نبروں سے ایم۔ اے پاس کر لیا۔

پھر جلد ہی اسے وہیں ایک مخلوط کالج میں پیکچر شپ بھی مل گئی۔ فلاش کیلنڈر ترک کی۔ سگریٹ پینے کم کیے اور فلموں سے کچھ پرہیز کیا تو زندگی کافی سکون سے گزرنے لگی۔

”کیا سوچ رہی ہو عائشہ۔؟“ عثمان نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ ”یہ جاتے جاتے سونے کی عادت کب سے سیکھ لی۔ کئی آوازیں دیں مگر صلہ جواب ہی نہیں دے رہیں۔“

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔ بہت ہولے سے مسکرائی۔“ پرانی باتیں یاد آگئی تھیں۔

”کوئی۔۔۔؟“

”بس تھیں کوئی۔“

”کس کے متعلق۔؟“ عثمان بڑے غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنے لگا۔ ”کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے کہ مجھ سے جو تم شادی کرنے پر اتنے عرصہ سے راضی نہیں ہو رہیں اس کی کیا وجہ ہے۔؟ کیوں کوئی اور۔۔۔۔۔“

عثمان سر جھکاتے چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔

”اور کچھ نہیں۔ میرا ہی خیال کر لیا ہوتا۔ تم کیا جانو مجھے اس دن کا کتنا تنہا تھی جب تم ایم۔ اے کی ڈگری لو۔ میں تو تمہاری کامیابی کی دعائیں مانگا کرتی ہوں اور تم نے امتحان ہی نہیں دیا۔“

عثمان نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں ندامت تھی۔

”تمہاری سب دعائیں پوری ہوں گی عائشہ۔! وہ بڑے وثوق سے بولا۔ پھر پر عزیمت صمیم کی چمک تھی۔

”اب تو وقت نکلا گیا مگر میں اسی سال سپینٹری امتحان دوں گا۔“

”سچ۔!“ عائشہ خوشی سے بے اختیار ہواٹھی۔ ”تم ہمت کر دو۔ دعائیں تمہارے ساتھ ہیں عثمان۔!“

پھر دو تین مہینے عثمان نے خوب محنت کی۔ عائشہ کے کہنے سے وہ نارا وقت اپنے ہوسٹل کے کمرے میں بند رہ کر پڑھتا رہتا۔ ہر دوسرے دن کپڑے کے لیے اس کے پاس بھی ضرور پہنچتا۔ اور پھر جس دن آئے سکتا فون کر کے کہا سے دو دو باتیں کر لیتا۔

”تمہاری ہمت افزائی مجھ میں نئی تازہ روح پھونک دیتی ہے عائشہ اسی لیے میں روز تم سے ملا ضرور میسمتا ہوں۔“

"پاگل تو نہیں ہو گئے۔ مجھے اس حالت میں کون پسند کر سکتا ہے۔" عائشہ نے ایک دم اس کی بات کاٹ دی۔  
 "کتنی بارتہیں سمجھایا ہے کہ صرف تمہاری ہی بہتری میرے پیش نظر ہے اور کوئی وجہ نہیں۔"

"اور میں بھی کروڑ بار کہہ چکا ہوں کہ میری بہتری تم سے شادی کرنے میں ہے۔ میں اتنا عجیب انسان ہوں کہ میرے ساتھ کوئی اور گزارہ کر ہی نہیں سکے گی۔ بس ایک تم ہی مجھے آج تک سمجھ پائی ہو۔"  
 "جس کے نزدیک رہو گے وہی خود بخود سمجھ جائے گی تمہیں۔"  
 "ہر کوئی تم جیسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیا پتہ مجھ سے بھی کوئی بہتر تمہیں مل جائے۔"  
 "مجھے بہتر کی ضرورت نہیں۔" عثمان اُلجھ کر چیخ پڑا۔  
 "صرف تمہاری ضرورت ہے۔ اگر تم یوں راضی نہ ہو تیں تو تمہیں بھگا کر لے جاؤں گا۔"

"کیا؟" گھبراہٹ کے مارے عائشہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔  
 "توبہ توبہ! اللہ کرے ایسی گھڑی آنے سے پہلے ہی میں مڑ جاؤں۔ بچے بڑا افسوس ہے عثمان! کہ تم نے ایسی گھٹیا بات سوچی۔"  
 عائشہ اتنی سنجیدہ تھی کہ عثمان بے ساختہ قہقہہ لگا اٹھا۔

"تم سچ سچ ہی پاگل ہو۔ اپنی سے زیادہ مجھے تمہاری عزت عزیز ہے۔" پھر ایک دم خود بخود سنجیدہ ہو گیا۔

"ویسے یہ کان کھول کر سن لو کہ میری شادی ہوگی تو صرف تمہیں سے ورنہ۔"

۳۱۶ "ورنہ کیا۔؟" عثمان کے تیز اچھے نہ تھے۔ عائشہ گھبرا گئی۔  
 "ورنہ یہ دیکھو۔" جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔  
 "اس میں ایک بڑا خطرناک زہر ہے۔ ساری عمر تمہاری جدائی میں سسکتے ہوئے مجھ میں ہمت نہیں۔ میں اپنا خاتمہ ہی کر ڈالوں گا۔"

"ارہ عثمان!۔" عائشہ کا سارا وجود لرز اٹھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔؟" میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اور ٹھیک کر رہا ہوں۔ آج اس بات کا فیصلہ ہونا پائیے۔ پورے چار سال سے تم نے مجھے اس ذہنی اذیت میں مبتلا رکھ دیا۔  
 "لیکن۔۔۔" بے بسی کے مارے عائشہ کے آنسو ٹپک اُٹے۔

عثمان ہی کی بھلائی کی خاطر وہ اس کی بات مان نہیں رہی تھی اور وہی زہر بیٹھا تھا۔ اس کی جان چلی جائے۔ یہ بھی اس کی برداشت سے باہر تھا۔ یہ تو کچھ وہی جانتی تھی کہ وہ اسے کتنا عزیز تھا۔ اتنا عزیز۔ کہ اس کی ایسے کی بجائے سو بار اپنی اس سقربان کر دیتی۔ اب کیا کرے۔؟ کب طرح بھگائے۔؟ روتے جارہی تھی اور سوچے جارہی تھی۔ وہ جو اس کی آنکھیں نم ہوتی تھیں تو رقبہ اٹھتا تھا۔ اس وقت اس کے رخساروں پر ندیاں تھیں مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ بس اڑا ہوا تھا اپنی صد منوانے پر۔  
 "اپنے والدین اور گھر والوں سے تو پوچھ لو۔"

"ان سے بھی پوچھ لوں گا۔ ویسے شادی میری ہونی ہے ان کی نہیں۔" لیکن والدین کا بھی بہت حق ہوتا ہے۔

"مجھے یقین ہے جو میں کہوں گا وہی وہ کریں گے۔" اگر عثمان! میرا معاملہ مختلف ہے۔ تمہیں میرے متعلق انہیں سب کچھ

پہلے ہی بتا دیا جانیے تھا — ہو سکتا ہے وہ مجھے قبول نہ کر لیں —  
 "اس کا فخر تم کیوں کرتی ہو —؟ سب کو تمہیں قبول کرنا ہی ہوگا —  
 میری خواہش ہے — اور سبھی عثمان کی ضد کو جانتے ہیں —"

"اوہ!" عائشہ چپ سی ہو گئی — کوئی بھی تو راہ فرار نہیں مل رہی تھی۔  
 "پھر —؟" عثمان نے زہر کی شیشی کو گھاتے ہوئے کہا —  
 "خدا کے لیے تم اسے تو نہیں بھینگیو —"

"یہ اسی وقت بھینکی جانے گی جب اس کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔"  
 عثمان کی سنجیدگی فہم تھی —

اور آخر بہت بحث کے بعد عائشہ کو عثمان کے آگے ہار ماننا ہی پڑی۔  
 نہ چاہنے کے باوجود اس محبوب ترین ہستی کی خاطر وہ زندگی قبول کرنا ہی پڑی تھی  
 کے متعلق اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا — صرف اس لیے کہ اسے بھی اس سے  
 محبت تھی — اس سے پیار تھا — اٹل محبت —! انوکھا سا پیار —!  
 عثمان کی خوشی کی انتہا نہ رہی — بیخود ہوتے ہوئے اس نے بڑھ کر عائشہ  
 کو بازوؤں میں بھر لیا —

"تم دیکھنا تو سہی عائشہ! اپنے اس فیصلے پر عمر بھر کبھی نہیں پچھتاؤ گی —"  
 عثمان نے اسے اپنے سینے کے ساتھ جھینچ لیا — "اور میں — میری تو  
 عین دلی تمنا تھی — میری تو آج خوشیوں کی انتہا نہیں ہے — اوہ میری عائشہ!  
 میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں — تم نے مجھے اتنا کچھ دے دیا ہے —  
 اتنا کچھ — کہ میں اس قابل نہیں تھا —"  
 پھر اس نے جھک کر بڑے پیار سے عائشہ کی آنکھوں میں بھانکا —

تم نے مجھے نئی اور بڑی خوبصورت زندگی دی ہے — اس کے بدلے میں  
 میں بڑا حسین اور جگمگاتا ہوا مستقبل دوں گا عائشہ! تمہارا ایک بڑا پیارا سا گھر  
 — بالکل ایک چھوٹی سی جنت —! "عثمان بے خودی کے عالم میں  
 ہمارا تھا اور عائشہ بڑی محویت سے سُن رہی تھی — ہونٹوں پر ایک لکڑیز  
 لمبیے —!

"دنیا کی ہر آسائش میں تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا — تمہارے لیے  
 ہی نزدیکوں گا — پھر دونوں ہر شام سیر کے لیے جایا کریں گے — دُور بہت  
 —! کسی باغ کی کچھ تنہائی میں — کسی دریا کے خاموش کنارے پر — عائشہ!  
 بہت خوش رہیں گے —"

ایک کو معلوم ہوا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی — وہ دُکھ جو اندر ہی اندر انہیں  
 دھکی لیے رکھا، کہ ان کے بعد عائشہ کا کیا بنے گا، جیسے یکایک ہی رخ ہو گیا  
 اتنا خوبصورت اور مضبوط سہارا عثمان نے ان کی بے سہارا بیٹی کو دے دیا  
 — وہ انہیں فرشتوں سے بھی بلند مقام پر کھڑا دکھائی دینے لگا — پہلے  
 عائشہ اس سے بہت پیار محبت سے پیش آیا کرتی تھیں مگر اب تو کچھ اور بھی  
 لایں اضافہ ہو گیا تھا —

عائشہ کی طرف سے تسلی بخش جواب پانے کے بعد عثمان نے اپنے گھر والوں  
 بات کر ڈالی — اس نے کسی سے کچھ نہیں چھپایا — عائشہ کے متعلق پہلے  
 باب کو باخبر کر دیا —

گھر کے کچھ افراد نے یہ بات ناپسند کی — کچھ نے خاموشی اختیار کر لی۔ شاید  
 ان کی اندھی طبیعت کو جانتے تھے کہ کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں — اور

کچھ نے آنے والی زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق اسے سمجھانے کی کوشش کی۔  
مگر عثمان ہر چٹان سے ٹکرا گیا۔ ہر بحث کا اس نے مدلل جواب دیا۔  
کبھی کی ناپسندیدگی کی پرواہ نہ کی۔

”ٹھیک ہے۔ آپ کے کہنے سے میں عائشہ سے شادی نہیں کر دوں گا۔  
مگر پھر اس کے بعد میری زندگی کی تنہائی و بربادی کے آپ سب ذمہ دار ہوں گے۔  
نہیں اس کی اس بات سے ڈر گئے۔“

عثمان نے کچھ بھی عائشہ سے نہیں چھپایا۔ شاید اس لیے کہ وہ پہلے ہی  
خود کو ہر پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی نگاہ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رکھے۔  
اور جب جب اسے عثمان کے گھر والوں کے خیالات کا علم ہوتا رہا وہ اسے  
پھر۔ پھر۔ اور پھر بھی یہ قدم اٹھانے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔  
اس نے غازی بڑھ پڑھ کر باری تعالیٰ کے حضور دعائیں بھی مانگیں کہ خود بخود ہی  
کوئی ایسی راہ نکل آئے جو عثمان اپنی ضد سے باز آجائے۔

وہ ایسی شادی کے قطعی خلاف تھی جو والدین کی مرضی کے خلاف کی جائے۔  
مگر۔ نہ ہی عثمان کو سمجھانے کا کوئی اثر ہوا اور نہ کوئی دعا پوری ہوئی۔  
ان کا مقدر تو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو چکا تھا۔ پھر کچھ اور کیا  
ہوتا۔! اور ان کا مقدر ایک دوسرے سے وابستہ تھا اس لیے عثمان کے  
گھر والوں کو اس کی ضد کے آگے سر جھکانا ہی پڑا۔

پھر ایک دن چپکے سے ان کی منگنی کی رسم ادا ہو گئی۔ عثمان کی امی اور  
بہنیں اسے انگوٹھی پہنانے آئیں۔ کچھ خاموش خاموش سی تھیں۔ پہلے  
پہلے بیٹے کی منگنی تھی مگر وہ جوش و خروش اور دلوں سے نہ تھے جو ہونا چاہئیں تھے

عائشہ نے دیکھا۔ غصہ کیا۔ مگر خاموش ہو رہی۔ صرف عثمان۔

باخاطر۔! رات کو بستر میں گھس کر چپکے چپکے آنسو بھی بہائے۔ کیسے عجیب نصیب  
تھے اسے۔! عثمان اگر اس کی تاریک زندگی میں روشنی کی کرن بن کر آیا  
تھا تو سہمی سہمی اور لرزتی ہوئی سی۔!! یہ کیسی خوش بختی تھی۔ یہ کیسا  
الٹا تھا۔؟؟

وہ ہر وقت سوچوں میں کھوئی رہتی۔ مگر عثمان اسے پریشان کبھی نہ ہونے  
بانتا۔

”تم اور کسی کے متعلق کچھ نہ سوچو عائشہ۔! زندگی ہمیں اکٹھی گزارنا ہے۔  
دونوں نے۔ مجھے دیکھو میں کبھی کسی کی پرواہ نہیں کرتا اور خوش رہتا ہوں۔  
ہمیں دنیا والوں کی پرواہ کرنا چھوڑ دو۔ بہت خوش رہا کرو گی۔“  
عثمان کے سمجھانے کا وقتی سا اثر ہو جاتا مگر اکیلے ہوتے ہی پھر اسی قسم کے  
خیالات اس کے دل و دماغ پر یورش کر ڈالتے۔ اور یوں ہی دبہا اور پریشانی  
میں وقت گزرتا رہا۔

منگنی سے چند مہینوں بعد ان کی شادی ہونا طے پا گئی۔ دونوں طرف  
سے شادی کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہونے لگیں۔  
اب تو اکثر عثمان کی بہنیں اور ماں ان کے ہاں آنے لگی تھیں۔ عائشہ  
بہنیں سٹیٹائی سٹیٹائی سی رہتی۔ کچھ اپنے آپ میں ہی شرمندہ شرمندہ سی کہ جیسے  
ان نے ان کا کچھ چھین لیا تھا۔

یہ احساسات اسے کوئی بھی خوشی، خوشی سے نہیں منانے دے رہے تھے۔

۳۱۔ اول اندر ہی اندر بچھا بچھا سا رہتا — نجانے کیا ہو کیا تھا اسے — ؟  
 اور اسی قسم کے جذبات و احساسات لیے وہ ایک دن عثمان کے گھر میں،  
 اس کی بیوی بن کر چلی گئی —

اس کی توقعات کے خلاف عثمان کے گھروالوں نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ کسی نے لمحو بصر کے لیے بھی اسے اس کی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

گھر میں ایک بھوکا جو مقام ہوتا ہے۔ وہ پورے کا پورا انہوں نے اسے دیا۔۔۔ سب ہی اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے۔ بچہ بچہ اس سے پیار کرتا اور اس کی عزت کرتا۔۔۔

دن عید اور رات شب برات ہو کر گزرنے لگی۔ عائشہ کو تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی سہنا دیکھ رہی تھی۔ بے حد حسین پسندا۔ عثمان بن بدن اس کی محبت میں زیادہ سے زیادہ ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کی بھی غائبت سے جھڑائی اسے گوارا نہ تھی۔

چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ عثمان کے ساتھ ہی آگئی۔ — کالج ہی کی کیا بات  
میں ایک چھوٹا سا اور بڑا خوبصورت ان کا گھر تھا۔ —

عثمان نے سب اس کا تعارف کرایا۔ اپنے دوستوں، پروفیسروں اور طلباء  
کسی سے بھی اس نے غائبہ کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

دوستوں نے دعوتیں کیں۔ وہ بڑی خوشی خوشی عائشہ کو ساتھ لے کر گیا۔ کوا  
عارضوس نہیں کی۔ لمحہ بھر کو بھی یہ نہیں سوچا کہ کوئی کیا کہے گا۔؟  
اول تو اسے کسی کی پرواہ ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی کسی نے اس کی پابجھا

۳۲۵ ان کی ایسی ارح و ادنی محبت — ایسے ہی سے بری محبت سے بھی علی ۳۲۵  
 ل — وہ خدا کا شکر ادا کرتے کرتے نہ تھکتی تھی —

عثمان میں کوئی کمی نہیں تھی — خوبصورت تھا — لائق تھا اور اچھی خاصی کھاتی  
 لاکھا — اس کے زو بہاگ بڑے خوبصورت طریقے سے جاگے تھے —  
 اطمینان تھی — ! وہ خوش تھی — !!

اور اب وہ خود کو دنیا کی حقیر ترین اور ناکارہ مخلوق نہیں سمجھتی تھی کہ اس  
 محبت کرنے والا عثمان موجود تھا — ہر لمحہ اس کا خیال رکھنے والی زندگی  
 اس اور سر تھی — سوسائٹی میں اب اس کا ایک مقام تھا — عثمان کے نام کے ساتھ  
 اور ایک عورت کو اور کیا چاہیے — سب کچھ ہی تو اس کے پاس تھا —

ایک ٹانگیں نہیں تھیں تو کیا ہوا — سچ ہے خدا بے انصاف نہیں — !!  
 خدا کی دی گئی نعمتوں کا وہ کسی طرح شکر ادا نہیں کر سکتی تھی مگر عثمان نے اس  
 لیے جو کچھ کیا تھا اس کا بدل تو وہ اسے کئی طریقوں سے دے سکتی تھی —  
 شادی کے ابتدائی چند ماہ گزرے تو اس نے آہستہ آہستہ گھر کے چھوٹے چھوٹے  
 ام مہنانا شروع کر دیے — جیسے تیسے بھی — کبھی کسی کا سہارا لے کر —  
 عثمان ہی کی مدد سے باورچی خانے میں چلی جاتی — اس کی پسند کی چیزیں  
 اپنے ہاتھ سے بناتی —

ضرورت پڑنے پر کپڑے وغیرہ بھی دھو لیتی — جو کچھ کر سکتی تھی کرنے  
 لگتی — عثمان کے منع کرنے کے باوجود — !

اسے احساس تھا کہ وہ ایک ایسے خاوند کی بیوی تھی جس نے اس کے لیے  
 کیا تھا کہ دوسرا کوئی نہ کر سکتا تھا — اس لیے اس کے کام کر کے

۳۲۴ "بھئی ایک نہ ایک دن تو آخر مرنا ہی ہے —"  
 "خدا میری زندگی میں ایسا وقت نہ لائے —" عائشہ اس کی محبت میں  
 سرشار ہو کر بے اختیار کہہ اٹھتی — "کہ تمہیں کچھ ہو —"

"اور جو میں بھی تمہاری ایک لمحے کی بھی قربانی برداشت نہ کر سکوں —" عثمان  
 بڑی بخیدگی سے کہتا — "الگ الگ دنیا میں آئے تھے اور صاف ظاہر ہے  
 باری باری ہی جائیں گے — یہ تو ممکن نہیں کہ ہم دونوں کی موت کا ایک ہی وقت  
 مقرر ہو —"

"وہ تو ٹھیک ہے کہ باری باری ہی جائیں گے — ویسے بہتر یہی ہو گا نہ!  
 کہ میں تمہارے ہاتھوں میں ہی موت کو گلے لگاؤں — مجھے آخر دم تک تمہاری ضرورت  
 ہوگی — آخر دم تک —" عثمان نے عائشہ کو اپنے ساتھ لپیٹ لیا —  
 میرے تو تم نے صبح کہا —

سوچتے ہوئے بولا — "پہلے میں ہمیشہ خدا سے یہی دعا کیا کرتا تھا کہ میری زندگی  
 میں تمہیں کچھ نہ ہو — اب یہ دعا مانگا کروں گا کہ یا تو ہم دونوں کو اکٹھے ہی لے لیں  
 پیش آجائے تاکہ پھر ایک دوسرے کی قربانی کا غم ہمیں سہنا ہی نہ پڑے — اور اگر  
 ایسا نہ ہو تو پھر تم میری زندگی میں ہی انجام کو پہنچو — میرے بعد میری حالت  
 ٹھوکریں کھاتی پھرے — یہ بھی تو مجھے گوارا نہیں —"

اور عثمان کی اسی بے پایاں محبت اور غلوں نے عائشہ کو خود اعتمادی میں  
 دولت سے مالا مال کر دیا — اب اسے نہ اپنی اپا بھئی کا احساس رہا نہ کسی محرومی کا  
 وہ جو اکثر اپنے خدا سے تنہا ہی رہتی تھی اب اس کے انصاف کی معترف تھی —  
 اگر اس سے خدا نے ٹانگیں چھین لی تھیں تو اور تو بہت کچھ دے رکھا تھا —

بے حد خوشی ہوتی — بے حد سکون ملتا — !!

مے زیادہ دلچسپی ہے —

اور اسے کام کرتے دیکھ کر عثمان بھی خوش ہوتا کہ وہ اپنی زندگی میں پہلی

بیلنے لگ گئی تھی —

یونہی سہمی خوشی وقت گزرنے لگا — اور پھر شادی کو ایک ہی سال گزرا

تھا کہ خدا نے اسے وہ نصیب بھی دے دی جس کے بغیر عورت خود کو مکمل نہیں

ہے — ان کے سدا بہار چہن میں ایک ننھی سی کوئل سی کلی کھل گئی —

عثمان کی خوشی کی انتہا نہ رہی — زیادہ خوشی اسے اس بات کی تھی

عائشہ کے دل میں بیٹھا ہوا خوف دُور ہو گیا تھا کہ شاید اس کی وجہ سے عثمان

کی زندگی کے چہن میں معصوم معصوم کلیوں کی مسکراہٹیں نہ بکھر سکیں —

اور یہ مسکراہٹیں بکھریں تو ان کی زندگی بھی قہقہے لگا اٹھی — خوش بختیاں بٹھانے

پر تلگوانے لگیں — کامزبوں نے قدم چومے — !

بچی چند ماہ کی تھی کہ عثمان نے امریکہ جاکر پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے لیے دینی

کی جو درخواست دی تھی منظور ہو گئی —

”یہ سب تمہارے اور اس بچی کے دم قدم ہی کی برکتیں ہیں عائشہ! دیکھو —

خدا مجھے کتنا کچھ دیے جا رہا ہے — میں نے آج سے تین سال پہلے درخواست

دی تھی — اس وقت منظور نہ ہوئی — اور آج جب کہ میں بھولی چکا تھا

منظور ہو گئی — سب تمہاری قسمت ہے —“

پاس ہی بچی بیٹھی کھلونوں سے کھیل رہی تھی — عائشہ نے جھک کر اسے

”یہ میری بیٹی بڑے مقدر والی ہے —“

”بیٹی کا نصیب اچھا ہو گا تو ماں کا کیسے خراب رہے گا — ہمیں تو اپنا

”دیکھو عثمان! اب ہم دونوں کے لیے پہلے یہ اور پھر کوئی اور —“

”یعنی —“ عثمان نے بڑے پیار سے عائشہ کا چہرہ اپنی جانب موڑا اور

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا — ”میرے لیے بھی تمہارا یہی

مول ہو گا کہ میرا دوسرا نمبر —“

”نہیں — وہ — میرا مطلب تھا —“ عائشہ بوکھلا گئی —

”یہ بات غلط ہے عائشہ —! اپنی اتنی پیاری بیٹی کے ہوتے ہوئے بھی

میرے دل نے تمہیں ہمیشہ پہلا مقام دیا ہے —“

”تو میں نے اسے تم پر کب ترجیح دی ہے —؟“ عائشہ نے اپنا سر عثمان

کے کندھے پر ٹیک دیا — ”تمہارا درجہ میری نگاہ اور تمہارا مقام میرے دل میں

ایسے اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا عثمان! یہ تو تم کبھی بھولے سے بھی نہ سوچنا —“

عثمان نے عائشہ کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اپنی جانب اٹھاتے ہوئے غور سے

اس کی آنکھوں میں جھانکا — اتنا خلوص اور اتنا گہرا پیار تھا ان نگاہوں میں کہ

عثمان بے خود سا ہو گیا —

”تمہاری محبت پر مجھے فخر ہے عائشہ اور ہمیشہ رہے گا —“ اس نے

دالہانہ انداز میں اسے پیار کر لیا —

عثمان کے امریکہ جانے کی تیاریاں ہونے لگیں — پورے دو سال کے لیے

وہ جا رہا تھا — دونوں ہی بے حد اس تھے — شادی کے بعد تو صرف دو

ہفت روزہ

سال ہی اٹھا کر لے کر اس سے پہلے کی ان کی رفاقت حاضمی طویل تھی۔  
 پانچ چھ سال کا زمانہ — یوں وہ آٹھ سال سے ایک دوسرے سے وابستہ تھے  
 اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے بعد یہ آنے والی جدائی بڑی شاق گزر رہی تھی۔ کئی  
 دن دونوں ہی بڑے چپ چپ سے رہے۔ آخر جب جانے کا دن بالکل  
 ہی قریب آگیا تو عثمان نے بہت دھیرے دھیرے اسے سمجھایا —  
 ”تم اکیلی ہوئیں تو میں ضرور تمہیں ساتھ لے جاتا — کیونکہ خود مجھ سے تمہاری  
 جدائی برداشت نہ ہو سکے گی مگر —“ عثمان نے ایک نگاہ اس کے پاس ہی  
 سوئی ہوئی بچی پر ڈالی —

”اب ہمیں اپنے جذبات پر اسے اور اس کی ضروریات کو ترجیح دینا ہوگی۔“  
 ہماری ذمہ داری ہے — اور یہ ہمیں ہی نبھانا ہوگی —“ ساتھ ساتھ بڑے  
 سے عائشہ کے اداس چہرے کو دیکھ کر جا رہا تھا —  
 ”اس کے پاس ماں باپ میں سے ایک کا ہونا بہت ضروری ہے اور تم پر مجھے  
 پورا اعتماد ہے — تم، جو خود اتنی اچھی عادات کی مالک ہو یقیناً اس کی تربیت  
 بھی اچھی ہی کرو گی۔“

عائشہ چپ چاپ سنتی رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔  
 خود عثمان کی آواز بھی حلق میں اٹھی جا رہی تھی —  
 ”یہ اولاد خدا کی نعمت ہوتی ہے اور اس کی اگر اچھی طرح حفاظت، پرورش  
 اور صحیح اور اعلیٰ تربیت نہ کی جائے تو انسان خدا کا دین دار ہوتا ہے۔ آؤ آج تو اللہ  
 خدا کے حضور دعا کریں کہ وہ ہمیں اس گناہ کا مرتکب نہ ہونے دے اور یہ اسی طرح  
 ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی جدائی کو ہنس ہنس کر ہمیں اور اپنی تمام

راہگی پرورش —“

پھر عثمان مسکرایا — عائشہ رونے جا رہی تھی اسے بھی تو بہلانا تھا —  
 ”تم دیکھنا تو سہی میں دماں سے لہنی بیٹی اور اپنی عائشہ کے لیے کیا کیا کچھ  
 لے کر آتا ہوں —“

”مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں عثمان! بس تم سلامتی سے واپس آ جاؤ۔“  
 ”اچھا! تمہیں ضرورت نہیں تو مجھے تو ہے۔“  
 ”کس چیز کی —؟“

”اگر اجازت دو تو اپنے لیے ایک ننھی سی —“ عثمان نے انگلی اور انگوٹھے  
 سے ناپ بتایا — ”بالکل ننھی سی میم لے آؤں —؟ بچپن سے دل میں شوق  
 رکھتے ہوئے ہوں۔“

عائشہ بے اختیار ہنس پڑی —  
 ”لے آنا — میری بیٹی کا دل بھلایا کرے گی۔“  
 ”اور ساتھ اس کے ابو کا بھی۔“

”اس کے ابو کو کیا میم کی ضرورت ابھی باقی ہے —؟“  
 ”کیوں نہیں —“ عثمان نے مسکرا کر کنکھیدوں سے عائشہ کو دیکھا —  
 ”دل تو بوڑھے مرد کا بھی سدا جوان رہتا ہے اور میں تو خود بھی ماشا اللہ  
 بالکل جوان ہوں۔“

”عثمان!“ جانے کیا ذہن میں آیا — عائشہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی —  
 ”اگر تمہیں زندگی میں کبھی بھی یہ خیال آئے کہ مجھ سے شادی کر کے تمہیں کوئی غرومی



ملی ہے تو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ تم دوسری شادی کر سکتے ہو۔  
 میں تمہارے گھر کے کسی کونے میں پڑ کر بھی زندگی گزار لوں گی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“ عثمان نے اسے پھینچ کر سینے سے لگا لیا۔  
 ”یقین کر دو اگر مجھے کوڑ جہنم ملیں اور ہر جہنم میں مجھے بیوی کا انتخاب کرنے کا  
 جائے تو خدا کی قسم میں ہر بار تمہیں منتخب کروں گا۔ میری بیوی صرف تم  
 ہو سکتی ہو۔ صرف تم۔!“

عائشہ کے رونیں رونیں میں عجب سی سرخوشی پرچ بس گئی۔ عثمان کو اسے  
 اس عائشہ سے، جو کسی قابل نہ تھی، اتنی محبت تھی۔ ایسی شدید اور بے پایاں  
 وہ گویا بلبلوں پر پودہ از کرنے لگی۔

”اوہ عثمان! تم اتنے پیٹھ ہو۔ فرشتوں سے بھی کوئی برتر نہ تھی۔“ عائشہ  
 بڑی عقیدت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اور ہاں یہ تو تمہیں علم ہی ہے کہ میں کل جا رہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں  
 تمہیں میری امانت کی پوری پوری حفاظت کرنا ہوگی۔ وعدہ کرتی ہوں۔“

”یہ جیسی تمہاری بیٹی ہے ویسی ہی میری بھی ہے۔ فکر نہ کرو اپنے سنے یا  
 اس کا خیال رکھوں گی۔“

”بس اس کی بات نہیں کر رہا۔ تمہارے ہوتے ہوئے مجھے اس کا فکر بالکل  
 نہیں۔“

”پھر۔۔۔؟“

”میں اپنی امانت کے متعلق کہہ رہا ہوں۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”خاصی کوڑھ مغز ہو۔“ عثمان نے بڑے پیار سے اسے دیکھا۔  
 ”میری امانت یہاں سوائے عائشہ کے اور کون سی ہو سکتی ہے۔“

”اوہ۔۔۔!“

”بس مجھے اس کا کسی نہ کسی طرح یقین دلادو۔ مجھے ایک یہی فکر تار رہے گا۔“  
 عثمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”جیسے میں تمہارا سر پر خیال رکھتا ہوں۔ وعدہ کرو میری غیر موجودگی میں تم  
 اسی طرح اپنا خیال رکھو گی۔ میری پھر سمجھ کر، میری امانت جان کر۔! چاہت ہو۔“

اپنی خوراک و لباس اور ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا۔۔۔

عثمان نے اس کا ہاتھ زور سے دبایا۔

”میں سامنے نہیں ہوں گا لیکن میرا خدا تو تمہیں ہر وقت دیکھے گا۔ بس اسی کو  
 گواہ بنا کر مجھ سے وعدہ کرو۔“

عثمان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ عائشہ کا سر اس کے سینے پر ٹھک  
 گیا۔ عثمان نے اسے اپنے ساتھ پھینچ لیا۔

”کاش! ایسا ممکن ہوتا عائشہ! کہ میں تمہیں اپنے سینے کے اندر کہیں چھپا سکتا۔  
 ہم میں اتنا بھی فاصلہ نہ رہتا۔ پھر۔۔۔ پھر تم مجھ سے جدا تو نہ ہوتیں۔ میں تمہیں  
 کیسے بتاؤں کہ تم سے جدا ہونا میرے لیے کتنا مشکل ہے اور کتنا تکلیف دہ اور کتنا  
 اذیت ناک۔۔۔!“

اگلے دن عثمان امریکہ روانہ ہو گیا۔ عائشہ اکیلے گھر میں کیسے رہتی۔ ہانے سے  
 پہلے بچی کو اور اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ دیا۔ سسرال والے اتنے خیر خواہ  
 تھے کہ خود ہی انہوں نے عائشہ کو ماں کے پاس رہنے کی اجازت دے دی۔

جائے تھے کہ جو آرام اور سکون اسے ماں کے پاس مل سکتا تھا وہ نہیں اور میں  
 ماں کو تو اسے سنبھالنے کا ڈھب آتا تھا۔ ایسا نہ ہوا ان کے پاس رہ کر اسے کوئی  
 تکلیف پہنچے۔  
 دیکھئے ہر دوسرے تیسرے دن اس کی اور بچی کی خیر و عافیت پوچھنے کے لیے  
 کوئی نہ کوئی آتا رہتا۔ کبھی ماں، کبھی باپ، کبھی کوئی بھائی اور کبھی کوئی بہن۔  
 انہوں نے حتیٰ الوسع کبھی بھی اسے عثمان کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ جب بھی  
 آتے اس کے لیے اور بچی کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ساتھ ہوتا۔

وہ جانتی تھی عثمان خاصا بے پرواہ واقع ہوا تھا۔ جس پر دل آیا بس اسی کا  
 ہوتا۔ پھر تو اسے والدین اور بہن بھائیوں تک کی پرواہ نہ رہتی۔ جب تک  
 اس رہا اسے کہہ کہہ کر، بتا بتا کر ہر رشتہ دار اور ہر عزیز کے حقوق و فرائض پورے  
 لاتی رہی۔

اب اتنی دُور چلا گیا تھا۔ وہ تو ٹھیک ہے اس کا عائشہ پر اور عائشہ کا  
 الپر سے پہلا حق تھا مگر والدین اور بھائی بہنوں سے شادی کے بعد رشتے  
 نرم تو نہیں ہو جاتے۔ انہیں بھی اس کی خیر خیریت کی اطلاع ملتی رہنا چاہئے تھی۔  
 عائشہ کو اس کا پورا احساس تھا۔

وہ ہر خط میں اسے تاکید کرتی کہ اس فرض میں کوتاہی نہ برتے۔ جتنے خط  
 اسے لکھتا تھا اتنے اس کے ماں باپ کو بھی جانا چاہئیں تھے۔ انہوں نے اسے  
 ہم دیا تھا اسے اتنے عیش و آرام دے کر پر دان چڑھایا تھا۔  
 اوریوں عائشہ کے ہر وقت سمجھاتے رہنے سے عثمان کی لاپرواہی کافی کم  
 ہوتی جا رہی تھی۔

اسے جب بھی موقع ملتا عائشہ اور بچی کے لیے کسی نہ کسی کے ہاتھ کوئی  
 نہ کوئی چیز بھیجتا رہتا۔ کتنی خوبصورت اور پیاری مٹھیں وہاں کی مصنوعات۔!  
 تبھی تو ہر کوئی بیرونی محالکے جانے کے لیے ترستا دکھائی دیتا ہے۔ عائشہ بچی  
 عثمان کو گئے چند مہینے گزر گئے تھے۔ وہاں کے لوگوں کو نزدیک سے

خود عثمان اتنی دُور رہ کر بھی اس کے اتنا قریب تھا کہ اسے کوئی پریشانی  
 یا اداسی محسوس نہ ہوتی۔ ہر دوسرے دن عثمان کا یہ طویل سا آٹھ دس صفحات  
 پر مشتمل خط آ جاتا۔

اس نے بڑی پیاری پیاری اس میں باتیں لکھتی ہوتیں۔ ایسے لگتا جیسے  
 پاس بیٹھا خود اس سے محو گفتگو ہو۔ وہی غلطی نہ اور شرارت بھرا انداز۔!  
 وہی میٹھی میٹھی باتیں۔!! وہی شرمیلیاں اور مسکراہٹیں۔!!

عائشہ کسی کئی بار اس کا خط پڑھ ڈالتی۔ مگر پھر بھی جی نہ بھرتا۔ پاس تھا تو  
 تب اس کی باتیں اور اس کی ہستی اتنی پرکشش تھی کہ عائشہ اور سب کچھ بھلا کر اس  
 میں محو ہو جاتی۔

دور گیا تو اس کی تحریر اتنی دلچسپ تھی کہ عائشہ اس کی محبت اور اس کے پیار  
 میں روز بروز زیادہ سے زیادہ ڈوبتی چلی گئی۔ وہ تو اب اسے پرستش کی حد تک  
 چاہنے لگی تھی۔

عثمان کی خواہش پر وہ بھی اسے لمبے لمبے خط لکھتی۔ بچی اب باتیں کرنے

دیکھنے کا موقع ملا تو وہ وہاں کی فضا اور ماحول سے بیزار سا ہو گیا۔  
کو وہاں کے متعلق بڑی تفصیل سے سب کچھ لکھتا۔

عوام کے رہن سہن کے متعلق۔! ان کے اخلاق و عادات کے متعلق!  
عثمان کو سوائے ان کی ایمانداری اور ملک کی ترقی کے اور کچھ بھی پسند نہیں آیا تھا۔  
”عربانی ہے تو حد سے زیادہ۔ عورت کی نسوانیت ہی باقی نہیں رہی۔  
نہ بہن کو بھائی سے شرم، نہ بھائی کو بہن سے۔“

پندرہ سولہ سال سے زیادہ عمر کی کوئی کنواری لڑکی یہاں کنواری نہیں رہتی۔  
کوئی حرامی بچہ پیدا کر دے۔ نہ والدین، نہ رشتہ دار، نہ حتیٰ ہمسائے اور نہ معاشرہ۔  
کوئی بھی بُرائی نہیں سمجھتا۔ شادی تو یہاں فضول سی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔

عورتیں سگریٹ مردوں سے زیادہ پیونکتی ہیں۔ شراب عام ہے۔ کوئی  
مذہبی پابندی نہیں۔ کوئی معاشرتی پابندی نہیں۔ تباہی رقص گاہوں میں لڑکوں  
کی غیر عورتوں کی باہوں میں اور عورتوں کی غیر مردوں کی باہوں میں گزرتی ہیں۔  
سینما گھر چلے جائیں تو وہاں مختلف کونوں میں مختلف جوڑے ایک دوسرے  
سے سرگوشیاں اور بری بری حرکتیں کرتے پائے جاتے ہیں۔ کسی سیرگاہ، پارک یا  
سمندر کے کنارے ٹکلی جائیں تو وہاں بے حیائی عام۔ سرعام ایک دوسرے  
سے لپٹے بوس بازی میں مصروف ہوتے ہیں۔

اس قوم کے افراد کا اخلاق تو بڑی طرح تنزل کی طرف جا رہا ہے۔  
عثمان بڑی حیرت سے سب کچھ دیکھتا اور اسے لکھتا۔

”پاکیزگی کا ان کے مذہب میں کوئی تصور ہی نہیں۔ البتہ جراثیم مارنے  
کے لیے ہاتھ وغیرہ ضرور دھو لیے جاتے ہیں۔ سر دھو لکے۔ کیا عورتیں،

یامد۔ مہینوں نہانے کا نام نہیں لیتے۔ کوری جیٹی چٹری۔ صاف تحائف ۲۵  
اب۔ خوشبوئیات عام۔ مہینے میں کئی کئی ڈالرتویہ لوگ خوشبوؤں پر  
زوج کر ڈالتے ہیں۔ اندرونی صفائی سے جی چرائیں گے اور خوشبوئیں مل کر صاف  
تھرے ہو جائیں گے۔

یہاں کی عورت دولت پیسے پر تو جان دیتی ہے۔ اور وہ پیسہ بے شک  
ایک غیر ملکی یا غیر مذہبی سے دوستی لگا کر ملے یا اپنے ہم ملک یا ہم مذہب سے۔  
انہیں دولت چاہیے۔ پھر تو اپنی اولاد تک کو بھلا ڈالتی ہیں۔ اپنے خاوند اپنے  
لڑکے انہیں پر واہ نہیں رہتی۔ یہ بھی کوئی دغا ہے۔؟

جانے یہ لوگ یہ عورتیں۔ یہ سب ایسے کیوں ہیں۔؟ یا تو ان کے  
لب کی آب دھوا ہی میں کچھ ایسی تاثیر ہے اور یا پھر۔ یا پھر۔ ناں یہ ہو  
سکتا ہے۔

میرے محمد کا مذہب بڑا پیارا ہے۔ اس میں پاکیزگی ہے۔ اس میں  
بہت دانت کا پیغام ہے اور یہ ہمیں حلال و حرام کی تمیز دکھاتا ہے۔  
اور یہ لوگ۔ سورجی حرام چیز بڑے ذوق و شوق سے کھاتے ہیں۔  
انے یا بھیڑ بکری کا گوشت بھی حلال نہیں مٹا۔ جانوروں کی گردنیں مشینوں سے  
لاٹ کر گوشت تیار کر لیا جاتا ہے۔

ان کے اجابت خانوں میں پانی کا استعمال نہیں ہوتا۔ سبھی کا غذا  
اتصال کرتے ہیں۔ گندگی اور غلاظت کی کوئی حد ہی نہیں۔ پھر ان لوگوں  
بل کیسے شرم و حیا، وفا و جفا اور پیار و محبت کا مادہ ہوگا۔ باطن پاکیزہ اور  
ماں ستھر ہوگا تو اخلاق و کردار بھی اچھے ہوں گے۔ اور جو جسم سور کی چربی اور

شراب جیسی حرام چیزوں سے پلے ہوں گے ان میں پاکیزگی کہاں سے آئے گی۔  
اور پاکیزگی نہیں ہوگی تو عرفانی، بے حیائی، زنا کاری، تعصب اور جھٹا۔ غلٹا  
ہر برائی عام ہوگی۔

بہت مشکل ہے کسی مسلمان کے لیے اس ملک میں رہنا۔ نگاہ تک کی  
پاکیزگی تو رہ نہیں سکتی۔ پھر یہ نہیں وہ کون لوگ ہیں جو یہاں آکر ہمیشہ کے لیے  
اس ملک کو اپنا بنالیتے ہیں اور یہاں کی عورت سے شادی رچا لیتے ہیں۔  
اس عورت سے جس کا ایمان دولت ہے۔ جو وفا کے نام سے ہر جہاد  
نہیں ہر چھ آٹھ سال بعد خاوند بدلتی ہے۔ نہ اس کی نگاہ میں شرم نہ زبان پر  
پاکیزگی۔ نجانے کیسے ایسی عورت کے لہجے سے اپنے بچے پیدا کر کے کو تیار  
ہو جاتے ہیں۔“

پھر عثمان نے اسے وہیں اپنے ساتھ والے فلیٹ میں رہائش پذیر کیا۔  
پاکستانی مسلمان لڑکے کے متعلق لکھا جس نے وہاں کی عیسائی عورت سے شاد  
کی ہوئی تھی۔ ان کے دو بچے بھی تھے۔

ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ نام مسلمانوں والے۔ مگر نہ انہیں مذہب کا  
تھانہ عقائد کا۔ کلمہ تک تو انہیں آتا نہیں تھا۔ ایک مسلمان کی یکسر لڑائی  
جب کبھی مسلمانوں یا عیسائیوں اور مسلمانوں یا اسرائیلیوں کے درمیان کوئی  
کوئی ملکی تنازعہ یا جنگ وغیرہ ہوتی تو اس مسلمان مرد کی عیسائی بیوی کھلم کھلا  
ہم مذہبوں یا اسرائیلیوں ہی کی طرف لڑی کرتی۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان کی بیوا  
ان کی فتح کے لیے دعائیں مانگتی۔

مسلمان مرد بیٹھا مسکرا مسکرا کر اسے دیکھتا رہتا۔ اپنے ہم مذہبوں کے

۳۳۴ بھروسہ نہیں ہنس کر سنا رہتا۔ یہ کیسی غیرت تھی۔؟ یہ کیسی جرات منی  
—؟؟—

بہت کچھ عثمان بے حد دکھی ہو کر لکھتا۔ اور پھر وہاں کا ماحول اور وہاں  
ل دیکھ دیکھ کر اسے اپنی یہ ٹوٹی پھوٹی عائشہ اور بھی اچھی لگنے لگی۔  
وہ، جو خوبصورت بھی تھی اور خوب سیرت بھی۔ کبھی کسی کا دل نہیں دکھاتی  
۔ کبھی کسی سے بد اخلاقی سے پیش نہیں آتی تھی۔ ہر ایک کا کام انتہائی  
یانی سے کرتی۔ کوئی اسے کچھ کہہ دیتا، کوئی برائی کرتا، کبھی بدلہ لینے کے  
نہ ہوتی۔

اپنے کام سے کام رکھتی۔ چھوٹے بڑوں کے حقوق اور اپنے فرائض کا  
رکھتی۔ سچی الو سچ خود بھی پورے کرتی اور عثمان سے بھی کراتی۔ جائز  
باز کو سمجھتی تھی۔ کبھی عثمان کو کسی ناجائز کام کے لیے مجبور نہ کرتی۔ جتنی  
ہوتی۔ اسی میں بڑی سادگی اور قناعت سے گزارہ کر لیتی۔

ان سب کا عثمان کو اعتراف تھا اور وہ عائشہ کو پا کر بے حد خوش تھا۔  
ان کی جدائی کا ایک سال گزر گیا۔ اسی طرح بچی کے لیے تحائف آتے رہے۔  
رے دن عثمان کا خط بھی آجاتا۔ ویسا ہی پیار و محبت سے لبریز۔ وہی  
لی جیسی گرم جوشی۔ پھر ڈیڑھ سال اور پھر پونے دو سال گزر گئے۔  
پار پانچ ماہ تک عثمان امتحان سے فارغ ہونے والا تھا۔ عائشہ بے حد  
تی۔ وہ آنے والا تھا۔ اس کا فرشتہ سیرت خاوند۔ اس کی  
اپ۔!!

بڑے جادو سے اس نے عثمان کی تصویر دکھا دکھا کر بچی کو ابو کہنا سکھا دیا تھا۔

اب تو وہ باتیں بھی کافی لڑیتی تھی۔ عایشہ اس سے پوچھتی۔ "بولو کیے  
 بولکی۔" وہ ننھے ننھے دونوں بازو پھیلا کر کہتی۔ "ایسے۔" عایشہ نہال  
 ہو ہو جاتی۔

بڑی پیاری بچی تھی۔ بے حد پیاری اس کی باتیں اور اس کی حرکتیں تھیں  
 عایشہ وہ نظارہ دیکھنے کو بڑی بے تاب تھی جب باپ بیٹی کا ملاپ ہوتا تھا۔  
 تصویریں اکثر جھپٹتی تو رہی تھی مگر وہ بات کہاں۔! جویوں جیتی جاگتی  
 نرم گرم، ہنستی کھیلتی سلسلے دکھائی دینے والی گڑیاں تھیں۔  
 ننھی منی کو چھوڑ کر گیا تھا۔ اتنی ننھی منی کہ ابھی چلنا بھی نہیں سیکھی تھی۔ اور  
 اب تو وہ سارا سارا دن باہر لان میں اور اندر گھر میں بیٹاگتی پھرتی رہتی تھی۔  
 ساتھ زبان بھی خوب خوب چلتی۔

ایسی عجیب عجیب فرمائش کرتی کہ جو پوری بھی نہ کی جاسکتی اور پوری نہ کی  
 جاتیں تو پھر خوب دہائی چیتی۔ عثمان بھی تو اپنے ہر خط میں اسے تاکید کرتا تھا  
 کہ اس کی بیٹی کی کوئی خواہش رد نہ کی جائے۔ کوئی بات ٹالی نہ جائے۔  
 ایک ہی تو اس کی بیٹی تھی۔ اس کا سب کچھ اور کس کے لیے تھا۔!  
 مذاق ہی مذاق میں ایک دن عایشہ نے اسے لکھ دیا۔  
 "تمہاری بیٹی ابھی سے سیر سپاٹے کی بڑی شوقین ہے۔ جب تک ٹکیا یا  
 رکٹے میں بیٹھی رہے بے حد خوش رہتی ہے۔"  
 جواب میں عثمان نے لکھا۔

"اگر وہ اتنی شوقین ہے تو کسی بات کی پرواہ نہ کیا کرو۔ بے شک کتنا کرایہ

۳۹ لے جائے اسے روز میر کرانے بھیجا کرو۔ میں جب واپس آؤں گا تو اسے ایک  
 شہلے دول کا۔ صاف ظاہر ہے دوسرے رکٹے ڈرائیوروں کی طرح وہ بھی  
 پنے رکٹے کا میٹر تیز رکھا کرے گی مگر۔ میں پھر بھی سارا دن اسی کے رکٹے میں  
 بٹھا ہوا کروں گا۔"

عایشہ نے یہ پڑھا تو بڑی دیر ہنستی رہی۔ مذاق کے ساتھ ساتھ ان فقروں  
 سے بیٹی کے لیے جو پیار و محبت عیاں تھا۔ اس نے عایشہ کو بہت متاثر کیا۔  
 یہ اندازہ بخوبی ہو گیا کہ عثمان کے دل میں اگر اس کا مقام بہت بلند تھا تو  
 اولاد کے لیے بھی کچھ کم محبت نہیں تھی۔

اپنی بیٹی کے لیے وہ اتنی پیاری اور محبت بھری باتیں لکھتا تھا۔ عایشہ  
 لڑائی کی انتہا نہ رہتی۔ پھر وہ اس ننھی سے ذات کے ساتھ اکثر بڑے پیارے  
 بارے مذاق بھی کر بیٹھتا۔

ایک بار عایشہ نے اسے لکھا۔ "یہ کو کا کولا بڑے شوق سے پیتی ہے۔  
 اتنے شوق سے۔ کہ ایک تھم نہیں ہو چکتا دوسرے کی رٹ لگ جاتی ہے۔"  
 "پھر کیا ہے۔ چھٹا مانگے تم اسے دیا کرو۔" عثمان نے جواب دیا  
 "بڑی بات یہی ہے تاکہ زیادہ پینے سے اس کے اندر گیس بھر جائے گی اور  
 ایسی عمارے کی طرح اڑ کر چھٹ کو جا لگے گی۔ تو اس کا فکر نہ کرو۔ تھوڑی  
 بہر جب گیس نکل جائے گی تو خود ہی نیچے بھی آجایا کرے گی۔ بس تم اس کی  
 بات ٹالا نہ کرو۔ آخر میں کتنا کس کے لیے ہوں۔ چلو جلدی سے اسے منگوا  
 ڈھیر سارے کوکے کو لے۔!"

بچی کی بہتی نے ان دونوں کی زندگی میں بہت ساری دلچسپیاں بھر دی تھیں۔

ان کی محبت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا — اور ان کی ازدواجی زندگی کو ایک بڑی خوبصورت سی مضبوط ڈور سے کس کر باندھ دیا تھا —

ایسی ہی پیاری پیاری باتیں اور چھیڑ چھاڑ اکثر ہوتی رہتی۔ عائشہ کو خیال آیا۔ جانے سے پہلے بھی عثمان ایسا ہی شریف تھا — یونی بچی کے متعلق الٹی سیدھی باتیں کر کے عائشہ کو تنگ کیا کرتا — ایک دن بیٹھا بیٹھا کہنے لگا۔  
”ذرا یہ بڑی ہو جائے پھر دیکھنا اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔“ بڑا بڑا ہورہا تھا۔

”میں نے اسے پڑھانا بالکل نہیں — سارا دن اس سے بچہ منگوا کر میں گھر کی صفائی کرایا کریں گے — کھانا پکوائیں گے — کپڑے دھووائیں گے — غرض سارا دن خوب کام لیا کریں گے اور۔“  
عائشہ بڑی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی — وہ اپنی اتنی پیاری بیٹی کے متعلق یہ سب کچھ کہہ رہا تھا —!

”اور کھانے کو اسے اپنی جھوٹی روٹی اور باسی والے پانچاڑے دیا کریں گے پھر رات ہوگی تو ہر کام سے فارغ ہو کر بھاری تھکی ہوئی ٹانگیں بھی دیا کرے گی۔ اور پھر — زمین پر بوری ڈال کر سو جایا کرے گی۔ اسے نرم نرم بستر بھی نہیں ملے گا۔“  
”ہائے ہائے۔“ عائشہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا — بے اختیار چیخ پڑی تھی اور بچی کو گود میں بھر کر پیار کرنے لگی تھی۔

”میں اس پر سے قربان ہو جاؤں — بھی عثمان! آئندہ ایسی بات نہ کرنا۔“  
”یہ تو تمہیں علم ہی ہے کہ نرمی سے اولاد سر پر چڑھتی ہے۔ یوں شاید کچھ ٹھیک رہے۔“

سنجیدہ عثمان کی زیر لب مسکراہٹ پھر عائشہ کو سمجھا دیتی کہ وہ محض مذاق کر رہا تھا۔ اپنے آپ پر ہی ہنس دیتی — بھلا اولاد کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کر سکتا ہے؟  
روہ خواہ مخواہ ہی پریشان ہو گئی تھی۔

اور بھی کسی کے لیے نہیں — عثمان اور اس کی بیٹی کے تعلقات کے لیے۔ عثمان، جو بیٹی کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا۔ بیمار ہوتی تو ساری ساری بات آنکھوں میں کاٹ کر گزار دیتا۔ وہ بھلا کس طرح بیٹی سے اس قسم کا سلوک بلاتا تھا۔

اور اب — خطوں میں بھی کبھی ویسا ہی پیار اور کبھی ویسی ہی چھیڑ۔! ایشہ خوش تھی کہ اس دو سال کے عرصے میں عثمان میں کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی۔ عثمان کی عظمت اور محبت پر اس کا اعتماد اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔!!  
اس دن دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئی تو ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ زہرا دھرام میں مصروف تھی۔ اچھی نے وضو کے لیے پانی لا رکھا۔ وضو کرنے ہی تھی کہ ملازمہ نے خط لا کر دیا۔

”ابو کا کت۔“ بچی نے ددر سے ہی نعرہ مارا۔ عائشہ مسکرا پڑی۔  
”ایمانی ہو گئی تھی۔ پانچ دس مختلف قسم کے خط اس کے سامنے رکھ دیے جائیں۔ ان میں سے باپ کا فوراً پہچان لیتی تھی۔“

پیار بھری نگاہوں سے بیٹی کی جانب دیکھتے ہوئے عائشہ نے ملازمہ کے اُسے خط لے لیا۔ لفافے پر خلاف معمول صرف ”عائشہ“ اور نیچے باقی لکھا تھا۔

یوں تو عثمان نے کبھی بھی نہیں لکھا تھا۔ پریشان سی ہوتے ہوئے جلدی

سے کہنے لگی لیکن دوسرے ہی لمحے سوچنے لگی کہ خدا کے حضور حاضری دینے کی  
 تھی پہلے اس سے فارغ ہونا چاہیے۔

بند لہافہ ایک طرف ڈال دھو کر نے لگی۔ پھر نماز کے نیت باندھ لی۔  
 گردھیاں خط میں ہی لگا رہا۔ عثمان لہافے پر ہمیشہ ”سُمر عثمان“ ہی لکھا کرتا تھا۔  
 عارضہ کا نام تو اس نے کبھی بھی نہیں لکھا تھا۔ پھر آج ایسا کیوں تھا۔؟  
 جانے کیوں پڑی بے چینی سی عسوس ہو رہی تھی اور کسی انجانے خدشے کے تحت  
 دل دھک دھک کیے جا رہا تھا۔ جیسے تیسے غامض ہوئی۔ جلدی سے لہافہ  
 ہلاک کیا۔ ہاتھ کا پمپ رہے تھے اور دل دھڑک رہا تھا۔

انقلاب پر نگاہ پڑی۔ وہاں بھی روکھا سوکھا ”عارضہ“ ہی دکھائی دیا۔ وہ  
 عثمان نے تو اس کے بہت سارے پیار بھرے چھوٹے چھوٹے نام رکھ چھوڑے تھے  
 اب کہاں گئے تھے۔؟ اگلا فقرہ پڑھا۔ ہاتھوں کے ساتھ سارا جسم لڑا  
 اور دل کی دھڑکنیں وہیں کی وہیں تھم سی گئیں۔

”تمہارے نام یہ میرا آخری خط ہے۔“

کئی بار اس نے اس فقرے کو پڑھا۔ پھر کاغذ کو الٹا پلٹا۔ عثمان ہی کی تحریر تھی  
 مگر انداز۔! یہ کس کا تھا۔؟ اتنا غیر مانوس۔! اتنا اجنبی۔! اور اس کا  
 خط کا کیا مطلب۔؟

وہ اس کی محبوبہ تھی۔ اس کی بیوی تھی۔ اس کی بچی کی ماں تھی۔ ان کا  
 تعلق، ان کا بندھن تو اتنا مضبوط تھا کہ موت ہی ان کا آخر کر سکتی تھی۔ کہیں عثمان  
 کوئی ایسی ویسی حرکت تو نہیں کر بیٹھا تھا۔ کوئی خودکشی وغیرہ۔ کسی پریشانی  
 پریشان ہو کر۔!!

بے چین ہوتے ہوئے جلدی جلدی باقی سارا خط بھی پڑھ لئی۔ آٹھ دس  
 دن سے کم اس نے کبھی نہیں لکھا تھا کہ آج صرف دو صفحے تھے۔ لیکن ان کا  
 عارضہ کے پتے کچھ نہ پڑا۔ ایک بار پھر پڑھنے لگی۔

”یہ میرا تمہارے نام آخری خط ہے۔“

میں جو کچھ تمہیں کہنے لگا ہوں وہ نہ میرے لیے کہنا آسان ہو گا نہ تمہارے  
 لیے سنا۔ لیکن میں اب تمہیں زیادہ دیر اندھیرے میں نہیں رکھ سکتا۔  
 چار پانچ مہینے پہلے یہاں ایک لڑکی سے میری ملاقات ہوئی۔ پھر آہستہ  
 آہستہ ہمارے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ہم دونوں نے کٹھن بنا  
 شروع کر دیا اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ میں نے اس سے  
 شادی کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں اسے جیور نہیں سکتا۔ اور اگر  
 چھوڑ بھی دوں تو تمہیں وہ پیار اور خلوص نہ دے سکوں گا جو ایک بیوی کا  
 حق ہوتا ہے۔ اس لیے تم یہی سمجھو کہ عثمان مر گیا۔

یہ نہ سمجھنا کہ تم نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کی ہے یا تمہاری  
 کسی غلطی کے سبب میں ایسا کر رہا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ میں اعتراف کرتا  
 ہوں کہ مجھ میں ہی شاید وفا کا مادہ موجود نہیں۔ تم سے زیادہ نیک  
 اور وفا شعار بیوی تو دنیا میں کسی کو نہ مل سکے گی۔ میں ہی تمہارے قابل  
 نہ تھا۔ یہ میری بد قسمتی ہے۔ بچی کے لیے اتنا کموں کا کہ اچھا ہے  
 اس پر مجھ ایسے باپ کا سایہ نہیں پڑا۔ تمہارے جیسی نیک ماں کے  
 ہوتے ہوئے اسے میری نہ درت بھی نہ ہوگی۔

آئندہ تم مجھے کوئی خط لکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں یہاں سے کہیں اور

جائے ہوں۔ مجھے تمہارا خط مل ہی نہیں سکے گا۔

مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہاری توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔ مجھے یہ غم جو بھر ستائے گا۔ اللہ تعالیٰ تم دونوں کا محافظ ہو۔

عثمان

دو دن پہلے عائشہ کو آٹھ دس صفحوں کا خط ملا تھا۔ وہی پرانا انداز۔

محبت اور پیار بھری باتیں اور وہی جلد اور طویل خط لکھنے کی تاکید۔ مگر یہ ایک ڈبا ہو گیا تھا۔؟

کتنی دیر تو عائشہ کو کچھ سوچنا ہی نہ دیا اور پھر حسبِ معلّے کی نزاکت کا احساس ہوا تو اس کی ہمتی نہیں رہی ہو گئی۔ یہ کیسی شوگر کوٹڈ زہر کی گولی عثمان نے اسے دے ڈالی تھی۔؟

ارد گرد رنگہ دوڑائی۔ امی دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ بچی ماؤ والی چار پانی پر کھینچتے کھینچتے سو گئی تھی۔ ایک بار پھر بڑے دھیان اور پوری توجہ سے خط پڑھا۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔ بیٹھا نہ گیا۔ چپ چاپ لیٹ گئی۔

"میں نے تو تم سے کوئی توقع نہیں کی تھی عثمان! میں نے تو صرف ایک انسان ایک مرد کی زبان پر بھروسہ کیا تھا۔ اس زبان پر جس میں سے نکلے ایک لفظ کی خاطر صحیح انسان جان سے بھی گزر جایا کرتا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم ایسی مردانہ ایسی انسانیت سے محروم ہو۔ کہ تمہیں اپنی زبان، ایک مرد کی زبان کا بھی پاس نہیں ہوگا۔"

تین ساڑھے تین سال۔ شادی کو صرف ساڑھے تین سال ہی تو زور سے تھے۔ اور اس میں سے بھی وہ عثمان کے ساتھ صرف ڈیڑھ پونے دو سال رہی تھی۔ اتنے عرصے میں تو کہتے ہیں شادی کی مہندی بھی نہیں اترتی۔ اور یہ عثمان نے لیا کر لیا تھا۔

کیا اس کی محبت میں اتنی ہی گہرائی اور پائیداری تھی۔! اس محبت میں جس کا اس نے قمیص کھا کھا کر عائشہ کو یقین دلایا تھا۔ اور وہ راستے اتنی جلد جدا ہو گئے تھے جن کی ہر اہی کے لیے زہر کھالینے کی دھمکیاں دے دے کر اس نے عائشہ کو راضی کیا تھا۔

اودھ خدایا! وہ کیا انسان تھا۔! کیا مرد تھا۔! کیسی اس کی زبان تھی۔! اور کیسی اس کی مردانگی تھی۔!!

کہاں اس کی وہ بلندی کہ فرشتے اس کے سامنے پانی بھریں اور کہاں یہ پستی کہ یوں اپنی اپنا بی بی اور معصوم بچی کو بیچ منجھہا رہے سہارا چھوڑ دیا تھا۔

"نہیں نہیں۔ میرا عثمان اتنا پست نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی مذاق ہے۔" وہ یقین کرنے سے بالکل قاصر تھی۔

امی نماز سے فارغ ہو کر ادھر ہی آگئیں۔ پہلے جھک کر بچی کو ٹھیک طرح سے لایا۔ اس کا منہ چوما۔ پیار کیا۔ اس کے ارد گرد بکھرے کھلونوں کو پر سے ہٹایا۔ عائشہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ بچی سے فارغ ہو کر اتنی نے مسکراتے ہوئے عائشہ کو دیکھا۔

"میں سمجھی تم سو رہی ہو۔" پھر عائشہ کے ہاتھ میں خط دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"عثمان کیسا ہے۔؟ کب آ رہا ہے۔؟"

اپنی بد نصیبی کے متعلق ماں کو کچھ بھی بتانے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ تو پہلے ہی لہلوں کی ماری تھیں۔ اور انہیں کیا مارتی۔

"ٹھیک ہے۔ دو تین مہینے تک آجائے گا۔ آپ کو سلام لکھا ہے۔"

خود عائشہ اپنے آپ سے حیران رہ گئی کہ اس نے اتنا کچھ کہہ کیسے دیا تھا۔



ہمیشہ کی طرح —

ایک دن اور گزرا — سولے چائے کی ایک دوپالیوں کے سارا دن اس کے حلقے میں اور کچھ نہ گیا — اتنی بڑی حیران تھیں کہ اتنی طویل سر درد — بار بار عائشہ سے پوچھا بھی — گردہ یہی کہتی رہی کہ اسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اور پھر —

دروازے پر بڑے زور زور سے دستک ہوئی — عجب میحانی سا انداز تھا۔ اتنی جھاک کر باہر گئیں —

عثمان کی ماں اور باپ تھے — عائشہ چونک اٹھی — اس وقت ان کی آمد غیر متوقع تھی — عثمان کی امی نے آتے ہی عائشہ کو گلے سے لگا کر رونا شروع کر دیا۔ "بیٹی! آج کل میں تمہیں کوئی عثمان کا خط آیا ہے؟" عثمان کے والد کی آواز بھی بھرا رہی تھی —

"پر سول اترس آیا تو تھا — جانے کیا بات ہے — دو دن سے سر نہ لیٹے پڑی ہے — نہ کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہے — مسلسل سر درد ہے —" اتنی بڑی ہیرت سے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بولیں —

"درا مجھے وہ خط تو دکھاؤ" عثمان کے والد نے پکیا تھی آوازیں کہا — عائشہ نے خاموشی سے تکیے کے نیچے سے وہ خط نکال کر ان کے پیسے ہوئے لڑتے ہاتھ پر رکھ دیا — جوں جوں وہ خط پڑھتے جا رہے تھے ان کے ہاتھوں کی لرزش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا — جانے پورا پڑھا بھی گیا کہ نہیں —

اسے دیں پھینکتے ہوئے عائشہ کو کہیں گے کہ اپنے ساتھ لگا لیا اور بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے — رخسار آنسوؤں سے تر ہوئے جا رہے تھے۔

سینے میں آتش فشاں سلگ رہے تھے مگر کمال کا ضبط اس وقت خدائے سے لیا تھا کہ ماں کو کچھ محسوس نہ ہو سکا — بھگی بھگی آنکھوں کو اس نے پہلے ہی کہنی سے چھپا رکھا تھا — بات ٹل گئی — اتنی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں — عائشہ چپ چاپ سر نہ لیٹے پڑی رہی — بچی جاگی —

"امی — امی —" ایک دو بار عائشہ کو پکارا — کیا کرتی —؟ بچی کی آواز نے تو اس کی رہی بھی قوت اور حوصلہ بھی چھین لیا تھا — اندر ہی اندر آنسو پونہ پونہ پیچی کی آوازیں کراتی خود ہی اندر آ گئیں —

"ارے بیٹے! تمہاری امی تو سو رہی ہے — تم آ جاؤ میرے پاس — ہم دیکھ کرے میں چلتے ہیں —" امی عائشہ کو سویا ہوا سمجھ کر اسے کمرے سے باہر لے گئیں —

پھر شام ہو گئی — وہ اسی طرح سر نہ لیٹے پڑی رہی — امی نے پریشان ہو کر پوچھا بھی — مگر عائشہ نے سر درد کا بہانہ بنا دیا —

رات کو کھانا بھی نہیں کھایا — امی نے دودھ پینے کے لیے کہا — اس سے بھی انکار کر دیا — کچھ کھانے پینے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا —

دوسرے دن بھی اس کا وہی عالم رہا — سارا دن نہ کچھ کھایا نہ پایا چپ چاپ پڑی رہی — کیا کرے؟ کس کو دکھائے یہ خط —؟ جو کوئی اسے اتنی تسلی دے دے کہ وہ مذاق تھا —

سارا دن عثمان کے اگلے خط کا انتظار کرتی رہی — کہ خود ہی اپنے الفاظ کی تردید کرتے ہوئے شرارت کہہ کر اسے چھوڑے گا — ستائے گا —

عثمان خود کرنے جا رہا تھا۔

آخر کیوں اسی کی عقل پر ایسے پتھر پڑ گئے تھے کہ اسے اپنی عاقبت کا بھی اہل نہ آیا۔ کیا ہو گیا تھا اسے؟ ایسا دیوانہ پن۔ عقل و ہوش رکھتے اسے بھی وہ سب کچھ بھٹا بیٹھا تھا۔ اپنے خدا کے فرمان کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

لہٰذا برتوالات کا بھی خوف اس کے دل میں نہ رہا تھا۔

عثمان کے والدین کی نگاہیں ٹھکی جا رہی تھیں کہ ان کے بیٹے سے ایسی شرمناک بات سرزد ہوئی تھی۔ ایسی غیر شریفانہ اور قبیح حرکت۔ عثمان کے والد بے حد لہو کر بار بار کہہ رہے تھے۔

”عثمان! اس سے تو بہتر تھا کہ مجھے تمہاری موت کی خبر ملتی۔“

”یوں نہ کہیے۔“ بے اختیار عاشرہ کے منہ سے نکل گیا۔

”کیوں نہ کہوں۔؟“ ابا بلند آوازیں بولے۔ ”میری سفید دماغی میں لائے کا لک مل دی۔ اس بڑھاپے میں مجھے اس نے ذلیل و رسوا کر دیا۔ لای کی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ اس بیٹے کے ہاتھوں جسے میں قابلِ فخر سمجھتا تھا۔“

جب سے امی کو حالات و واقعات کا علم ہوا تھا وہ بھی رو رہی تھیں۔ اب بے بسی تھی ان کے آنسوؤں میں۔ اور ابا پیچھے جا رہے تھے۔

”نہ صرف اس نے مجھے بلکہ سارے خاندان کو ذلیل کر دیا۔ تمہارے خاندان لوگ نہیں گے تو کیا کہیں گے۔ کیا ہمارے سارے خاندان پر تنقیدیں گے نہیں؟ میں تو ایسوں والا ہوں۔ ابھی مجھے بہت سے کام کرنا ہیں۔ اودہ میرے ساتھ ہے۔“ عثمان نے کس جرم کی پاداش میں اتنا ذلیل کیا۔ جس بیٹے

اس مرد کے جو زندگی میں کبھی نہیں روایا تھا۔ والدین نے و ن ت پائی ایک جزا۔ ایک جوان بھائی انتقال کر گیا مگر اس مرد آہن کی آنکھ سے کبھی آنسو نہیں ٹپکا تھا۔ اتنے ضبط اور حوصلہ والے تھے وہ۔ اور اب۔ روئے جا رہے تھے۔ آنسوؤں پر کوئی بس ہی نہیں تھا۔ بہے چلے جا رہے تھے۔ کیسا بے بس کر دیا تھا عثمان نے۔ بچی پاس ہی بیٹھی تھی۔ ہاں اور دادا کو روتے دیکھا تو وہ بھی چہینیں مار مار کر رونے لگی۔

”آخر بات کیا ہے۔؟ یہ آپ سب کو ہو کیا گیا ہے۔؟“ اُمّی حیران حیران انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔ ”عثمان تو خیریت سے ہے۔؟“

”کاش! اس کی موت کی خبر ہوتی۔“ عثمان کے ابا گلو گلو آواز میں بولے۔

عثمان کی والدہ نے اپنے پرس میں سے ایک خط نکال کر عائشہ کی اُمّی کی جانب بٹھایا۔ ایک دن پہلے عثمان کے والدین کو اس کا یہ خط ملا تھا۔ اس میں تو اس نے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کسی اور طرح گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کا اب پستانِ پس آنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ اس لیے وہ عائشہ سے قطع تعلیق کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے اس نے باپ کو لکھا تھا کہ کسی دلیل سے بل کر طلاق کے کاغذات وغیرہ مکمل کر کے بھیج دے۔

”طلاق۔“ عائشہ کی پیچ نکل گئی۔

یہ عثمان نے لکھا تھا۔ اس عثمان نے، جو گھنٹوں بیٹھا قرآن مجید کا ترجمہ پڑھتا رہتا تھا اور پھر ایک دن اُس نے عائشہ کو خاص طور پر یہ بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کسی مرد کا جو فعل سخت ناپسند ہے وہ مقصودِ بیوی کو طلاق دینا ہے۔ اور وہی بُرا

کو میں فخر خاندان سمجھتا تھا وہ ننگ خاندان کیوں نکلا۔؟

گھر بھریوں نوحوہ و ماتم بپا تھا جیسے کوئی موت ہو گئی تھی۔ اور یہ موت کسی اور کے لیے ہو یا نہ ہو مگر عائشہ کے لیے تو سچ چرخ کی موت ہو گئی تھی۔ اس کے اعتماد کی موت۔! اس کے بھروسے کی موت۔!! اور اس کے یقین کی موت۔!! رنیا کی ہر ہستی پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ اور کسی پر بھروسہ اور یقین نہیں رہا تھا۔

عثمان نے مرد کے ساتھ وابستہ ہر رشتے کا اعتماد چھین لیا تھا۔ بیوی کو اس نے چھوڑا۔ اس بیوی کو، جسے وہ محبوبہ سے بھی کوئی بلند درجہ دیتا تھا۔ اولاد کا اس نے کوئی خیال نہ کیا جو والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اور والدین بھی ایسے، جن میں سے ماں پانچ۔ جو بیچاری اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ باپ کا سہارا ہی اس کی زندگی کی بہتری تھا۔ اس بہتری سے اس نے ایک نئی جان کو محروم کر دیا۔

جن والدین کی خود اولاد تھا اور جنہوں نے ہمیشہ اس کی ہر ضد کو سرائیوں پر رکھا۔ ان کے ساتھ اس نے یہ وفا کی۔ ماں سے اس کی مامتا اور باپ سے پوری شفقت کا جذبہ چھین لیا۔

بہنیں اور بھائی، جن کا خون تھا وہ۔ اس میں اس نے وہاں کی سفیدی شامل کر کے ان سے بھی ناٹھ توڑ لیا۔

بہت بُرا کیا تھا اس نے۔ بہت غلط کیا تھا۔!!

عثمان کے سب گھر والوں کا خیال تھا کہ اس کا یہ قدم سراسر تباہی کی طرف تھا۔ عائشہ جیسی بیوی کو چھوڑ دینا عائشہ کی نہیں بلکہ خود عثمان کی بدنصیبی تھی۔

پھر ہر ایک نے اسے خط لکھا۔ کسی نے نرمی سے سمجھایا کسی نے ہنسے۔ مگر وہ اپنے فیصلہ پر فہم رہا۔ اس نے کسی کی بھی نہیں سنی۔ باپ کی منت سماجت کا اس پر کوئی اثر ہوا نہ کسی بہن بھائی کی نصیحت۔ بس ایک ہی ضد تھی کہ عائشہ کو طلاق دے گا۔

ماری زندگی ایک اپاہج کے ساتھ گزارنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ جانے ماسب نے اسے فرشتہ سمجھ لیا تھا۔ کچھ بھی ہو وہ ایک انسان تھا اور انسان بدل جاتا ہے۔ اس نے صاف صاف یہ لکھ دیا تھا۔

اب اسے کوئی کیا کہتا۔ کیا بتاتا۔ کیا سمجھاتا۔ کہ اس سے کسی نے سنی تو نہیں کی تھی۔ یہ اس کی اپنی ہی خواہش تھی۔ اور اسی کی خواہش کا مانے احترام کیا تھا۔

چنانچہ وہ جو سفید جادو اس کے سر پر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس کا کسی سے اثر نہ ہو سکا۔ اتنی دور وہ بیٹھا تھا۔ سارا معاملہ خطوں تک ہی محدود

خط کیا کرتے۔؟  
سامنے ہوتا تو کسی کی آنکھ کی شرم ہوتی کسی کی نگاہ کا احترام۔ کسی کا ادب پڑتا اور کسی کا لحاظ۔ اور کچھ نہیں تو بچی کی پیاری پیاری حرکتیں ہی شاید اکی خفہ محبت کو بیدار کر دیتیں۔

مگر اذیدہ دور از دل دور والا معاملہ ہو گیا تھا۔ خط، جو نہ بول سکیں بذات کا اتار چڑھاؤ ظاہر کر سکیں اور نہ کسی کے آنسو کسی کو دکھا سکیں اور نہ کسی ایں کسی تک پہنچا سکیں۔ وہ کیا کر سکتے تھے۔؟

بچپن سے ضدی تو تھا ہی۔ اس ضد پر بھی باقاعدہ ڈٹا رہا۔ عثمان کے

والد نے عائشہ کو سمجھایا کہ اگر وہ کسی کی بات ماننا تھا تو وہ صرف عائشہ تھی۔  
بے شک عثمان نے اسے لکھ دیا تھا کہ وہ اسے ہرگز خط نہ لکھے۔ مگر کوئی

مضائقہ نہیں تھا۔ وہ اس کی بیوی تو تھی۔ اس کی اولاد کی ماں تو تھی۔  
اسے اپنے اور اپنی اولاد کے حقوق کے لیے لڑنا چاہیے تھا۔

چنانچہ خاموش رہنے سے بہتر تھا وہ اسے خود خط لکھے۔ اور اسے ساری اپنی بیوی  
سمجھائے کہ ایک بیٹی کی ماں کو طلاق دے دینا کتنی مذموم حرکت تھی۔

اپنی زندگی کی تو ہر خواہش اس نے خود بھی پوری کر لی تھی اور دوسروں سے  
بھی کرا لی تھی۔ مگر اب ایک تنہی سی زندگی کا سوال تھا۔ جس نے ابھی پُرانا  
پڑھنا تھا اور جسے ماں اور باپ دونوں ہی کی محبت اور توجہ کی ضرورت تھی۔

عائشہ اکیلی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ جیسے تیسے روحوں گزرا رہے تھے  
مگر بچی کے ساتھ تو ظلم کی انتہا تھی۔ اس کی خاطر ہی اسے یہ قدم نہیں اٹھانا چاہیے  
تھا۔

"ہو سکتا ہے ابھی اس میں کچھ تھوڑی سی غیرت اور محبت موجود ہو۔ وہ اپنے  
مذہب، اپنی قوم اور اپنے وطن کی بیٹی کو بے سہارا ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ  
کر کسی غیر مذہب، غیر قوم اور ملک کی بیٹی کو نہ اپنا لے۔ کچھ خدا کے غضب سے ڈرتے  
چنانچہ سب کے کہنے سے عائشہ نے عثمان کو خط لکھنے کی ٹھان لی۔ ڈبٹے  
دل اور کانپتے ہاتھوں سے اس نے قلم پکڑا۔

کوئی ماضی کی داستان، کوئی پرانی بات، کوئی وعدہ، کوئی محبت یا پیار۔  
کچھ بھی اس نے عثمان کو یاد دلانے کی کوشش نہیں کی۔ کیا فائدہ۔ وہ تو اس  
ذلت، صرف بچی کے حقوق کی بجائے کوہ لانا چاہتی تھی۔

بس۔ اسی ذمہ داری کا اسے احساس دلایا۔ اس کی زندگی کی بہتری کے  
واسطے دیے۔ باپ کی موجودگی اس کی حیات کے لیے کتنی بڑی ضرورت  
— اس طرف اس کی توجہ دلائی۔

بے شک خود اس سے آئندہ کوئی تعلق نہ رکھتا مگر بچی کے مستقبل اور بھلائی کے  
اس کی ماں کی پیشانی پر طلاق کا کلک اسے نہیں لگانا چاہیے تھا۔ اس  
کی بیٹی کی ساری زندگی آندھیوں اور طوفانوں کی لپیٹ میں آجانا تھی۔

آخر اس نے بڑی ہونا تھا۔ سکول جانا تھا۔ کالج جانا تھا۔ اپنی بھانجروں  
پر ہم چلیوں سے مل بیٹھنا تھا۔ پھر کسی کی ماں کا ذکر چھڑنا تھا۔ کسی کے باپ کا۔  
پنے اپنے والدین کی محبتوں، شفقتوں اور پیار کے قصے کہانیاں کہے جانا تھے۔  
اس کے لیے کیا تھا۔؟ باپ کا ظلم اور ایک امریکی سے شادی کا ہتھ  
ارے گناہ ماں کے ماتھے پر چہاں طلاق نامہ اور اپاہجی۔ شرمندگی۔!  
یث فی جھکا ہوا سر۔ اور سیلیوں کی باعنی مسکراہٹیں اور سرگوشیاں اور۔  
ہلکے چھپے طنز۔! اسے یہ کس جرم کی سزا تھی۔؟

اور پھر۔ جوان ہونے پر اسے بیاہے بھی جانا تھا۔ مطلقہ ماں کی بیٹی۔  
اب اس کے باپ نے ایسا برا فعل کیا تھا۔ اسے کس نے قبول کیا تھا۔ اور اگر کوئی  
براغیر قبول بھی لے گا تو اس کی باقی زندگی والدین کے طعن و تشنیع سن سن کر اور  
دل جلایا کر ہی گزرنا تھی۔

انسان سے سو بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ اس کی تو کوئی بھول چوک  
بھی جھٹ پٹ اسے میکے بٹھا سکتی تھی۔ ماں مطلقہ تھی۔ باپ عیاش۔  
اُن کے ساتھ ہر سلوک جائز سمجھ کر کیا جاتا تھا۔

عائشہ نے سب کچھ عثمان کو لکھ دیا۔ کہ اسے طلاق دینے کے یہ اثرات یقینی تھے۔ اگر وہ اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا تو بڑے شوق سے لیتا۔ خود عائشہ اسے باقاعدہ قانونی طور پر اجازت دینے کو تیار تھی۔ یوں بھی تو وہ عثمان کو خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ اس نے اسے پرستش کی حد تک چاہا تھا۔

عثمان کے والد سے اسے معلوم ہوا تھا کہ وہاں کے قانون کے مطابق دوسری شادی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک پہلی بیوی موجود ہو۔ عائشہ نے دل پر پتھر رکھ کر خود اسے کئی ایسے راستے بتائے جن پر چلنے سے وہ اسے طلاق دے بغیر اپنی پسندیدہ لڑکی سے شادی کر سکتا تھا۔ صرف بچی کی زندگی کی خاطر۔! بچی کے مستقبل کی بہتری کے لیے۔!!

عائشہ کو بڑا یقین تھا کہ اس کے اس خط کا عثمان پر خاطر خواہ اثر ہو گا۔ وہ اس بے جا جذبے باز آجائے گا۔ مگر۔ اس دن عائشہ کے صبر و ضبط کے سب بند ٹوٹ گئے۔ جب اسے اپنا وہ خط اسی طرح واپس مل گیا۔ عثمان نے اسے کھول کر پڑھنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی تھی۔ نہ کھول کر پڑھتا۔ پھاڑ کر وہیں پھینک دیتا۔ جلا دیتا۔ یوں اسے بھرپور ٹانگوں توڑ جڑتا۔ یوں اسے ذلیل تو نہ کرتا۔

اس طمانچے نے اس کی زندگی کا رخ یوں پھیر کر رکھ دیا کہ وہ آنکھوں اور زبانوں کی زد میں آگئی۔ اس کی حیات کے تار و پود بکھر کر رہ گئے۔

نہ اسے بچی کا ہوش رہا نہ اپنا۔ کھانا پینا تو پہلے ہی کئی دن سے چھوڑ چکا تھا۔ اب زندگی کی بھی پرواہ نہ رہی۔ ہر وقت چپ چاپ لیٹی سوتا

میں کھوتی رہتی۔ راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی۔ خواب آدر گویاں کھلا کر اکثر اسے ۳۵۳

لٹا دیا جاتا کہ یوں مسلسل جگنے اور پریٹناں رہنے سے ہوش و حواس ہی نہ کھو بیٹھ

اور عائشہ۔۔۔ وہ ہوش و حواس یکے کھوتی۔۔۔ وہ تو اب ہی حواس میں آئی تھی۔ عثمان کے ہاتھوں ملے اس زہر نے اسے زندگی کی تمیزوں اور لبنان کی اصلی حقیقت کا احساس دلا دیا تھا۔ خواب آدر گویوں کا طلسم ٹوٹا تو۔

عثمان! یہ تم نے کیا کیا۔؟ اتنے وعدے۔! ایسے بلند بانگ وعوے! ہا ایک کا بھی تمہیں خیال نہ آیا۔ تمہیں اپنی زبان کا بھی پاس نہ رہا۔ اپنی مڑانگی بائیں شرم نہ آئی کہ ایک مرد کو یہ سب زیب نہیں دیتا اور تمہاری اس حرکت سے رکی ہستی پر سے سب کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

اور عثمان! یہ تم نے کیا کیا۔؟ میں تو تمہیں کبھی اتنا خود غرض نہیں سمجھتی تھی۔ تم نے تو خود غرضی کی انتہا کر دی۔ اپنے عیش اور مسرتوں کی خاطر تم نے لاد کی خوشیوں اور مستقبل کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ اس کی پوری زندگی سے کھیل لے۔ اپنے عیش کی خاطر۔! اپنے جذبات کی خاطر۔!!

اس ذمہ داری کا تمہیں خیال نہ آیا جو خدا نے تمہیں سونپی تھی اور جس کے متعلق مجھے درس دیا کرتے تھے۔ خود اپنی بار تم سب کچھ بھول گئے۔ یہ تم اتنے بائیں کیسے ہو گئے عثمان! یہ تمہیں کیا ہو گیا۔؟ تم ایسے تو نہ تھے۔

تم کہا کرتے تھے کہ عائشہ تمہارے سینے میں بھی آخر باقی سب جیسا ہی دل ہے۔ باہر ہوتا ہو گا کہ اس سے کوئی پیار کرے۔ کوئی اپنا کرے اور کوئی ٹوٹ کچلے۔ میں بھی ارمان چھپتے ہوں گے۔ خواہشیں اور آرزوئیں تڑپتی ہوں گی۔

اب۔۔۔ اسی دل کو خود تم نے اپنے ہی ہاتھوں چکنا چور کر دیا۔ ریزہ ریزہ

۵۶ کر دیا۔ آج تمہیں اس دل کا خیال نہ آیا۔

اور۔ اور عثمان! تم کہتے تھے کہ تم مجھے ایک پیارا سا ایک خوبصورت  
گھر دو گے۔ حیات کی ساری آرائشیں اور سہولتیں میرے قدموں میں ڈال دو گے  
مگر۔ تم نے تو میرا بنا بنا یا گھر خود اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ کر نہ صرف بے  
بے گھر کر دیا بلکہ تم نے تو مجھ سے جینے کی تمنا بھی چھین لی۔ میرا سکون و اطمینان  
بھی لوٹ لیا۔ وہ! یہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا۔؟

عثمان! تم نے مجھے بیوی بنایا تھا اور تم کہتے تھے کہ تمہیں کدو جہنم بھی ملیں تو  
جہنم میں تم مجھے ہی اپنی بیوی بنا دو گے۔ لیکن۔ تم نے تو پہلے جہنم میں ہی  
مجھے تنہا اور بے سہارا چھوڑ دیا۔ پہلے جہنم میں ہی اور میرے جیسے ہی تم  
کسی اور کو مجھ پر ترجیح دے دی۔ کیوں۔؟

صرف ان دو ٹانگوں کی خاطر۔! وہ تمہارے ساتھ زندگی کی دوڑ میں برا  
کی شریک ہوگی۔ میں اپنا سچ تھی میں تمہارا ساتھ نہ دے سکی۔ عثمان! یہ تم نے  
پہلے کیوں نہ سوچا۔؟ شادی سے پہلے۔ یہ آخر تم نے مجھے کس گناہ کی بنا  
دی۔ میں نے تو تمہارے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ ہمیشہ تمہارا بھلا چاہا  
پھر تم نے مجھ سے یہ کس بات کا انتقام لیا۔؟

جانے کیوں تم نے مجھے ایک بے حس انسان یا کارنس پر سجانے والا شوہر  
سمجھ لیا کہ جب جی چاہا اٹھا کے سینے سے لگا لیا، لگا ہوں کے سامنے بجالایا  
جب جی چاہا اٹھا کر توڑ پھینکا۔ میں ایک انسان تھی۔ گوشت پوست کی  
ہوتی۔ مگر تم نے یہ نہ جانا۔ میری ٹانگیں مصنوعی تھیں میرا دل اور دماغ

مصنوعی نہ تھا۔

پہلے منیتیں کر کر کے مجھ سے شادی کی۔ اور اب۔ تم نے مجھے چھوڑنے  
پچکے سے ہی ارادہ کر لیا۔ اپنے آپ ہی۔ کیا خود مجھ پر بھی میرا اپنا کوئی حق  
نہا۔؟ نہ اپنے آپ پر۔ نہ کسی اور پر۔ پھر۔ پھر میں کس کے لیے  
اب رہی ہوں۔ میں کیوں زندہ ہوں۔؟

وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑاتی رہتی، سوچتی رہتی اور تصور ہی تصور میں عثمان سے  
بلا کرتی رہتی۔

زندگی کے ایک حادثے نے اسے ٹانگوں سے محروم کر دیا تھا اور یہ دوسرا  
رنہ۔ یہ تو اس سے بھی زیادہ حسرتناک ثابت ہوا تھا۔ اس نے تو اسکی  
ایک ہستی کو چھنا چور کر دیا۔

بہت دن بیمار رہی۔ سسرال والے سبھی اس کے پاس آتے رہتے۔  
ان کی دلجوئی کرتے۔ سب نے ہی اسے یقین دلایا کہ وہ آخر دم تک اس کا  
اتھ دیں گے۔ عائشہ خود کو تنہا نہ سمجھے۔ وہ عثمان کو چھوڑ دیں گے مگر اسے  
یہ غیبی سے لگائے رکھیں گے۔

پھر اسے سمجھاتے کہ اسے یوں اپنی زندگی کو ایک بے کار اور تنگ انسانیت  
نان کاروگ نہیں لگا لینا چاہیے۔ عثمان اگر خدا کے احکام اور قوانین کو  
بول گیا تھا تو اسے تو اس کے نقش قدم پر نہیں چلنا چاہیے تھا۔

اسے اس بیٹی کی خاطر اب اپنی زندگی سے پیار کرنا چاہیے تھا جس کے سر  
پر باپ کے جیتے جی، اس کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ ماں اور باپ دونوں کا پیار  
اب اس اکیلی نے اسے دینا تھا۔ اس کی باپ کی کمی اب اسے ہی پوری کرنا تھی۔  
سب کے سمجھانے سے کبھی تو اس پر خاطر خواہ اثر ہوتا اور کبھی دماغ بالکل

۳۵۸ ہی اٹھ جاتا۔ کیا ہر دُکھ تکلیف اسی کے لیے رہ گئی تھی۔ اپنی معذرت۔  
طلاق کی ذلت۔ لوگوں کے طعنے۔ بچی کی پرورش اور صحیح تربیت۔ عثمان  
نے کیسی دلدل بھری کٹھن راہوں پر اسے ڈال دیا تھا۔ اور خود۔ علیحدہ گھر  
بسا، عیش کر رہا تھا۔ بے اختیار ہو کر چیخ پڑتی۔

”خدا یا۔ اتو مجھے موت کہوں نہیں دے دیتا۔“  
امی الگ سلگتی رہتیں۔ عائشہ کا فکر، جو عثمان کی عظمت نے ان کے ذہن  
سے رُخ کر دیا تھا، ایک بار پھر اس سے زیادہ فکر و پریشانی کے ساتھ ان کے  
دل و دماغ پر مسلط ہو گیا تھا۔

اب عائشہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک تنہی سی چان اور تھی۔ دونوں  
کا غم انہیں مارے والی رہا تھا۔ آج ان کی آنکھیں بند ہو جائیں تو پھر۔ پھر ان  
دونوں کا کون سہارا تھا۔؟

انہیں پریشانیوں میں وقت گزرنے لگا۔  
جب بات ہی تھی تو عائشہ کے سسرال والے بھی ہر وقت اس کی تسلی دہانی  
کے لیے موجود رہتے۔ وقت گزرنے لگا تو ان کا جوش اور عہد و دیاں بھی ٹپٹپکے لگے۔

عثمان کے والد نے سب کو منع کر رکھا تھا کہ کوئی اسے خط نہ لکھے۔ مگر اس  
سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے۔ شاید اسی طرح وہ سیدھے راتہ پر آجائے۔ پلے

بہن بھائی منہ موڑیں تو اسے کچھ تکلیف ہو۔ کوئی احساس ہو۔ اور وہ اس حرکت  
سے باز آجائے۔

مگر۔ عائشہ تو پھر غیر تھی۔ عثمان ان کا اپنا خون تھا۔ کچھ وقت گزرا  
وہ جوش مارنے لگا۔ ماں کی ماتا اولاد کی جدائی میں تڑپنے لگی۔ بہنوں

مائی کا خیال آنے لگا۔ کچھ خون کے تعلق سے اور کچھ اس لیے کہ ایسے ملک  
رگیا ہوا تھا جہاں سے فائدے ہی فائدے حاصل ہو سکتے تھے۔ کچھ اپنے لیے  
اولادوں کے لیے۔ پھر لگاڑی کیوں جائے۔!

اور پھر۔ عائشہ سے چوری چھپے کچھ بہن بھائیوں نے عثمان سے خط و کتابت  
رُخ کر دی۔ اس پر رحم آنے لگا۔ بیچارا پردیس میں اکیلا تھا۔ کہیں سب کی  
بے رخی کی وجہ سے کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے۔ یہ سوچ کر اسے تسلیاں  
ہی جانے لگیں۔

بیس چھائی کی خوشی اور پر مسرت زندگی کی خاطر وکیلوں سے لی ملاکر عائشہ کے لیے  
طلاق کی کوششیں کرنے لگیں۔

جب عائشہ کو ان حالات کا علم ہوا تو دُکھ درد اور بھی سوا ہو گیا۔ وہ  
رپ تڑپ اٹھی۔ اپنی مندوں کو اس نے سگی بہنوں سے بڑھ کر جانا تھا۔

عثمان کے والدین کو اس نے سگے ماں باپ سے بھی بلند درجہ دیا تھا۔ کبھی  
اسی سے گستاخی نہیں کی تھی۔ ہمیشہ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا لحاظ کیا۔

عثمان سے کہہ کہہ کر ان کے حقوق انہیں دلوائے۔ ماں باپ اور بھائی  
بہنوں کی محبت اس کے دل میں تازہ کرتی رہتی کہ کچھ بھی ہو اپنے ہی اپنے ہوتے

ایں۔ غیر کبھی اپنے نہیں بنتے۔ ہمیشہ پانی سے خون ہی گاڑھا ہوتا ہے۔

اور اب خود اس کی دی گئی مثال خود اس پر ہی صادق آگئی تھی۔ ان کا بھی  
نون ہی گاڑھا نکلا۔ عائشہ پھر غیر کی غیر رہی۔ یوں بظاہر سب اس سے

اسی طرح ملتے۔ مگر در پردہ عثمان کے ساتھ ان کی ہمدردیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

اس دو طرفہ چال نے عائشہ کی بہتی کو زیر و زبر کر دیا۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں

سکتی تھی۔ اور آخر کہتی بھی کیا۔ پانی ہمیشہ نشیب ہی کی طرف بہتا ہے۔ اور ان کا عثمان کے ساتھ ہمدردی کرنا عین فطرت کے مطابق تھا۔ یہ سوچ کر دل کو تسلی بھی دے لی، مگر پھر بھی فراق نہ ملتا۔ جب ان میں سے کوئی بھی ملنے آجائے تو فریادیں جو چھوڑ کر ناپڑنے انکی اذیت ناقابل برداشت ہوتی۔ حاشا! چپکے سے یونہی نرسنگی گزار دینا چاہتی تھی۔ گوشہ نشین ہو کر۔ اپنی عزت اور وقار کی خاطر وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات زیادہ کانوں میں پڑے اور پھر ہمدردیاں اور رحم بھری نگاہیں لے کر لوگ اس کے پاس آئیں۔ مگر جانے کیا ہوا اور کیسے؟ خاندان سے نکل کر یہ بات باہر پھیلنے لگی۔ عثمان کے ملنے چلنے والوں اور دوست اصحاب کو بھی کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا۔ جس جس کو بھی پتہ چلا بے اختیار کہہ اٹھا۔

"یہ کیا ہو گیا؟" عثمان کو تو ہم مردوں نے بھی اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا۔ حال کیسں کسی مرد کی عظمت اور ایثار و قربانی کی مثال دنیا پڑتی تھی ہم عثمان کی دیا کرتے تھے۔ کہاں گیا ہمارا آئیڈیل؟"

ہر ایک نے یوں اظہارِ افسوس کیا جیسے خود اسی کے گلے میں طوق ڈال کر فرشتہ سے شیطان بنا دیا گیا تھا۔ عثمان کی عظمت پشتوں میں گری اور ہر زبان سے تائید کا اظہار ہوا تو حالِ تشویش بھی برداشت نہ کر سکی۔ جلنے کیوں اب بھی عثمان کے خلاف کوئی بات سننا اسے گوارا نہ تھا۔ اور یہاں ہر زبان پر چرچے تھے۔

اور پھر۔۔۔ صبر کا پیمانہ بالکل ہی لبریز ہو گیا۔ ان دکھوں کی مزید برداشت نہ رہی۔ رورو کر ماں سے منت کرنے لگی۔

"اُمّی! اندک کے لیے مجھے یہاں سے کہیں اور بے چلے۔ دور۔ بہت

دور۔ دہاں۔ جہاں مجھے کوئی جاننے والا نہ ہو۔ مجھ سے اب یہ اذیتیں نہ ہوں۔ یہاں سے لے چلے۔۔۔ دیسے بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہمارا کسی کو پتہ نہیں ہو گا تو شاید ان میں اس عداوت کے کلک سے بچی رہوں۔ یہ دنیا والے۔ اڑوں پڑوں الے۔ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤں گی تو بدنامی اور رسوائی کا ڈر بھی نہ ہے گا۔

غیر جگہ ہو گی۔ کوئی نہ میرے متعلق جانتا ہو گا نہ میرے حالات کا کسی کو علم ہو گا۔ پھر شاید کچھ سکون مل جائے۔ شاید۔ شاید۔ اور اگر مجھے سکون بھی ملتا تو ان رسوائیوں سے میری بیٹی تو بچی رہے گی۔ اس کی خاطر ہی یہیں ہال سے چلے جانا چاہیے۔"

ماں اس کا دُکھ درد جانتی تھی۔ مرنے والے کے لیے صبر آجاتا ہے مگر جو ہاں چھوڑ جائے، منہ موڑ جائے۔ اس سے زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ کوئی اصرار نہ نہیں۔ کوئی اور غم، کوئی اور دُکھ نہیں۔ اور ایک عورت کے لیے لائق سے بڑی کوئی لعنت نہیں۔ بے انداز رسوائیوں کا سامان اور بدنامی مستقبل۔ اور پھر ان مال بیٹی نے وہ شہر چھوڑ دیا۔

سوائت کی وادی کا حسن بڑا مشہور ہے۔ گرد و ہاں کے قدرتی نظارے بھی ان کے غم کو دور نہ کر سکے۔ اس کے دل کے اندر جن دیران خزاؤں نے آجائے جمائے تھے ان پر بہار نہ آ سکی۔ سینے کے زخم رستے ہی رہے۔ قت کے مرہم نے بھی ان پر کوئی پچا ہا نہ رکھا۔



اور یوں سلگتے دل، جلتے ارمانوں اور آہنج دیتی حسرتوں کے ساتھ وہ زندگی کے دن پرے کٹی رہی۔ صرف اس نغمی سی ذمہ داری کی خاطر۔ دل کی کئی کئی بار ایسے لمحات آتے جب عثمان کی یاد اسے ناگن بن کر ڈس ڈس لیتی۔ ساری ہستی میں زہر پھیل پھیل جاتا۔ پھر۔۔۔

وہ بڑی سنجیدگی سے مر جانے کے متعلق سوچتی۔ مگر۔۔۔ نغمی سی مبصوم بچی زندگی کے پاؤں کی زنجیریں بھاتی۔ اس کا ثواب باپ بھی نہیں تھا۔ کتنی بد قسمت تھی وہ۔! اور اپنی زندگی ملک عدم کی راہوں میں ڈال کر عائشہ اس کی بد قسمت میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اجی کو بیٹی کے غم نے بہت بوڑھا کر دیا تھا۔ ماموں جوان کی کفالت کرتا تھا اب اس کے بچے بیانے ہو رہے تھے۔ اور بچے بڑے ہو رہے تھے تو ساتھ ساتھ اعتراضات بھی بڑھ رہے تھے۔ اس کا اپنا ہی گزارہ اب مشکل سے ہوتا تھا۔

عائشہ کو اس کا احساس تھا۔ بہت عرصہ پہلے اس نے اپنا بوجھ خود اٹھانے کے متعلق سوچا تھا اور آج تو اس کے ساتھ اس کی لہنی ہی پیدا کی ہوئی اولاد تھی۔ کسی کے سگڑوں پر پڑے رہنا خود اسے گوارا نہ تھا تو اپنی اولاد کو کسی کا بوجھ کیوں بناتی۔ اس کی خود دہائی کیوں مجروح کرتی۔

اسے بچی کی خود دہائی کو زندہ رکھنا تھا۔ عثمان نے اسے، اپنی اولاد کو کوئی گھر نہیں دیا تھا۔ کوئی آسائش نہیں دی تھی۔ مگر۔۔۔ بچی کی بہتر تربیت کے لیے اب عائشہ کو ہی سب کچھ کرنا تھا۔ اس کے لیے گھر بنانا تھا۔ اس کے لیے آسائشیں مہیا کرنا تھیں۔

ایسا نہ ہو وہ احساس کسری میں مبتلا ہو کر اپنی فطری صلاحیتیں ہی مٹیٹھے۔ اسے تو اپنی بچی کو معاشرے کا ایک کارآمد فرد بنانا تھا۔

اور یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے خود زندہ رہ کر بچی کے لیے زندگی کی بات سمیٹا کرنے کی ٹھان لی۔ تصویریں بنانے کا اسے بڑا شوق تھا اور اپنے شوق کو ایک بار پھر اس نے اپنے اور اپنی بچی کے لیے ذریعہ معاش بنانے کے متنی سوچ لیا۔

برش اور کینوس سنبھالا اور دن رات محنت کرتے لگی۔ کوئی لگن ہو۔ بہت اذیت کی جائے۔ تو پھر کیسے نہ کامیابی نصیب ہو۔۔۔

ارد گرد پھرا فطرت کا کسبی بہت تھا۔ ملازمہ پیپوں والی کرسی میں بیٹھا کار ہال وہ کہتی، اسے لے جاتی۔ عائشہ کا احساس فطرت کے اس بے پایاں ناکھیز پر اتار لیتا۔ اور یوں سچی لگن کے سہارے اس کا فن نکرتے لگا۔ ناکھرا تو فی کے شیرازی بھی پیدا ہو گئے۔

اس کی تصویریں اچھے داموں بیکنے لگیں۔ تصویریں بیکنے لگیں تو دوسروں کے کندھوں کا بوجھ اترا اور تین زندگیوں کی گاڑی اپنے سہارے آپ چلنے لگی۔ بیٹی کو جس قسم کا گھر اور ماحول وہ دینا چاہتی تھی ابھی اس کے لیے اس کی آمدنی کافی تھی۔ پھر ایک اشتہار دینے والی کمپنی سے اس نے معاہدہ کر لیا۔ وہ ٹرنس آرٹسٹ بن گئی۔ اسے یہ لائن پسند نہیں تھی۔ مگر اس نے اختیار کر لی۔

کمپنی کا مالک بڑا اچھا تھا۔ اپنے آپ ہی اسے عائشہ سے ہمدردی ہی ہو گئی۔ یوں گھر بیٹھے ہی اسے بہت کام ملنے لگا۔ اور پھر عین اسکے سب خواہش بچی کی پرورش ہونے لگی۔

شادی ایک مقدس فریضہ ہے — اور عورت کے مستقبل کا خاص انگرال

مقدس فریضے نے اُسے یہ ضمانت نہ دی — بلکہ ایک زندگی کا اور بوجھ بڑھا دیا۔  
یہ مرد کی ذات — کتنی ناقابل اعتبار تھی — اس نے اب جانا —

نہ اپنی ہی زبان کا پاس نہ کسی اور کے دکھ درد کا احساس — جب بھی چاہا لاکھ  
جوڑ کر، پاؤں پڑ کر اپنی بات منوالی — اور جب اس کھلونے سے دل الٹا لیا تو  
بے دریغ توڑ پھینکا — یہ کہاں کا انصاف تھا —؟ یہ کیسا دستور تھا —؟ اور  
یہ عورت جیسی محروم ذات پر کیسی برتری تھی —؟ ہاں انصافی! ظلم! زیادتی!!!

کیوں نہیں اپنی لڑکیوں کے پیے ایسے عارضی سہارے ڈھونڈتی ہیں —  
کیوں —؟ کیوں آخر —؟ کیا انہیں مرد کی برتری کا احساس نہیں ہوتا —  
جانے کب وہ اسی زخم میں سہارے چھین دھڑام سے زندگی کے پختہ فرش پر  
پھینک دے — سر پیٹے — چوٹیں آئیں — زندگی چور چور ہو جائے — کسی کو  
کیا پرواہ —؟

اور عائشہ نے اسی چور چور زندگی کو گانٹھ جوڑ کر اپنی بچی کے لیے تیار کر لیا تھا  
اس بچی کے لیے — جو ایک بے وفامرد کی اولاد تھی — صرف اس نلٹے کہ اس  
نے اسے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا — اور وہ ماتا کے جذبے کے ہاتھوں عبور  
تھی — ماتا بے وفا نہیں ہوتی — نہیں ہو سکتی —

وہ بڑے دھیان اور بڑی توجہ سے اس کی پرورش کرنے لگی — اس کی بہتر  
تربیت کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی، کر رہی تھی — سینے کے اندر دکھوں اور غموں کے  
لارے اُبلتے رہتے مگر بچی کے سامنے ہمیشہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں ہی قصا  
رہتیں — وہ اسے اچھی اچھی باتیں سکھاتی — انسانوں سے محبت اور وفا کی —

اس اور پیاری —!

یہ خوشگوار ماحول بچی کی تربیت کے لیے بڑا اچھا ثابت ہوا — چھوٹی سی  
میں ہی بڑی زندہ دل اور خوش باش تھی — بڑی تیز طرار اور ذہین تھی — اتنی —  
بڑے عرصہ سے گھر میں دانستہ عثمان کا ذکر نہیں کیا جاتا تھا مگر وہ پھر بھی اسے  
بولی نہیں تھی —

جب تک عائشہ اور عثمان کا رشتہ قائم تھا — عائشہ خود ہی اسے باپ کی  
غور دکھا، دکھا کر پہچان کر لیا کرتی تھی — پھر — عثمان نے اسے دل سے اتار  
پیٹکا تھا — گو عائشہ ایسا تو نہ کر سکتی تھی مگر بچی کے سوال و جواب سے بچنے کی خاطر  
اب اس کے سامنے اس نے اس کے باپ کا نام لینا چھوڑ دیا تھا — اس کی تصویریں  
بل کے اندر بند کر دی تھیں —

مگر وہ ایسی ہوشیار تھی کہ عائشہ کی ہر کوشش کے باوجود اکثر بیشتر باپ کو یاد کرتی  
رہتی — عائشہ سمجھتی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی — کہیں وہ اور ہی اثر لے — وہ اس کے  
دل سے باپ کی یاد دھریا چاہے اور وہ فطرت کے عین مطابق اور بھی سینے سے لگاتی  
ہے — اپنے ہی دل کو تمام کر اور آنسو پی کر خاموش ہو جاتی —

"عثمان! تم نے مجھے کس اذیت میں مبتلا کر دیا ہے — کاش! ایک لمحہ کیلئے،  
میرے ایک لمحہ کے لیے تم خود کو میری جگہ رکھ کر سوچ لیتے کہ تمہارے ساتھ اگر کوئی  
ایسا لوگ کرتا تو تم پر کیا مینتی —

اور عثمان! میں بھی آخر انسان ہوں اور بقول تمہارے میں بھی سینے میں گشت  
ہست کا دھڑکتا ہوا دل رکھتی ہوں — کبھی کوئی یوں بھی کسی کے دل کو کچلا کرتا ہے  
نہ بے دردی سے تم نے کیل دیا — ایک انسان اتنا بھی ظالم ہو سکتا ہے —

یہ تو میں نے کبھی بھی نہیں سوجھا تھا۔ مجھے ایسے انسان سے۔ تم سے کیوں  
 نفرت نہیں ہو جاتی۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں؟“  
 اور کونسی ہمتے زحمتوں کو ایسے سے لگائے، روتے چلتے زندگی گزری جا  
 رہی تھی۔ عثمان کا اسے کوئی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔ طلاق  
 کا معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اسی کا باپ کسی عورت پر نہیں چاہتا تھا۔ شاید اسی  
 کی تنگ و دو کا نتیجہ تھا۔  
 اور عثمان۔ وہ تو اس امر کی عورت سے شادی پڑلا بیٹھا تھا۔ غبنے  
 اس نے کس قانون کے تحت اس سے شادی کی تھی۔ یا کی ہی نہیں تھی۔  
 دہان کے ماحول کے مطابق اسی طرح اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ عائشہ ہر بات  
 سے لاعلم تھی۔

جیسے وہ معلوم کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ خواہ عوام ہی روز روز زخم کھرنے  
 کا فائدہ۔؟ البتہ اسے اس ملک اور اس ملک میں کسے والے ہر فرد اور دہان  
 کی ہر چیز سے نفرت ہو چکی تھی۔ شدید نفرت!  
 عائشہ بہن نے کبھی کسی سے نفرت نہیں کی تھی وہ اب یہ بھی سیکھ گئی تھی۔  
 عثمان نے اس کی زندگی کی راہیں کیسے ہی بدل دی تھیں۔

بچی دس گیارہ سال کی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھار وہ باپ کے متعلق کوئی بات  
 کہتی تھی تو عائشہ بڑے ضبط اور حوصلہ سے اسے بتاتی کہ اس کا باپ پڑھنے کیلئے  
 گیا ہوا تھا۔

اس سے زیادہ وہ بچی کو کوئی اور بات کرنے کا موقع ہی نہ دیتی۔ اما عرصہ گزرنے  
 ہا باوجود بھی عثمان کا ذکر اس کے سینے کے اندر طوفان سا مچا دیتا تھا۔ اور وہ ان  
 بنے طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ جلدی سے کسی نہ کسی کام میں خود بھی مشغول  
 باقی اور بچی کو بھی لگا دیتی۔

وہ دن بھی اسی طرح اذیت ناک تھا جس طرح وہ دن تھا۔ جب عثمان کا آخری  
 واسے ملا تھا۔

بچی سکول سے آئی تو دوسرے کمرے میں بستہ رکھنے کی بجائے اسی طرح کندھے  
 ہ لٹکائے اس کے پاس آگئی۔ حسب معمول عائشہ نے اسے دیکھتے ہی بازو  
 پلا دیے۔ مگر وہ کچھ فاصلے پر بسوڑتی صورت لیے کھڑی رہی۔  
 ”کیا ہوا۔؟“

”آپ مجھے سچ سچ بتائیے میرے ابو کہاں ہیں۔؟“  
 عائشہ کو اس سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔  
 ”جب تک آپ مجھے سمجھ نہیں بتائیں گی میں آپ سے نہیں بولوں گی۔“  
 ”بیٹے! کئی بار تو بتایا ہے کہ وہ امریکہ پڑھنے گئے ہوئے ہیں۔“  
 ”اتنے سال ہو گئے۔ پھلا ابھی تک ان کی پڑھائی ہی ختم نہ ہوئی۔“

”پڑھائی میں آنا ہی وقت لگا کرتا ہے۔“ عائشہ نے بہت سوچ سوچ  
 رہا۔ ”اب تم خود ہی دیکھ لیو کہ کتنے سالوں میں تمہاری پڑھائی ختم ہوگی۔“  
 بارہ سولہ سال لگیں گے۔ اور تمہارے ابو کو تو گئے ابھی صرف آٹھ نو سال ہوئے  
 ہا۔۔۔

”ابو یہاں سے بھی تو پندرہ سولہ سال پڑھ کر گئے تھے۔ مزہ نہ بتایا ہے

کہ اس کے ماموں نے صرف تین سال میں پڑھائی ختم کر لی ہے اور اب وہ واپس آنے والے ہیں۔“

”اس کے ماموں نے تھوڑا پڑھا ہو گا نا۔ مگر تمہارے ابو تو بہت زیادہ اڑا ہو کر آئیں گے۔“

”مجھے پتہ ہے۔ جو یہاں سے پڑھ کر جائے پھر اسے وہاں اتنا لمبا نہیں پڑھنا پڑتا۔“

عائشہ اس منہی سی جان کے ہاتھوں لاجواب ہوئی جا رہی تھی۔ گراں اوسان برقرار رکھے۔

”در اصل وہ وہاں نوکری بھی کر رہے ہیں نا۔“ عائشہ کو بروقت سوچ گئی۔

”ہوں۔“ جیسے بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ”تو آپ نے بڑے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ میں ایسے ہی منزہ سے لڑتی رہی۔“

عائشہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جلدی سے اپنے کام پر مصروف ہو گئی۔ نہ اس سے فارغ دیکھے گی نہ کہنی اور سوال کرے گی۔

وہ چند لمبے کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ عائشہ دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ذہن میں کوئی کشمکش تھی۔ پھر اس نے سر کو جھٹکا دیا اور کندھ سے

بستہ اتار کر دیں زمین پر پٹختے ہوئے ماں کے پاس آکھڑی ہوئی۔ وہ قریب آئی تو غیر ارادی طور پر عائشہ کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ معصوم چہرے پر فکر و تڑپ کی لکیریں تھیں۔

”میرے ابو کے خط آتے ہیں۔“

عائشہ چونکی۔ یہ آج اسے کیا ہو گیا تھا۔؟ اب بھلا اس بات کا

کیا جواب دیتی۔؟ لاجواب سی ہو کر اسے دیکھے جا رہی تھی۔

”بتائیے بھی آتے ہیں۔؟“

”ہاں۔“ بہت سوچنے کے بعد عائشہ کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

”آپ نے تو مجھے کبھی بھی نہیں بتایا۔“

”جب ڈاک آتی ہے تم اس وقت سکول ہوتی ہو۔ اور پھر جب واپس

ہو تو مجھے یاد نہیں رہتا۔“

”اچھا۔ تو یہ بتائیے۔ کیا میرے ابو وہاں سے میرے لیے کچھ بھیجتے ہیں؟“

”ہوں۔“ ہاں۔ نہ۔ ہاں۔“ عائشہ بچی کی اس دیکھوں جیسی حرج بڑی طرح گھبرا گئی تھی۔ ”ٹھیک سے کوئی جواب نہ دے پائی۔“

”کیا بھیجا ہے انہوں نے۔؟ آپ نے تو مجھے کبھی کچھ نہیں دیا۔“ وہ

کی گردن میں بائیں حائل کرتے ہوئے بولی۔

”تم ابھی چھوٹی ہو نا۔“ وہ اوپر تلے سوال کیے جا رہی تھی۔ عائشہ کو

ملنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

”تو پھر صرف دکھا ہی دیجئے۔“ اس کے گلے میں جھولتے ہوئے بڑے

انداز میں کہنے لگی۔

”منزہ کے ماموں نے کسی کے ہاتھ اس کے لیے بجلی سے چلنے والی ریل گاڑی

تھی۔ وہ لا کر اس نے ہیں دکھائی۔ آپ بھی مجھے ابو والی چیزیں دیں۔ میں

وہ اور دوسری لڑکیوں کو دکھاؤں گی۔“

”نہیں بیٹے! لڑکیاں خراب کر دیں گی۔“

”اچھا تو پھر سکول نہیں لے کر جاؤں گی۔ مجھے ہیں دکھا دیں نا۔“

”اچھا اچھا — دکھاؤں گی —“ عائشہ اُلجھ سی پڑی — ”جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھوؤ اور کچھ کھاؤ پیو — آتے ہی میرا دماغ چاٹنا شروع کر دیا —“ اور عائشہ جلدی سے پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی —

اس وقت کچھ بھی کرنے کا رُٹ نہیں تھا مگر بچی کو دکھانے کی خاطر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے لگی —

”میں نہیں جاؤنگی پہلے مجھے ابو کے خط اور چیزیں دکھائیے —“ مجھے غطوں پر سے ٹپٹ بھی آنا نہیں — میری ایک سہیلی لکھے کر رہی ہے —“  
”کہا جو کہ دوں گی — پہلے کھانا تو کھاؤ —“ عائشہ کا خیال تھا کسی اور طرف متوجہ ہوگی تو ادھر سے خیال ہٹ جاتے گا —

”نہیں — جب تک آپ دیں گی نہیں — میں کھانا نہیں کھاؤں گی —“ بچی بھی ضد پر اتر آئی تھی —

عائشہ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا مگر تھی بڑے حوصلہ اور برداشت والی — اسے بڑے آرام سے ، پرسی نرمی سے سمجھاتی رہی — بہلاتی رہی — مگر جانے کیا ہو گیا تھا اسے — ایسی ضد آگئی تھی کہ ماں کی کوئی بات نہیں سن رہی تھی —

نانی اماں نماز سے فارغ ہو کر ادھر ہی آگئیں — اس کی ضد کا پتہ چلا تو وہ بھی اسے ادھر ادھر کی باتوں میں بہلانے کی کوشش کرنے لگیں — مگر اس پر تو کوئی جنون سوار تھا کسی کی بھی سننے کو تیار نہیں تھی — آخر عائشہ نے سوچا —

آج اس نے اتنی لمبی چوڑی جرح کر ڈالی — ایک دو سال میں اور بھی بوشیار ہو جائے گی — پھر اور کرید کرے گی — اور یوں عائشہ کب تک اسے ان جھوٹے دلائل کے سہارے بہلاتی رہے گی — ایک جھوٹ — دوسرا جھوٹ — تیسرا

جھوٹ — اس کی زندگی تو مسلسل ایک جھوٹ بن جائے گی — اور جھوٹ بولنا گناہ ہے — کب تک گناہ کرتی رہے گی — ؟ ضمیر کا بوجھ بڑھاتی رہے گی — !  
اسے بچی کو سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا — اس روز روز کے جھوٹ اور گناہ سے جان تو چھوٹے گی — ضمیر کا بوجھ تو ہلکا ہو جائیگا — شاید پھر بچی کو بھی صبر آجائے —

”بیٹے !“ عائشہ نے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالا اور بڑے گھمبیر لہجہ میں بولی —  
”میرے پاس آؤ تمہیں میں اصل بات بتاؤں —“

وہ نانی کے پاس سے اُٹھ کر جلدی سے اس کے قریب آکھڑی ہوئی —  
”بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے ابو نے دہاں ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے —“  
”ابو کی شادی تو آپ سے ہوئی تھی —“ اس نے بہت حیران ہو کر پوچھا —  
”ہوئی تو تھی —“ عائشہ پھر سیٹھائی — خود کو سنبھالا —

”لیکن — لیکن —“ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات کا اسے کیا جواب دے —  
”بس ! دہاں بھی کر لی — ویسے بیٹی ! ہمارے مذہب میں مرد کیلئے چار شادیاں آئیں — اس لیے تمہارے ابو کو وہ لڑکی اچھی لگی — انہوں نے شادی کر لی —“  
وہ چند لمحے حیران حیران ماں کو دیکھتی رہی — اس انداز میں جیسے اسے ماں کی بات یقین نہیں آیا تھا —

”مگر امریکہ میں تو میس ہیں ہوتی ہیں —“  
”ہاں —“  
”میس سے میرے ابو نے شادی کر لی —؟“ بے حد حیرت سے اس نے پوچھا —  
”ہاں —“

پہنچانا آسان نہ تھا۔ وہ رو رہی تھی اور بڑبڑا رہی تھی۔ مجبوراً اسے اپنی بات  
تردید کرنا پڑی۔

”ارے! میں تو مذاق کر رہی تھی۔“

”پسی۔۔۔؟“ وہ لپک کر پھر اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔

”ماں۔۔۔“

ایکدم ہی اس کے رخساروں پر سرخیاں پھیل گئیں۔ عجب سا اطمینان کا سانس  
لیتے ہوئے جلدی سے بولی۔

”پھر۔۔۔ میرے ابو واپس کب آئیں گے۔؟“

”دراصل وہ پاکستان آنا ہی نہیں چاہتے۔“

”کبھی بھی نہیں۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔“

”اپنی بیٹی کے پاس بھی نہیں۔؟“ اس نے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔  
”میری بیٹی کی اتنی جو اس کے پاس ہے۔ پھر اسے ابو کی کیا ضرورت ہے۔؟“

”ہے ابو کی ضرورت۔۔۔“ وہ زور سے چلا پڑی۔

”تم اپنی ضروریات مجھے بتاؤ بیٹے۔۔۔؟“

بچی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

عائشہ کچھ دیر اسے یوں سوچوں میں کھوئے بیٹھے دیکھتی رہی۔ کتنی اداسی  
تھی اس کے چہرے پر۔ جی کٹ کر رہ گیا۔

”بھوک نہیں لگی کیا۔؟“ بڑی نرمی اور پیار سے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔“

”نہیں نہیں۔۔۔“ وہ ایکدم ہی ہزیمانی انداز میں چلائی۔ ”میرے ابو ایسے نہیں  
ہو سکتے۔ میرے ابو کو بہت اچھے ہیں۔“

”اچھے تو وہ ہیں ہی۔ یہ کسی نے کہا کہ وہ بُرے ہیں۔؟“ عائشہ نے  
بڑے پیار سے بچی کی پیشانی پر سے ہاتھ لگائے۔

”لیکن۔۔۔ لیکن نازی کہتی تھی کہ جو میم سے شادی کرتے ہیں وہ بہت بُرا آدمی ہوتا ہے۔

اس کے ایک چچا نے میم سے شادی کی ہوئی ہے اور اب وہ میم اس کے چچا کو اپنی  
اتنی سے بھی ملنے کے لیے پاکستان نہیں آنے دیتی۔ میمیں بھی خراب ہوتی ہیں اور

جو میم سے شادی کرے وہ بھی خراب ہوتا ہے۔“ پھر جلدی سے بولی۔

”میرے ابو خراب نہیں ہو سکتے۔ کبھی نہیں۔ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔“

وہ بے حد غصے سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔

عائشہ پریشان ہو گئی۔ اس نے ذہن میں باپ کا کچھ ایسا تصور بٹھایا ہوا تھا کہ

وہ عائشہ کی بات سچ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ مائے! یہ کیسی بے بسی تھی۔؟ عائشہ

نے آنکھیں میسج کر سر کر سی کی پشت سے ٹیک دیا۔

نہنی نہنی سسکیوں کی آواز نے اسے چونکایا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ

فرش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ نانی بڑی پریشانی سے دونوں ماں بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔

رونے روتے وہ بڑبڑانے لگی۔

”مجھے جھوٹ بولنے سے منع کرتی ہیں اور خود جھوٹ بول رہی ہیں۔ میرے

ابو کبھی بھی ایسے نہیں ہو سکتے۔ کبھی جلی نہیں۔“

عائشہ کو اندازہ ہو گیا کہ باپ کا جو تصور اس نے قائم کیا ہوا تھا وہ اگر ٹوٹا تو

اس ننھے سے دل کو کتنا صدمہ پہنچتا تھا۔ اور ایک ماں کے لیے اولاد کو کوئی تکلیف

”ہیں بیٹے! لی ہے۔ صبح تم نے ناشتہ بھی اچھی طرح نہیں کیا تھا۔“

”بہنیں۔۔۔ میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔“

اسی اثناء میں نانی اس کے لیے کھانا لے آئیں اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بڑے

دلدار سے بولیں۔۔۔

”میں اپنی بچی کو خود کھلاتی ہوں۔“

”نہیں نانی اماں! میں نہیں کھاؤں گی۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”پہلے میرے ابو آئیں۔“ وہ بیدار ہوتے ہوئے بولی۔

عائشہ چونک کر ماں کی جانب دیکھنے لگی۔

”تم کھانا تو کھاؤ۔ اتنی دور سے یکدم تو نہیں آسکتے نا۔“ نانی نے اسے

بھلانے کی کوشش کی۔

”خط لکھیں گے۔ آٹھ دن میں پہنچے گا۔ پھر آتے آتے بھی بہت دن

لگ جائیں گے۔“

”دعہ کرتی ہیں ناکہ میرے ابو کو میرے پاس بلا دیں گی۔“ وہ نانی کے

قریب ہوتے ہوئے بڑی مت سے بولی۔

”ہاں۔۔۔ ضرور بلا دوں گی۔ بس تم جا کر جلدی سے ہاتھ دھو آؤ۔“

پھر پرمکراہٹ لیے بچی ہاتھ منہ دھونے چلی گئی۔

”امی۔“ عائشہ نے ماں کو پکارا۔ وہ اس سے غلط وعدہ کر رہی

تھیں۔ بچی کی ضد کا علم بھی تھا کہ اس معاملے میں ہو بہو باپ پر گئی تھی۔

ایک بات ذہن میں سما جاتی تو پھر پوری کیے بنا ملتی ہی نہیں تھی۔ بے حد مدد

”آپ ایسا وعدہ اس سے نہ کریں جو پورا نہ ہو سکے۔“ عائشہ نے دلگیر سے

لہجہ میں کہا۔

”کیا معلوم ہو رہی جائے۔“

عائشہ نے متحیر ہو کر ماں کی جانب دیکھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔؟“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ عثمان لوٹ آئے۔“ وہ دور علاقوں میں دیکھتے

ہوئے بولیں۔

”جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عثمان ایک نہ ایک دن ضرور

آئے گا۔“

”اس کے آنے کا انتظار کرتے کرتے اب تو آنکھیں بھی پتھرا گئیں۔ جو

یوں سب کچھ چھوڑ جائیں امی! وہ پھر کبھی نہیں لوٹا کرتے۔“ عائشہ نے بڑے

رنج و کرب سے کہا۔

”انتظار کی ایک ایک گھڑی کتنی کٹھن ہوتی ہے۔ اس کا مجھے پورا پورا اندازہ

ہے۔ اور کسی موہوم امید کے سہارے میں اپنی بچی کو کیوں یہ روگ لگا دوں۔

اس چھوٹی سی عمر میں۔ یہ اس کے ساتھ ظلم ہو گا۔“

عائشہ نے کرسی کے بازو پر پیشانی ٹیک دی۔

”وہ کبھی نہیں آئے گا امی۔! کبھی نہیں۔ اس اپنا سچ زندگی کی سنگت

کو اس نے کیا کرنا ہے۔ وہ بڑی پرسکون اور کامیاب زندگی گزار رہا ہو گا۔

اس کے قدم سے قدم ملاتی منزل کی طرف رواں دواں، اس کی خوبصورت بیوی

پہلے ابو خط لکھیں پھر کھاؤں گی۔ اس کے سہ پرے ہٹا لیا۔

”کہا جو کہ لکھ دیں گے۔“

”ابھی لکھیں۔“

”نہیں بیٹے۔! ضد نہیں کیا کرتے۔ تم کھانا کھاؤ میں ابھی لکھ دیتی ہوں۔“

اب عائشہ بولی۔

”میں کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤں گی جب تک آپ لکھیں گی نہیں۔“

”بچے معلوم ہے۔ اگر ابھی نہ لکھا تو پھر آپ بھول جائیں گی۔“

”تم یاد دلا دینا۔“

”نہیں۔ نہیں۔ ابھی لکھیں۔“ پھر گلوگیر آواز میں بولی۔ ”آپ کو

علوم نہیں تاکہ میرا ابو سے ملنے کو کتنا دل چاہتا ہے۔ میری ساری سہیلیاں اپنے

اپنے ابو کے ساتھ سیر کرنے جاتی ہیں۔ ان کے ابو انہیں کھلونے لے کر دیتے

ہیں۔ پیار بھی بہت کرتے ہیں۔“

اس کے رخساروں پر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”اور مجھے کوئی بھی تو کہیں لے کر نہیں جاتا۔ کبھی کبھار اگر نانی اماں ساتھ

لے جاتی ہیں تو وہ بھی خراب خراب سے کھلونے لے دیتی ہیں۔ بس! مجھے

پہ نہیں پتہ۔ ابھی خط لکھ کر میرے ابو کو بلائیں۔ جب تک خط نہیں لکھیں

گی میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔“

”عائشہ بیٹی! چلو پہلے خط لکھ دو۔“ نانی نے عائشہ کو جھوٹ موٹ کا خط

لکھنے کا اشارہ کیا۔ تاکہ اس وقت کسی طرح تو وہ بہے۔

ماں کے کہنے سے عائشہ نے کاغذ قلم لے لیا۔ بچی جھاک کر پاس آگئی اور

اس کے لیے کیا ہے۔؟ کندھوں کا بوجھ۔! ناقابل برداشت بوجھ۔

”کون اپنی ساری زندگی کسی کے لیے تھمتا رہی ہے اتنی۔!“

بہت دن بعد آج پھر عائشہ کی آنکھیں پھلک پڑیں۔

”نانی اماں۔! بچی ہاتھ دھو کر اندر آتے ہوئے بولی۔“ اگر ابھی

کو خط لکھ دیا جائے تو کب پہنچے گا۔؟

”یہی کوئی چھ سات دن تک۔“ نانی نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز

میں جواب دیا۔

”اور ابو کو اگر یہ لکھا جائے کہ میں ان کے بغیر بڑی اداس ہوں تو پھر تو فوراً

آجائیں گے نا۔؟“

”ہاں۔“ نانی نے در دیدہ نگاہوں سے عائشہ کو دیکھتے ہوئے دیر سے

سے کہا۔

”وہاں سے پاکستان آنے میں کتنے دن لگتے ہیں۔؟“

”یہی کوئی دو دن۔ اگر ہوائی جہاز کے ذریعے آئیں۔ اور بحری جہاز

میں تو جینے کے قریب لگ جاتا ہے۔“

”تو ابو کو لکھیں کہ ہوائی جہاز میں آئیں۔“

چچی کی باپ کو ملنے کی ٹرپ اور بے قراری دیکھتے ہوئے عائشہ نے پچھلی

سے پہلے بدلا۔

”اچھا۔ اچھا۔ لکھ دیں گے۔“ نانی اماں نے نوالہ اس کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لو اب تم کھانا تو کھاؤ۔“



پنسی اٹھوں اور سڑکے ہوئیں سے باپ کو اپنے غلط فہمی سے لکھوا لکھوا کر کہتا تھا۔ "اور شاید اس کا انتظار ختم ہو جائے۔"

نانی اماں نے کچھ دیر پہلے جو حساب لگا کر بتایا تھا وہی حساب سے باپ کا انتظار کرنے لگی۔ "آٹھ دن خط پہنچنے کے دو دن آنے کے۔ اور پھر یہ دس گیارہ دن۔" "دہ میں نے کوشش کی تھی مگر اس نے اپنے ذہن میں باپ کا کچھ ایسا تصور نہیں بنایا۔" "پھر اس نے میری بات ماننے کو تیار ہی نہ ہوئی۔ اور اگر میں ذرا زیادہ اصرار کرتی تو اپنے تصور کے چمکا چور ہو جاتے پر اسے غنا خد نہ پہنچتا۔ مجھ سے وہ دکھ کوئی آہٹ ہوتی، بھاگ کر بیرونی دروازے تک جا پہنچتی۔" "شاید اگلے۔" "ہاں، اذیت اسے نہ دی گئی۔" "ماں ہوں نا امی۔"

"ہیں۔" "ہر آہٹ پر اسے یہی گھان گزرتا۔" "پھر۔؟ آخر کچھ تو کرنا چاہیے۔ وہ تو باؤلی سی ہوئی پھر رہی ہے۔" "ہاں۔ کچھ تو کرنا چاہیے۔ ابھی چھوٹی ہے۔ سنبھل جائے گی۔" "پھر عائشہ نے اُسے پکارا۔" "جی امی۔!" "بیٹے! کیا کر رہی ہو۔؟"

"امی! اپنی گڑیا کو نہ کپڑے پہنا رہی ہوں۔ ابو دیکھ کنوش ہونگے۔" "پہلے میری ایک بات سن لو۔ پھر جا کر پہنا لینا۔" "عائشہ نے بڑی حیرت سے آہ بھری۔"

"ہائے امی! یہ آپ نے کیا کیا۔؟ انتظار کی کٹھن گھڑیاں۔ جن کا ایک ایک لمحہ ایک ایک سال کے برابر ہوتا ہے۔ کیوں اس معصوم سی جان پر اتنا بڑا اور طویل عذاب آپ نے مسلط کر دیا۔ اتنا طویل۔ کہ جس کا شاید ہی انت ہو۔ یہ اس غمی سی جان کے ساتھ ظلم ہے۔ اور بڑی سخت زیادتی ہے۔"

"تو بھری۔! بیٹے! یہ تو کسی طرح بھلتی ہی نہیں تھی۔" "جی امی۔! ریگیلے بھر کیلے کپڑوں والی گڑیا کندھے سے لگائے وہ آنکھوں کی جڑ کی تھی اور میرا کچھ مہ کو آ رہا تھا۔"

نانی بھی اس کی ان وارفتہ حرکات سے پریشان تھیں۔ "میرا خیال ہے اسے یہ بتا دو کہ اس کے باپ نے وہاں اور شادی کر لی ہے۔" "میں سناؤں کی چمک لیے دروازے میں کھڑی تھی۔" "ادھر آؤ۔ میرے قریب۔" "عائشہ کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔"

ماں نے جلدی سے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا — خود وہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ عائد اسے پاس بلا کر کیا کہنے والی تھی —

”دیکھو بیٹی —!“ وہ بہت دھیرے دھیرے اور بہت نرمی سے کہنے لگی۔  
”زندگی میں بعض ایسے حادثات ہو جاتے ہیں جنہیں خذہ پیشانی سے قبول کرنے میں ہی انسان کی بھلائی ہوتی ہے۔ تم اپنے ابو کا انتظار کرنا چھوڑ دو۔“  
”کیوں اُمّی —؟“ وہ یکدم ہی زرد پڑ گئی۔

عائشہ نے اس سے نگاہ ہٹا کر کول مولی بات کہہ دی۔  
”اس لیے کہ تمہارے ابو ہماری دنیا سے بہت دور جا چکے ہیں — وہاں جہاں جانے والا پھر لوٹ کر نہیں آتا۔“

”لیکن آپ تے تو انہیں بلانے کے لیے خط بھی لکھا تھا۔“ وہ عجب کٹی پٹی سی آواز میں بولی۔  
”وہ صرف تمہیں بلانے کے لیے تھا بیٹی۔ تم اس وقت صند جو بہت کر رہی تھیں۔“

”نہیں — نہیں۔“ اس نے بڑی بچاؤ کی سے ماں اور پھر نانی کی جانب دیکھا۔ دونوں ہی کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ کسی حقیقت کا احساس ہو گیا۔  
گرا یا دوڑ پھینکتے ہوئے اس نے ماں کے گھٹوں پر سر رکھا اور چیخ پیچ کر رونے لگی۔ نانی سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس کی جانب لپکیں۔ مگر عائشہ نے اشارے سے روک دیا۔ وہ اپنے آنسو چھپاتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

اس کی آنکھوں سے یہ آنسو باپ کی کسی بُرائی، گناہ یا جرم نے نہیں پڑکائے تھے۔ اس لیے عائشہ نے اسے رونے سے منع نہیں کیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی، اسے پایا

رہی اور اس کے باپ کے متعلق بڑی اچھی اچھی پیاری پیاری اور خوبصورت ۳۸۱  
اتیں سنا رہی تھیں۔  
اس نے اس کے کردار کی ہر خوبی کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ہر اچھائی نائی۔ باپ کی جو تصویر اس نے ذہن میں بنائی ہوئی تھی اس میں اور بھی رنگ پڑے۔

البتہ کسی خامی کا ذکر نہیں کیا۔ ایسا نہ ہو باپ کی کسی خامی کا علم ہونے سے اس کی قسم کے احساس کھتری میں مبتلا ہو جائے۔ اسے باپ کا پیار نہیں ملا تھا۔  
ماں کی عظمت کے اخلاقی سہارے ہی مل جاتے۔ وہ دینے میں عائشہ نے اسے کام نہیں لیا۔

بہت ساری باتیں کرنے کے بعد عائشہ نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ باپ کی نقش قدم پر چلے گی اور ہمیشہ اچھے کام کیا کرے گی۔ تاکہ اس کے باپ کو مل سکے۔

جب خوب رو کر دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو وہ چپکے سے اٹھی۔ بغیر میل و محبت کے کھانا کھایا۔ کوئی ضد نہیں کی۔ کوئی شور شرابہ نہیں کیا۔ کہ یہ نہیں کھائے اور وہ کھائے گی اور فلاں چیز اچھی نہیں لگتی۔ جو کچھ آگے کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ عائشہ کا دل اتنا بھاری ہو رہا تھا کہ کوئی کام کرنے کو جی نہ چلا۔ ایسے ہی بیٹھی رہی اور خاموشی سے بچی کی حرکات کا جائزہ لیتی رہی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پرائی۔ اب اس نے نانی کا سفید دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ ماں کی چارپائی کے سر پر مصیبت بچھا، نماز پڑھنے لگی۔ حالانکہ نماز کا وقت بھی نہیں تھا مگر وہ پڑھتی

"اب تو مجھے معلوم ہو گیا ہے سب کچھ — اس لیے مجھ سے چھپا کر اسے بکس ۳۸۳

عائشہ سب کچھ دیکھ جاتی تھی۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا مگر — پھر کرتی کیا — ایک نہ ایک دن یہ تو ہونا ہی تھا — عثمان کے آنے کی کوئی امید ہی نہیں تھی کب تک جھوٹی تسلیاں دیے جاتی —

دعا مانگنے بیٹھی تو بڑی ہی دیر نہ تھیں ہاتھ پھیلے رہے۔ نبھانے اس مضمون دل میں کیا تھا —؟ عائشہ کی آنکھوں سے آنسو پھینکے کو چل رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ضبط کر پائی —

تمازا اور دعا سے فارغ ہو کر بغیر کسی کے کہے، خود ہی سکول کا کام لے بیٹھ عائشہ نے بھی کوئی بات نہیں کی — کچھ دیر بیٹھی کچھ لکھتی رہی — کچھ ہوتی رہی — جانے سکول کا کام پورا کیا بھی یا نہیں — پھر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی عائشہ نے پوچھنا چاہا مگر اس کی مہیب سی خاموشی کی وجہ سے اسے جرأت نہ ہوئی تھوڑی دیر بعد قدموں کی آہٹ پر عائشہ نے نگاہ اٹھائی — کاغذ میں بیٹھی کوئی چیز لیے اندر آ رہی تھی — بڑے ہولے ہولے سے اور لٹے لٹے سے قدم اٹھا "یہ کارنس پر رکھ لوں —؟" ماں کے قریب آ کر دھیرے سے بولی — "کیا —؟"

"ابو کی تصویر ہے —"

"یہ تم نے کہاں سے لی —؟" عائشہ نے حیران ہوتے ہوئے تند لہجے میں کہا اور جھپٹ کر اس کے ہاتھوں سے چھین لی —

"ایک دن نانی اماں اپنے بکس میں سے کپڑے نکال رہی تھیں تو کپڑوں کے نیچے پڑی ہوئی میں نے دیکھی تھی —" پھر بڑی منت سے بولی —

عائشہ کا دل اندر سے چیخ پڑا — یہ اسے کیسے بتاتی کہ اس نے یہ تصویر سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے چھپا کر رکھی ہوئی تھی — عثمان کی صورت نظر آتی تھی تو دل پر جانے کیا کیا گزر جاتا تھا —

"اتنی یقین کیجئے — میں ابو کی تصویر دیکھ کر رویا نہیں کروں گی — بلکہ —" ہانے کا فکھول کر تصویر نکالی اور ماں کے ہاتھوں میں تھادی —

"ابو کی اتنی پیاری شخصیت دیکھ کر میرے اندر کچھ ہونے لگتا ہے — پھر راجی چاہتا ہے کہ میں بھی خوب ڈھیر سا اڑ پڑھ لکھ کر ابو کی طرح بہت بڑا آدمی بن — پلیز امی! یہاں رکھنے کی اجازت دے دیجئے —!"

عائشہ کا سارا وجود بے جان سا ہوا جا رہا تھا — گردہ اپنی ہی باتوں میں لگی لی — ویسے بھی ابھی اتنی سمجھ دار نہیں تھی کہ ماں کی حالت کا اندازہ کر سکتی — عائشہ کے ہاتھ سے تصویر لے کر اس نے سامنے کارنس پر سجادی —

"اچھی لگتی ہے نایاں —؟ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ابو کی پیاری صورت لکھائی دے جایا کرے گی تو پھر میں بھی انہیں جیسی اچھی بننے کی کوشش کیا کروں گی —

لیک ہے نانی —؟"

مگر ماں کی خاموشی نے اسے چونکا دیا — جلدی سے قریب آتے ہوئے ہل کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی —

"کیا بات ہے امی —؟ میں نے تو کوئی بد تمیزی نہیں کی — پھر آپ مجھ سے بل کیوں نہیں رہیں —؟"

عائشہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے بڑی کامیابی سے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیری۔  
”تمہاری باتیں سن رہی تھی۔“

”اُمّی! میرے ابو کتنے اچھے تھے۔ اب میں اپنی ساری سہیلیوں کو اپنے ابو کی باتیں سناؤں گی۔“ وہ بڑے والہانہ انداز میں باپ کی تصویر کو دیکھے جا رہی تھی۔ کبھی بالکل قریب جا کر۔ کبھی ذرا پرے ہٹ کر۔ کبھی اس طرف سے۔ کبھی اس طرف سے۔

”ہر انداز میں اچھے لگتے ہیں۔ میں تو ضرور سب کو بتاؤں گی۔“

”ہاں ہاں بتانا۔“ عائشہ نے اسے ٹالنا چاہا۔ ”جاؤ ذرا جا کر دیکھو تو

نانی اماں کیا کر رہی ہیں۔؟“

بچی نانی کو دیکھنے چلی گئی۔ عائشہ نے عثمان کی تصویر کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ عثمان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اسے یوں محسوس ہوئی جیسے اس کی اپاہجی کا مذاق اڑا رہی تھی۔ عائشہ نے بڑے دکھ سے نگاہیں جھکا لیں۔  
”کاش عثمان! تم میری زندگی میں کبھی نہ آئے ہوتے۔“

اس دن کے بعد بچی کی عادات میں بڑی نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ سب خدیں اور شرمندہ نہیں ختم ہو چکی تھیں۔ پڑھائی کی طرف پوری توجہ دیتی۔ گھر کے کاموں میں نانی اور ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ نماز بھی اکثر پڑھتی اور پھر بڑی بڑی ویر و فاعا لگتی رہتی۔ عثمان کی تصویر سے آتے جاتے گفتگو ہوتی رہتی۔

”ابو! جیسے آپ اچھے تھے نا۔ آپ کی بیٹی بھی ویسی ہی اچھی اچھی

دگی۔ میں کبھی امی کو تنگ نہیں کیا کروں گی۔ نانی اماں کو بھی شرمندہ نہیں کر کے اب سنا یا نہیں کروں گی۔ پھر آپ مجھ سے خوش ہو کر میرے خوابوں ن آیا کریں گے نا۔؟“

ایسے ہی صبح سے شام ہوتی اور رات سے دن۔ اس واقعہ کو گزرتے ٹھہر دس روز ہو گئے تھے۔ اب دن بڑے سکون سے گزر رہے تھے۔ عائشہ مطمئن تھی۔ کیونکہ سچی بڑی اچھی راہ پر چل پڑی تھی۔ جیسی صاف ستھری اداات وہ اس کی دیکھنا چاہتی تھی بالکل ویسی ہی ہوتی جا رہی تھی۔

اسے سکول بھیج کر عائشہ ایک ادھوری تصویر مکمل کرنے بیٹھ گئی۔ امی ساتھ والی پڑوسن نے کسی کام کے لیے بلا بھیجا تھا۔ وہ ادھر چلی گئیں۔

اندھ گھر کی صفائی وغیرہ کر رہی تھی۔ دروازے پر دھک ہوئی۔ عائشہ چونکی۔ برش ہاتھ سے کرتے کرتے نیچا۔ کچھ مالوس سی آواز نی۔ جیسے کئی سال پہلے بھی اس نے سنی ہو۔ وہی انداز تھا۔ جانا پانا سا۔ سوچوں میں کھو گئی۔

عائشہ بی بی اکوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔“ ملازمہ نے آکر اطلاع دی۔ مجھے یا امی کو۔؟“

آپ ہی کا نام لے رہا تھا۔“ جا کر اس کا نام وغیرہ پوچھو اور یہ بھی کہ کام کیا ہے۔“ اس نے دھڑکتے ل کو تھامتے ہوئے کہا۔

پکپک کے لوگ اکثر اس سے ملنے آتے ہی رہتے تھے۔ مگر یہ آج دل ن ایک انوکھی سی بے قراری کیوں سمائی جا رہی تھی۔ سنا جانے کیوں۔؟

بُرش وہیں رکھتے ہوتے اس نے اپنی پیہوں والی کرسی پیچھے موڑ لی۔

”اوہ۔۔۔“ دروازے میں کوئی کھڑا تھا۔ ویسا ہی دراز قد۔ وہی انداز۔ اگھر اگر عائشہ نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔ ساری ہستی کانپ رہی تھی۔

یہ عثمان سے ملتا جلتا انسان۔ یہ کون تھا۔؟ اور یہاں کس لیے آیا تھا۔؟ وہ اپنے لرزے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

”عائشہ! ادھر دیکھو۔ یہ ہیں تمہارا عثمان آیا ہوں۔“ اس نے آگے بڑھ کر بہت اہستگی سے عائشہ کے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا دیے۔

عائشہ کے جسم میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ بڑے بے جان انداز میں آنکھیں کھولیں۔ وہ تو سچ مج عثمان تھا۔ جو اس کے قریب ہی اس پر جھکا کھڑا تھا۔

بہت بدل گیا تھا۔ چہرے کی رونق وہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ کچھ مضحک اور مضطرب سا تھا۔ کپٹیوں پر تھوڑی تھوڑی سفیدی آگئی تھی۔ اُننا بدل گیا تھا مگر۔ عائشہ اسے لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

اُس نے طویل عرصہ بعد اس کی دلکش آواز سنی تھی۔ اُس نے عرصہ بعد اس کی صورت دکھائی دی تھی۔ عائشہ کا دل دھڑک دھڑک کر حلق میں آنے لگا۔ وہ پیشی چھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

کیا تجھے پہچانا نہیں۔؟ اپنے عثمان کو۔“

اس نے جھک کر عائشہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہی والہانہ انداز۔ ادوی محبت بھرا لہجہ۔ اگلے۔ یہ جیتے ہوئے دس برس۔

کانٹوں کی سبج۔ چھلنی جسم۔ زخمی روح۔ اُلگاہ اپنی کٹی ہوئی ٹانگوں پر جا پڑی۔

عائشہ وہی تو تھی۔ اپنا بچ اور محبوب۔ اور عثمان بھی وہی تھا۔ اس کے دل میں نئی نئی انگلیں اور آرزوئیں بیدار کر کے۔ اسے سہارا دے کر پھر بے سہارا کر جائے والا۔ کندھوں کا بوجھ سمجھ کر پھینک جائے والا۔ اور پھر نہ صرف اس کی بلکہ اس نے تو اپنی اولاد کی بھی کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔ کیسے کیسے اس نے اسے ٹپ پایا اور رلایا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو عائشہ۔؟ کچھ بولو۔“ عثمان نے اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”مجھے معاف کر دو عائشہ! مجھے معاف کر دو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔“

عائشہ اب بھی ساکن تھی۔ کیا عثمان اس قابل تھا کہ اسے معاف کر دیا جاتے۔؟

وہ محبت، جو اس نے دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھی تھی۔ اُٹا اُٹ کر اسے معاف کر دینے کو کہہ رہی تھی۔ دل ٹرپ رہا تھا۔ چل رہا تھا۔ اتنے عرصہ بعد اپنے عثمان، اپنی محبت کو سامنے دیکھ کر دھک دھک کیے جا رہا تھا۔

”میں تمہیں کیسے بتاؤں عائشہ! کہ تمہیں چھوڑ کر میں کہیں بھی سکون نہیں پاسکا۔ مجھے کسی دامن تلے وہ ٹھنڈی چھاؤں نہ ملی جو میری روح کو قرار بخشتی۔ اور آج اسی سکون و قرار کی تلاش مجھے پھر تمہارے پاس لے آئی ہے۔“

”یہ آدم کے بیٹے کتنے سنگدل ہوتے ہیں۔ کتنے خود غرض ہوتے ہیں۔“

بس صرف اپنے ہی دل کے سکون اور قرار کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ دوسرے کے دل کا انھیں ذرا احساس نہیں ہوتا۔ میں جو اتنی پریشان، اتنی دیران اور ایسی بے سہارا ہو گئی اس کا اسے احساس نہ ہوا۔ اور جب اپنے آپ کو بے سکونی ملی تو فوراً سکون کی تلاش شروع ہو گئی۔ اود خدا! یہ سب کیا ہے۔“

عائشہ سوچے جا رہی تھی۔ اب تک اس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ کچھ بولنے کی، کچھ کہنے کی اس میں طاقت ہی نہیں تھی۔ البتہ ذہن ہر بندش، ہر قید سے آزاد تھا۔

”تمہیں مجھ سے یہ پوچھنے کا حق ہے کہ میں اتنا عرصہ کہاں رہا اور کیوں میں نے ایسی قبیح حرکت کی۔ مجھ سے پوچھو عائشہ! مجھے کچھ کہو۔ مجھے سرزنش کرو۔ مجھے لعنت ملامت کرو۔ تاکہ میرے ضمیر کی چیخیں کچھ کم ہو۔ مجھے کچھ قرار ملے۔ جو جی میں آئے کہہ ڈالو۔ میں سب کچھ سہہ لگا۔ اس لیے کہ میں تمہارا گنہگار ہوں۔“

عثمان نے عائشہ کے گھٹنوں پر سر ٹیک دیا۔

ظلم و گناہ کے احساس نے عثمان کو اس کے قدموں میں لا ڈالا تھا۔ ورنہ عائشہ میں ایسی کوئی خوبی نہ تھی کہ وہ حیات کی منزلیں اس کے ساتھ طے کرتا۔

اب عائشہ کا احساس بیدار ہوا۔ عثمان نے اسے جھکا دیا تھا۔ یہ وہی عثمان تھا۔ اور جو ٹھکانے گئی تھی۔ یہ وہی عائشہ تھی۔ بے شک وہ مجبور و محتاج تھی مگر اتنی بے حس اور اتنی بے غیرت نہیں تھی۔ کہ آدم کے ایک بیٹے کے ہاتھوں

کٹھ پتلی بنی رہتی۔ جب اس کا جی چاہتا تو در پھینچ بچا کر شروع کر دیتا اور جب اس سے دل آتا جاتا تو پرے پھینک کسی اور کی طرف رخ کرتا۔ آخر وہ بھی دل و دماغ رکھتی تھی۔ کچھ احساسات و جذبات رکھتی تھی۔ اس کا سر گھٹنوں پر سے جھٹک کر ہٹا دیا۔

”تمہاری دوسری کٹھ پتلی کہاں گئی۔“ عائشہ کی جبین پر شکن تھے اور لہجہ سرد۔ کٹھ پتلی کو کسی۔“

”وہی۔ جس کی خاطر مجھے چھوڑا تھا۔“

”ایسا نہ ہر بلا لہجہ نہ اختیار کرو۔ پہلے میری پوری روئیداد تو سن لو۔“

”میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔ تم مجھے طلاق دے چکے ہو۔ اب میرے پاس آنے کا تم کوئی حق نہیں رکھتے۔“

”میں نے تمہیں طلاق نہیں دی۔“ عثمان جلدی سے بولا۔

”مگر دینے کے متعلق سوچا تو تھا۔ لہذا بات ختم۔ تم جاسکتے ہو عثمان۔“

”ا۔“

دل و صحرک و صحرک کہ اسے اس فیصلے سے منع کر رہا تھا مگر اس نے

اپنی انا کی خاطر اسے پھتر بنا لیا۔

”نہیں عائشہ! اپنے دل کا حال کہے بنا نہ میں یہاں سے جاؤنگا اور نہ ہی

ہاں سکتا ہوں۔ کھوتی ہوتی منزل کو پا کر دوبارہ کھولنے کی ہمت نہیں۔“

”میں تمہاری منزل نہیں ہوں عثمان۔! جاؤ اپنی تلاش جاری رکھو۔“

تم مردوں کی ایک منزل کبھی نہیں ہوتی۔ تمہیں تو جب تک ہر قدم پر نئی

منزل نہ ملے تم پارے کی طرح بے قرار رہتے ہو۔ جاؤ اپنی فطرت کی تسکین

مجھے لیے ایک بار پھر کا مرن ہو جاؤ۔“

”میں تمہارا خاوند ہوں عائشہ! اور تم میری بیوی۔ مجھے تمہیں اپنے پاس رکھنے کا پورا حق ہے۔“

”میں نے کہا بھی کہ سب کچھ ختم ہو چکا۔ آج سے دس سال پہلے تم یہ حق کھو چکے ہو عثمان۔ آج بگنیے ٹوٹ گئے۔ کہ چہاں بکھر گئیں۔ اب دوبارہ نہیں جڑ سکتے۔“

”نہیں عائشہ! میری اپنی عائشہ! یوں نہ کہو۔ اب غصہ مٹو دو۔“

عثمان نے پھر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”مجھے معاف کر دو۔ تمہارے بغیر مجھے کہیں بھی سکون نہیں ملا۔ کہیں بھی نہیں۔ یہ دیکھو۔ میری آنکھوں میں۔ میرے دل میں۔ اسی طرح تمہاری محبت موجزن ہے۔ اور محبت ایسا جذبہ ہے جو آپ ہی ٹوٹے آگینیوں کو جوڑ لیتا ہے۔ یوں۔ یوں۔ کہ بال بھی دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ رہتا ہی نہیں۔ میرا بیار تمہاری ہر شکایت ہر گلہ دور کر دے گا۔“

عثمان نے عائشہ کے کانپتے ہاتھ تھام لیے۔ انہیں چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور بہت دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

”جانے کیوں میری آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی۔ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ میری دوست بن گئی۔ اس نے مجھے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ اس نے میرا رُکھ و دریاٹھ لینے کی قسم کھائی۔“

وہ میری کچھ بھی نہیں تھی مگر پھر بھی میرے سب کام کیا کرتی تھی۔ پھر ہم اکٹھے ہی رہنے لگے۔ ایک ہی فلیٹ میں۔ اکثر سیر کرتے جاتے۔

نیا دیکھنے جاتے۔ وہ میرے لیے شاپنگ کرتی۔ میرے لیے کھانا اُتی۔ اس نے میری بڑی خدمت کی۔ اور میں اس کی ان من موہنی آواز پر مر رہا تھا۔ میں نے سمجھا اصل زندگی یہی ہے۔“

عثمان دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولتا چلا گیا۔

”پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ وہ پاس ہوتی تو لگتا زندگی پاس ہے۔ اس کا خناج سا ہو کر رہ گیا۔ تب میں نے اس کے ساتھ زندگی گزارنے فیصلہ کر لیا۔ ہر انسان بنیادی طور پر خود غرض ہوتا ہے۔ میں نے اپنا آرام مافی رفاقت میں پایا۔“

عثمان عائشہ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگایا۔ عائشہ پچاپ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اب عثمان کے طور اطوار کافی سنجیدگی آچکی تھی۔ سگریٹ کا لمبا سا کش کھینچتے ہوئے وہ پھر گویا ہوا۔ ہمارے مذہب میں مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے اور بیگنیت قت بربال رکھنے کا بھی۔ اور یہی بات ہم مردوں کو خراب کرتی ہے۔ ہم بیچاری حوا کی بیٹیوں پر ظلم کراتی ہے۔ ہم مرد خود غرض بن جاتے ہیں۔ میں بھی ایک انسان تھا۔ خود غرض انسان۔ اخلا کا پتلا انسان۔!۔ کچھ بھی نہ سوچا سمجھا۔ دل کا فیصلہ سنا اور اس پر اڑ گیا۔ یہ نہ سوچا پر کیا کر رہے گی۔ اپنی زبان اور اپنے وعدوں کا بھی خیال نہ رہا کہ میں نہیں ایک خوبصورت مستقبل اور پیارا سا گھر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اسہارا بنا تھا۔

لوگوں نے مجھے فرشتے کے نام سے موسوم کیا تھا۔ میری عظمت کا

”مجھے چھوڑ دو۔ میں خود چلی جاؤں گی۔ جب دوسرے سہارے چھن جاتے ہیں تو انسان خود اپنا سہارا آپ بن جاتا ہے۔ اب مجھے خود کو سنبھالنا آ گیا ہے۔“ خود کو چھوڑنا چاہا۔ مگر اس کی مدافعت بڑی کمزور تھی۔

”دس سال کی اس طویل مدت نے تمہارے چہرے پر کوئی تاثر نہیں چھوڑا۔“



فا۔ سرخ سرخ کپڑوں میں تمہارا شرم و حیا سے جھکا خوبصورت چہرہ  
دل کو بھی شرمادہا تھا۔

بہت غرصہ پہلے سے میں تمہیں دیکھتا آیا تھا۔ مگر اس رات تمہارا عالم ہی  
لا۔ دلہنا پلے کی شرم و حیا نے تمہیں حسین سے حسین تر بنا دیا تھا۔ تم  
بے بھی شرماتی جا رہی تھیں۔ مجھ سے بھی۔ جو کتنے ہی سال اکثر  
مے پاس، تمہارے ارد گرد ہی رہا تھا۔

ہمارے مشرق کی لڑکیوں کا یہی زیور تو انمول ہے۔ پھر میں نے  
بار و نمائی میں انگوٹھی پہنائی تو عجیب سحر انگیز قسم کی شرمابٹ سے تم نے  
بخشائی ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا تھا۔

نشان نے پھر ٹھنڈا سانس بھرا۔

اور اس کے ساتھ میری جو شادی ہوئی۔ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔  
اروٹی تھی۔ نہ ارد گرد وہ لوگ تھے۔ نہ فضا میں مہندی کی باس  
اٹھی اور نہ ہی موتیے کی مستی بھری تھک ماحول کو معطر کر رہی تھی۔ نہ  
سات کی چمک دکھاتی تھی اور نہ ہی پشیمانوں پر چاند جھوگا رہے تھے۔  
ہولک کی آواز تھی اور نہ ہی مدد بھرے گیتوں کی تانیں۔ کچھ بھی  
ن تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

سفید لباس میں وہ میرے ساتھ کورٹ پہنی گئی۔ وہاں میں نے شادی  
انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ ایک واضح سی مسکراہٹ مجھے جواب  
دلی۔ تو شرم و حیا سے سمٹ کر دو گردے گردے خانی ہاتھ پہرہ چھپاتے  
رے تصور میں آگئے۔ عجیب سی دیوانی میرے دل میں سمائی چلی گئی۔

”پھر میں نے اس سے شادی کر لی۔ وہ پہلا دن تھا جب میرے ذہن  
نے کچھ سوچا۔ میرے ہوش و حواس بیدار ہوئے۔ ایک شادی تم سے بھی  
ہوتی تھی۔

کتنی رونق تھی۔ ڈھولک بچ رہی تھی۔ ارد گرد چمچ چمکتے روشنی  
لباس سرسراتے پھر رہے تھے۔ میری بہنیں۔ میری بھانجیاں۔ میری بھابی  
کچھ سگی۔ کچھ عزیز رشتہ دار۔ سب مجھے چھیڑ چھاڑ رہی تھیں۔ مہندی کے  
نوارے چھوٹ رہے تھے۔ مذاق کی لہریں بہہ رہی تھیں۔ شوخیوں کی کرنیں  
چھوٹ رہی تھیں۔

تمہارے لیے بے حد خوبصورت بری تیار ہوئی تھی۔ میرے ارنالوں  
کی طرح رنگین اور آرزوؤں کی مانند چمکتی وکتی۔ بڑے پیارے پیارے  
زیورات تھے۔ آکاش پر چمکتے چاند جیسے خوبصورت جھومر اور ٹیکہ وغیرہ۔  
فضا میں مہندی کی خوشبو دھجی تھی۔

عثمان نے مسکرا کر بڑی مستی بھری نگاہ سے عائشہ کی آنکھوں میں جھانکا۔  
”پھر مجھے دولہا بنایا گیا۔ طلافی ہاروں کی چمک سب میرے پہرے  
پر دیکھ رہے تھے۔ میری بہنیں، بھانجیاں بڑے زور شور سے ڈھولک  
بجھا رہی تھیں۔ بڑے پیارے پیارے گیت الما پڑ رہی تھیں۔ ساری  
فضا خوشیوں سے معمور تھی۔ پھر برات دلہن کے گھر چلی۔ میری عائشہ  
دلہن کے گھر۔ میں تمہیں بیاہ دیا۔

مجھے اب بھی وہ رات اچھی طرح یاد ہے۔ مسہری پھولوں سے سجی  
تھی۔ ارد گرد دلگتی زرد لٹریوں کو پڑے بٹاتے ہوئے ہیں بمشکل تم تک

معاشران کا چہرہ سب سے حد بخیرہ تھا۔ وہ ارد گرد سے لیے نمبر جیسے اپنے  
 ایک سے بھی بائیں کیے جا رہا تھا۔

پھر ہم اپنے فلیٹ میں آ گئے۔ دو چار میرے ملنے والے مدعو تھے اور  
 کچھ اس کے۔ ایک چھوٹی سی پارٹی ہوئی۔ شراب کی بو ہر طرف پھیل رہی  
 تھی۔ مغربی دھن نے اسی پھوٹے سے فلیٹ کے ایک کمرے کو بال اردو  
 بنا ڈالا۔

دھن کے پاؤں بھی مخر کنے لگے۔ اور سہاگ رات سے پہلے ہی وہ  
 دھن کے بازوؤں میں خود کو دینے لہراٹے لگی۔ نہ نگاہ میں دلھنا لے کی  
 شرم و چارہ لگی نہ آواؤں میں جھپک۔ بے باک سی سکر ایٹ ہوئی۔  
 دھن کے نظارہ دے رہی تھی۔

سارے مہمان رخصت ہوئے تو دو دلہا دلہن سہاگ رات منانے جملہ  
 عروس میں چلے گئے۔ نہ وہاں چھوڑوں سے سچی مسہری تھی نہ اس کے دیبا  
 مسخ سرخ کپڑوں میں بلوس شرم و بیا کی گٹھڑی سی پٹری تھی۔ اندر جاتے  
 تو میری تو بیا ہتا دلہن سارے دن کی تھکاوٹ کی شکایت کرتے ہوئے پلنگ پر  
 دراز ہو گئی۔

میرے دل کے اندر جیسے کوئی خلاء سرا پیدا ہو گیا۔ زندگی میں جیسے کچ  
 کمی سی لگتی تھی۔ بھانے کیا ہوا۔ وہ شادی سے پہلے والی بات ہی نہ  
 رہی۔ ہمارے مذہب چار۔ وطن الگ۔ معاشرت مختلف اور بیا  
 فلیٹ۔ کچھ ہی تو ایک نہیں تھا۔ ہر بات میں اختلاف۔

اگر ہم میں کوئی مشترک چیز تھی تو وہ مخالف جنس کی ضرورت اور اہمیت

ملک اور مذہب اور ہر معاشرت میں یکساں ہوتی ہے۔ بس  
 ب اختلافات ہی اختلافات تھے۔

اور جہاں قدم قدم پر اختلافات ہوں وہاں گزارہ مشکل ہوتا ہے۔ شریخ  
 ی میں تو اتنا محسوس نہ ہوا۔ مگر آہستہ آہستہ جوں جوں رفاقت بڑھتی  
 ہم دونوں میں لاشعوری طور پر ایک دوسرے کو اپنے اپنے ڈھب پر لگانے  
 شش کرنے لگے۔

مگر مشرق اور مغرب کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ نہ وہ پاٹ کر ادھر آسکی اور  
 یں پاٹ کر ادھر۔ دونوں کی بنیادی عادات پختہ تھیں۔ نہ وہ اپنے  
 ب، اپنے معاشرے سے انچ بھر ہلی نہ میں سر کا۔

بچوں کی تربیت کا مسئلہ بڑا پیڑھا ثابت ہوا۔ میں انہیں اپنا مذہب  
 اپنی معاشرت سکھانا چاہتا تھا مگر بچے کی تربیت گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔  
 اور میرے بچوں کی ماں میرے مذہب سے نابلد تھی۔ میری معاشرت سے  
 واقف اور میری زبان سے بے بہرہ۔

تلیخیاں بڑھنے لگیں۔ آتے دن ہم میں جھگڑے ہونے لگے۔ میرے  
 لک کی عورت خاوند کے سامنے زبان نہیں کھولتی۔ میں نے اس سے بھی  
 ہی توقع کی۔ میرے ملک کی عورت کسی غیر کے سامنے چہرہ نہیں کھولتی۔  
 ہنجی رانیں، تنگے بازو اور نیم عریاں سینہ لیے سب کو ملتی تھی۔

میری پیشانی پر ناگوار سے ٹسکن پڑے رہنے لگے۔ میں بد مزاج اور  
 بڑچڑاسا ہو گیا۔ اور میری بد مزاجی اور بڑچڑاپن اسے مجھ سے متنفر  
 کرنے لگے۔ یوں وہ میری صحبت سے گھبرانے لگی اور اپنے پُرانے

سکی باہوں میں سکون کی تلاش کرتے ہی۔

ہیں۔!۔۔۔

صرف اس امید کے سہارے کہ تمہاری عالی ظرفی میری ہر خطا معاف کرے گی۔ میرے ہر قصور کو نظر انداز کر دے گی اور مجھے تمہارے واسن تلے دوسری پرانی پناہ گاہ مل جائے گی۔ جہاں سکون ہی سکون ہے۔“

عثمان نے عائشہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر تھپتھپایا۔  
بولو میری عائشہ! کچھ تم بھی کہو۔ بڑی مشکل سے، بڑی ہنگ و دود کے بعد

اپنے معلوم کر کے آیا ہوں۔“ پھر عثمان نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔  
وہ۔۔۔ وہ کہاں ہے۔۔۔؟  
کون۔۔۔؟ عائشہ سمجھ نہ پائی۔

میری بیٹی۔ میری زندگی۔ کچھ نہ پوچھو اسے دیکھنے کو، اسے پیار  
نے کو، اپنے سینے سے جھینچ لینے کو کیسے کیسے میرا دل تڑپا ہے۔ وہی  
زیرے پڑھا لے گا سہارا بنے گی۔ اس لیے کہ اس نے تمہاری کوکھ سے  
جنم لیا ہے۔ اسے تمہاری تربیت ملی ہے۔ اور تمہارا مذہب۔ جو میرا  
بھی ہے۔ بناؤ وہ کہاں ہے۔۔۔؟

عثمان نے سچی کا ذکر چھیڑا تو عائشہ کو بہت کچھ یاد آگیا۔ پچھلے دس سال کے  
ذمے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔

کس کس اذیت سے اسے گزرنا پڑا تھا۔ خود اپنے جذبات، اپنے  
حساسات کے ہاتھوں اور سچی کے ہاتھوں۔ کس کس طرح اس نے باپ  
پر یاد کیا تھا۔ روتی تھی۔ مچلی تھی۔ اور تڑپتی تھی۔

اس کی ضروریات باپ کی غیر موجودگی کی وجہ سے پوری نہ ہو سکی تھیں۔

عجبت کا نشہ ٹوٹا تو ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی نگاہ میں نکلے ہوئے  
ہیں میں نہ رہا۔ وہ نہ رہی۔۔۔ امر سچی عورت کو تو شادی کے بعد  
ہم مذہب اور ہم وطن خاوندیں سو عجیب دکھائی دینے لگتی ہیں۔ میں تو پھر  
غیر مذہب اور غیر ملک کا تھا۔ میرا توان سے کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔  
اور۔۔۔ پھر ہم میں علیحدہ کی ہو گئی۔

یہ اتنا عرصہ۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ کس بے سکونی اور کس اذیت میں  
نے گزارا ہے۔ گھر بلو الجھنوں کے علاوہ ضمیر کی جھین نے مجھے ایک پاؤں  
بھی اطمینان و سکون کا سانس نہیں لینے دیا۔ ہر لمحہ تم اور ایک ننھی سی با  
مجھے یاد آتی رہیں۔

دل بھی چاہتا تھا کہ جلد از جلد اپنی اسی کھوئی ہوئی جنت میں لوٹ چلا  
جہاں میری عائشہ کی ولادین مسکراہٹیں تھیں اور میری پیاری سی سچی کی کھلا  
گوئی تھیں۔

رات ہوتی تھی تو میری عاشق کی دھیمے دھیمے سروں میں سچی کے لیے  
گئی لوری مجھے بھی سلا دیتی تھی۔ بڑی میٹھی سی اور پُر سکون نیند۔ اور  
صبح صبح ایک ننھی سی، مہین سی، توتلی توتلی آواز میں پڑھا گیا کلمہ عجب قسم  
سرد اور کانوں میں رس ٹپکا کر مجھے جگاتا تھا۔

کتنی پُر سکون تھی وہ زندگی۔ اور پھر عائشہ کے چھوٹے موٹے کا  
سے دل کو کتنی لذت اور کتنا سکون حاصل ہوتا تھا۔ اور اب۔ اب  
ساری زنجیریں توڑ، یہاں واپس اپنی جنت میں آگیا ہوں۔ اپنے سکوا



بدبابت کو جذبات نہیں جانا تھا۔ اور مجھے دل دو ماخ رکھنے والا انسان

ہیں جانا تھا۔ صرف اور صرف ایک اپنا ہی سمجھتا ہوتا ہوا گھوڑا لگا دسی  
تھی۔ عثمان! چلے جاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے۔“

عائشہ نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ عثمان کسی مجرم کی طرح  
بہ جھکائے چپ چاپ، گم سم سا بیٹھا تھا۔ اسی کمرے کی دیوار پر آویزاں  
کاکا نے ساڑھے گیارہ بجائے۔ آج جمعہ تھا اور پچی کو بارہ بجے چھٹی ہو جانا  
تھی۔ عائشہ گھبراتی۔

”یہ دیکھو عثمان! تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ یہاں سے چلے جاؤ۔  
میری پچی کی بہتری اسی میں ہے۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے تم یہاں  
سے چلے جاؤ۔“

”عائشہ! کیا تمہیں مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں رہی۔ بہ چلو اب نہ سہی،  
گروہ پر یہ محبت کا واسطہ دیتا ہوں کہ اتنی سنگدل نہ بنو۔“

”تم سے محبت رہی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب میرے پاس نہیں۔  
اس وقت تو میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میرے اس فیصلے کے ساتھ ایک  
پوری زندگی کی بہتری وابستہ ہے اور میں خود غرض نہیں ہوں۔ میں اس  
کی زندگی بھر کے سکون کو ٹاکرا اپنی خوشی، اپنی محبت اور اپنے لیے سہارے  
ہی نہیں کر دوں گی۔ تم جاؤ۔“

عثمان اٹھا۔ بے حد افسردہ اور بالکل خاموش تھا۔ چند لمحے کھڑا  
بڑی حسرت سے عائشہ کو دیکھتا رہا اور پھر۔ سر جھکاتے، بڑا مضمل  
بڑا پریشان سا بہت دھیرے دھیرے پھرے بہت آہستہ آہستہ ایک ایک

گھر پہنچے تھے۔

”عثمان! تم چلے جاؤ یہاں سے۔ میری زندگی سے تو تم نے کھیل لیا۔  
مگر اپنی پچی کی زندگی کی، اس کے خوشگوار مستقبل کی میں خود حفاظت کر دوں گی۔  
اپنے جذبات و احساسات کی قربانی دے کر بھی۔ چلے جاؤ عثمان! چلے جاؤ۔“  
”تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“ عثمان کے حلق سے گھٹی گھٹی سی  
آواز نکلی۔

”ہاں۔“ عائشہ نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا اور بڑے حوصلے  
اور ضبط سے بولی۔ ”یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“  
”بالکل اہل فیصلہ۔“

”اٹل فیصلے کرنے کا صرف تمہیں ہی حق نہیں پہنچتا عثمان! میں بھی سینے  
میں دل رکھتی ہوں اور اس میں جذبات و احساسات رکھتی ہوں۔“  
”تم میری بیوی ہو عائشہ! قانوناً، شرعاً اور مذہباً۔ ہر طرح۔“ عثمان  
نے مصالحت کی ایک اور کوشش کی۔

”اور خاوند کا بیوی پر بہت حق ہوتا ہے۔“  
”وہ میری اولاد ہے۔ میری ذمہ داری ہے۔ وہ ذمہ داری، جو  
تمہاری بھی تھی۔ مگر تم نے قبول نہ کی۔ تم نے اسے راہ میں پھینک دیا۔  
اب وہ تمام تر میری ہے۔ اور اس کی بہتری کے لیے مجھے ہی سوچنا  
ہے۔“ عائشہ بڑی سختی سے بولی۔

”راہ خاوند کا بیوی پر حق۔ تو وہ تم اسی لمحے کنوا بیٹھے تھے جب تم  
نے میرا ہر حق مجھ سے چھین لیا تھا۔ میرے دل کو دل نہیں جانا تھا۔ میرے

قدم اٹھاتا، بار بار دڑ دڑ کر اسے دیکھتا کرے سے باہر نکل گیا۔

عائشہ اسے جانتے ہی نہ دیکھتی رہی۔ ایک دو بار دل تڑپا، مچلا بھی کہ اسے واپس بلا لے کر۔ پھر بچی کا خیال آگیا۔ دل کے ہر جذبے کو مصالحت اور بھلائی کے بڑے بڑے پتھر دل کے نیچے پھیل دینا پڑا۔

”کاش عثمان اتم اب بھی نہ آتے ہوتے۔“ وہ چلا گیا تو بے اختیار عائشہ کے آنسو رواں ہو گئے۔

”کیوں تم نے مجھے زندگی بھر لانے اور تڑپانے کی قسم کھا چھوڑی ہے۔“

بار بار اس کا یوں چپ چاپ سر جھکاتے واپس جانا یاد آ رہا تھا اور تڑپا رہا تھا۔ بے چین کر رہا تھا۔ بہت دیر روتی رہی۔

”اوہ خدایا! یہ کیسی اذیت ہے۔ یہ کیسی زندگی ہے۔“

انتہائے دکھ سے پریشان ہو کر اس نے آنکھیں میچ لیں۔

”اجی! اجی!“

بچی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے نگاہ اٹھائی۔

”یہ دیکھیے میں کیا لاتی ہوں۔“

”موہنیے کا ہار۔ یہ کس لیے۔“

”ابو کی تصویر پر ڈالو گی۔“

عائشہ کے دل میں طوفان سا اٹھا مگر سمجھتے ہوئے جلدی سے بولی۔

”نہیں بیٹے۔ ان تصویروں پر ہار نہیں ڈال کر تے۔ یہ بُت پرستی سمجھی جاتی ہے اور پھر اللہ میاں ناراض ہوتا ہے۔“

”مگر روبرو نے تو مجھے کہا تھا کہ خواب میں ابو کو بلانا ہے تو روزانہ کی تصویر کو ہاروں سے سجایا کروں۔“

”روبوئی غلط کہتی ہے۔ جو خواہش ہو براہ راست اللہ میاں سے کیا کرتے ہیں۔ وہی ہر آرزو پوری کرنے والا ہے۔ تصویروں کو ہاروں سے سجانے سے کچھ نہیں بنتا۔“

”تو پھر اب اس ہار کو کیا کروں۔“

”نانی اماں کی چادر پانی کے پاس جو کھڑکی ہے۔ اس میں لٹکا دو۔ ہوا کے ساتھ سارے کمرے میں خوشبو پھیلے گی تو اچھی لگے گی۔“

”بہت اچھا۔“ وہ ہار لٹکانے کے لیے بھاگ گئی۔

”عائشہ! بچی دوسرے کمرے میں گئی ہی تھی تو امی مانتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتیں اندر آ گئیں۔“

”مجھے اتنی دیر لگ گئی تم گھبراؤ نہیں گئی تھیں۔ دراصل مسئلہ ہی ایسا آں پڑا ہے کہ اس کے متعلق بحث کرتے کرتے وقت کا احساس ہی نہ رہا۔“

وہ اسی کمرے پر بیٹھ گئیں جس پر سے تھوڑی دیر پہلے عثمان اُٹھ کر گیا تھا۔

”کیا مسئلہ آں پڑا۔“

”فوزیہ کا بھانجا اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جا رہا ہے اور اس کی بہن آسیہ چاہتی ہے کہ فوزیہ کی بیٹی سے بیٹے کا رشتہ کرے۔“

”صوفیہ سے۔“

”ہاں۔“

”بڑی پیاری لڑکی ہے۔ خدا نصیب اچھے کرے۔“

” اسی سلسلے میں وہ بہن کے ہاں آئی ہوئی تھی — چاہتی تھی کہ لڑکے کے جانے سے پہلے بھانجی کو رخصت کرا کے لے جاتے — اس کے جانے میں ابھی دو مہینے ہیں — پھر وہ چلا جائے گا اور جو نہی تعلیم مکمل ہوئی بیوی کو دین بلالے گا —“

” پھر — کیا طے پایا —؟“ عائشہ نے بے قراری سے پوچھا۔  
 ” فوزیہ یوں چٹ پٹ کرنا نہیں چاہتی — اسیہ زور دیتے جا رہی ہے۔ اب فیصلہ لڑکے اور لڑکی کے باپ کریں گے۔“  
 ” فوزیہ آپا کو کہہ دیجئے امی! کہ اس جگہ بیٹی کا رشتہ نہ کرے۔“  
 ” کیوں —؟“ امی نے حیران ہو کر اسے دیکھا — ”سگی بہن کا بیٹا ہے۔ اچھی طرح دیکھا بھالا ہوا ہے۔“

” سب دیکھے بھالے ہوئے ہیں — مگر ان ملکوں کی کوئی بات ہی ایسی ہے کہ سارے مان ٹوٹ جاتے ہیں اور سب اعتماد بکھر جاتے ہیں — اپنی بیٹی کی زندگی تباہ نہ کریں — ساری عمر کے لیے اسے دیکتے انگاروں میں جلنے کے لیے نہ چھوڑ دیں۔“

” بہر کوئی عثمان جیسا نہیں ہوتا عائشہ! تم اس کی مثال سامنے نہ رکھا کرو۔“  
 ماں نے بڑے دُکھ سے بیٹی کی جانب دیکھا — پھر موضوع بدلنے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں — اچانک نگاہ فرس پر جا پڑی۔  
 ”مگر بیٹیوں کے بچھے ہوتے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر پھیلے تھے اور راکھ بکھری ہوئی تھی۔“

” کون آپا تھا —؟“

” جی۔ جی۔ کوئی نہیں۔“ عائشہ بوکھلا گئی۔

” مگر یہ سگریٹ اور ان کی راکھ — یہ کہاں سے آگئے —؟“

” اوه۔! ان کے متعلق پوچھ رہی ہیں۔“ عائشہ نے خود کو سنبھالا۔

” وہ آیا تھا امی! وہ — کپنی کا آدمی — نیا بیجر آیا ہے۔“ وہ عثمان

کے متعلق ماں کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی — گھبراہٹ میں جو کچھ سوچا کہایا۔

” کافی دیر بیٹھا ہوگا۔“ ماں نے پھر سگریٹوں کے بہت سارے

ٹکڑوں کی جانب دیکھا — ”کیا کہتا تھا —؟“

” کوئی خاص قسم کی تصویریں ہونا نا چھیں — اسی سے متعلق گفتگو ہوئی تھی۔“

” پھر کوئی چاتے وغیرہ بھی پوچھی اسے —؟“

” نہیں — خیال ہی نہیں رہا۔“

” بیٹی! ابھی تمہاری بچی کی پوری زندگی سامنے ہے۔ اور اس کے لیے سب کچھ

نہیں ہی کرنا ہے اور اسی سہارے سے۔! امی بڑی نرمی سے سمجھانے لگیں۔

” اس لیے ہر ایک سے بنا کر رکھنی چاہیے — چانے کی ایک پیالی سے

ہمیں کوئی کمی نہ آجانی مگر فائدہ بہت ہو سکتا ہے۔“ امی اپنے آپ ہی

مسکراتیں — بڑی تلخ سی مسکراہٹ تھی۔

” تم سوچ رہی ہو گی کہ ماں کتنی کاروباری ہو گئی ہے مگر عائشہ میری بچی!

مجھے اپنا کوئی لالچ نہیں — صرف اس ننھی سی جان کا خیال آ جاتا ہے تو

کینگی کر بیٹھتی ہوں۔“

پھر بڑے دُکھ سے ٹھنڈا سا نس بھرتے ہوئے اٹھیں۔

” کاش عثمان! میری بیٹی کی نہ سہی، اپنی اولاد کی ہی ذمہ داری مے نے محسوس

کی ہوتی — کیسا روگ لگا پایا ہے ہمیں — ”

” یوں نہ کہیے امی! یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے زندگی گزارنے کا کوئی بہانہ مل گیا ہے۔ اتنا پیارا بہانہ۔ اس کی ایک مسکراہٹ میرا پر ختم، ہر دُکھ دُور کر دیتی ہے۔ امی! میں نے بہت کچھ پایا ہے۔ باوجود اس کے کہ عثمان نے میرے ساتھ بے وفائی کی ہے مگر میں پھر بھی اس کی نگرانی ہوں کہ وہ مجھے زندگی گزارنے کا کوئی مقصد دے گیا ہے۔“

” اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود، جانے کیا وجہ تھی وہ عثمان کی ذرا سی بُرائی بھی کسی مُنہ سے نہیں سُن سکتی تھی۔“

” ہاں۔ یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم تو پھر بھی اسے جہنم دینے والی ماں ہو، تنہا ہی تو زندگی اسی سے ہونی چاہتیے مگر خود مجھ بڑھیا کی ضعیفی میں اس کی مسکراہٹوں نے ثناب جیسی نازکی بھردی ہے۔ خدا اسے سدا سلامت رکھے۔ سدا سلامت۔“

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

” سکول سے ابھی آئی نہیں۔ آج تو جمعہ تھا۔“

” آگئی ہے۔ جانے کہاں سے مویٹے کا ہار لے آئی ہے۔ اسی کو رکھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈتی پھر رہی ہوگی۔“

” میری بچی کے خوبصورت گلے سے زیادہ مناسب جگہ اور کونسی ہوگی۔ میں جا کر خود اسے پہنائی ہوں۔ بڑی پیاری لگے گی۔“

” نانی! اکثر اس کے ایسے ہی لاڈ دیکھا کرتی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر اسے دیکھنے چلی گئیں۔“

زندگی کتنے بڑے دُکھ سے عبارت ہے۔ عثمان کی روکشی بھی بے حد اذیت ناک تھی اور اب اس کا واپس آنا بھی عائشہ پر ظلم ڈھا گیا۔ کاش! وہ روپوش ہی رہتا۔ ایک پل کے لیے بھی تو اسے قرار نہیں مل رہا تھا۔ بہت دن یوں بے قراری اور تڑپ میں گزرے۔ یہ کیسا روگ تھا۔ یہ کیسی زندگی تھی۔ سچ سچ کانٹوں کی سیج۔!!

” اور پھر اسی سک، اسی بے قراری اور اسی پریشانی میں زندگی گزارنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد ماں کا بھی ساتھ چھوٹ گیا۔ دُکھ اور بھی سوا ہو گئے۔ مگر اس نے کسی غم کسی دُکھ کو جان کا روگ نہ بننے دیا۔ اس دُکھی زندگی کو پھر بھی سینے سے چپکا کر زندہ رہنا پڑا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی زندگی کو یاد کرنا پڑا۔“

اپنی بچی کی خاطر۔ خدا کی عائد کی گئی اس ذمہ داری کی خاطر! وہ اب جوانی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔

اسے کبھی احساس ہی نہ ہونے دیا کہ ماں کے سینے میں کون سے الاؤ شک رہے تھے۔ پھر۔ انہیں بھڑکتے شعلوں کی خاطر وہ خود کو یادہ سے زیادہ مصروف رکھنے لگی۔

” اور آہستہ آہستہ انہیں مصروفیتوں کے عالم میں وہ ننھا پودا پران ٹھہ گیا۔ کلی پھول بنی تو اس کی مسکراہٹوں اور خوشبوؤں نے عائشہ کے دل و دماغ کو اپنی معطر لپیٹ میں لے لیا۔ وہ اپنی پھولی زندگی کو قریباً بھول سی گئی۔ مگر پھر بھی اکثر و بیشتر ماضی کے دیہیچوں سے کوئی



دُکھ جھانک کر کچھ دیر کے لیے دُکھی ضرور کمہ دیتا۔

پھینکنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگے گا۔ ایک لمحہ بھی نہیں — نہیں نہیں۔  
مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔“

رفوخالہ اور رقیہ خانم نے بے حد پریشانی سے لالہ کی ماں کی جانب دیکھا۔  
منزل قریب آکر پھر دُور ہوتی جا رہی تھی۔

”آپ کسی کی مثال سامنے رکھ کر ہمیں تو مایوس نہ کیجئے۔“ رقیہ خانم بڑی  
منت سے بولیں۔ ”ہم بڑی آس لے کر آپ کے پاس آتی ہیں۔“

”مگر میں نے کہا جو کہ میں مجبور ہوں۔ میرا دل نہیں مانتا۔“  
”دنیا میں ایسے بے شمار واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کو اپنا دل

بہت بڑا رکھنا چاہیے۔“  
”بڑا ہی رکھا تھا۔ مگر۔ مگر۔“ ان کی آنکھیں چھلک پڑنے کو

تھیں۔

”بیٹی کا معاملہ ہے نا۔ چھوٹا ہو ہی گیا۔“

اور یہ کہتے کہتے لالہ کی ماں نے اپنی ٹانگوں پر سے کیبل ہٹا دیا۔

”تو۔ تو۔ کیا آپ ہی عائشہ ہیں۔“

دونوں بہنیں چھٹی چھٹی آنکھوں سے کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی لالہ کی

ماں کی مصنوعی ٹانگوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”لیکن۔ لیکن۔“ رقیہ خانم ہلکاتے ہوئے بولیں۔ ”لالہ نے تو

ہمیں اس حادثے کے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا۔“

”میں نے خود منع کر رکھا تھا۔“ عائشہ دوبارہ اپنی ٹانگوں پر کیبل پھیلاتے  
ہوئے بولیں۔

لالہ کی ماں نے خاموش ہو کر صفوفے کی پشت کے ساتھ ٹیک لگالی۔

”اٹ تو بہ! ایسے بھی واقعات دنیا میں ہوتے ہیں اور ایسے بھی دُکھ انسانوں

کو ملتے ہیں۔“ عاطف کی اُمی بچھے بچھے سے لہجے میں بولیں۔

”اور اب اس مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں کسی بیرون ملک جانے

والے لڑکے کے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ کبھی بھی نہیں کروانگی۔“

پھر لالہ کی ماں نے موضوع بدلنے کی خاطر رقیہ خانم اور رفوخالہ کو چائے

کی طرف متوجہ کر دیا۔

”آپ نے چائے تو اور لی ہی نہیں۔ نہ ہی کچھ کھایا ہے۔“

”بس اچی ہی نہیں چاہتا۔ دراصل آپ نے اتنا دُور دھرا قصہ سنایا اور

ایسے پر اثر انداز نہیں کہ مجی میلا میلا سا ہو کر رہ گیا ہے۔“

لالہ کی ماں چپ چاپ کھوئی کھوئی سی انھیں دیکھتی رہیں۔ عجب انداز

ہیں۔! پھر قدرے توقف بعد بولیں۔

”جہاں نہ آٹھ سال کی رفاقت کا خیال کیا گیا۔ نہ ایک مجبوری کے لیے

جاں دے دینے والی محبت پاؤں کی نہنجیر بنی۔ نہ ایک اپاہج کے مستقبل کا

سہارا بننے کے لیے انسانی ہمدردی نے سہرا بھارا اور نہ اپنی اولاد، اپنے خون

کی محبت سینے میں تڑپتی اور چمکی۔ وہاں میری بیٹی کی ایک ڈیڑھ ماہ کی میل

ملاقات اور چند دن کی بیوی کی رفاقت کیا کرے گی۔“ اسے تو جھٹک

ہاں ہاں — کہتے —

لالہ کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر میرے بیٹے کا یہ زندگی موت کا

عائنہ کے حلق سے ایک بھیا نک پتھیرہ ابل پڑا —

اب مجھے کسی مرد کے اس دعوے پر اعتبار نہیں رہا —

اوہ امیر اسچہ — ایا

فکر نہ کیجئے انگلیڈ جاتے ہی سب ٹھیک ہو جاتے گا — عائنہ پھر

نے طنز سے ہنسیں —

چند ماہ میں ہی نہ صرف یہاں کی ہر بات بھول جاتے گا بلکہ ایک نئی بصیرت

مارٹ اور فارمر ہو ہی بھی حاصل کرے گا — آپ بالکل کوئی فکر نہ کیجئے —

کل کوئی فکر نہ کیجئے —

بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے ہدایاتی کیفیت طاری تھی — ساتھ ساتھ

ستی بھی جا رہی تھیں پھر ہنسنے ہنسنے آنکھوں میں نمی سی آگئی — ایک دم

اموش ہو گئیں — اور چونک کر رفیقہ خانم اور رفوخالہ کی جانب دیکھنے لگیں

آنکھوں سے بے انتہا درد و کرب مترشح تھا —

”آپ کی بے حد مہربانی ہوگی اگر آپ آئندہ اس مقصد کے لیے یہاں

شریف نہ لائیں — اپنا بھی کا احساس جو بڑی مشکل سے تھپک تھپک کر سلاتی

ہوتی ہوں — جاگ اٹھتا ہے — میرے زخم تازہ ہو جاتے ہیں — میرے سینے

کے ماسور ٹیسس مارنے لگ جاتے ہیں — میرا ماضی سانپ بچھو بن کر مجھے

زسنے لگ جاتا ہے — اور پھر میرا وجود دیرہ دیرہ ہو کر بکھر جاتا ہے — میں

”اس لیے کہ باپ بغیر موجود اور ماں عبور — یہ جان کر کوئی اسے کمتر نہ  
گردانے، بے سہارا نہ سمجھے — زمانہ دل کے اندر چھپے زخموں کو نہیں دیکھتا۔  
ظاہر عجیب حسانی ہو یا اخلاقی — یہ دنیا والے ضرور باتیں بنائیں گے۔ ضرور  
ہنسیں گے اس پر — اور میں نہیں چاہتی تھی کہ والدین کی محرومیوں یا ناپاکیوں  
کی وجہ سے لوگ میری بیٹی کو بے عزت یا گری پڑی جانیں — اس پر انگلیاں  
اٹھائیں — اور پھر میری بیٹی ان کمتری کے احساسات کے بوجھ تلے پس کر  
رہ جاتے —

پھر عائنہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں —

”آپ اپنے بیٹے کا کہیں اور رشتہ کر لیں — میں — جو ساری عمر سینے

میں زخم لیے ورنہ سے کراہتی رہی — میں نہیں چاہتی کہ میری لالہ کی قسمت

بھی ایسی ہی ہو —

”آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ ہر بیرون ملک جانے والا شخص ضروری

نہیں عثمان جلیسا ہی ہو —

”انسان اپنی مثال ہی سامنے رکھ کر کوئی اگلا قدم اٹھاتا ہے — اور مجھ میں

اس تلخ تجربے کے بعد اپنی بیٹی کو زندگی بھر کے لیے ویسے ہی جہنمی شعلوں میں

جھونکنے کی ہمت نہیں — اپنا غم تو میں نے سہہ لیا مگر اس کا دکھ — یہ مجھ سے

برداشت نہ ہوگا — اس کی میں متحمل نہ ہو سکتی تھی —

”تو یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے —“ رفوخالہ نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔

”جی ہاں —

”مگر —“ عاطف کی امی کچھ کہتے کہتے رک سی گئیں —

اسے سمیٹ نہیں سکتی۔ میرے زحموں کے لیے میرے پاس کوئی مرہم نہیں ہے۔ اپنی اپا بھئی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ آپ۔ آپ۔ آپ جلی جاتیے۔“

صوفے کے بازو پر سر رکھ کر وہ سسک پڑیں۔

رقیہ خاتم اور رفو خالہ بڑی ہمدردی اور دُکھ سے عائشہ کو دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوتیں۔

”مجھے بڑا افسوس ہے کہ میرے در سے آپ نامراد لوٹ رہی ہیں۔“ عائشہ نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھا کر بڑی بیجاہ گی سے انھیں دیکھا۔  
”مگر میں مجبور ہوں۔ بڑی سخت مجبور۔ مجھے معاف کر دیجئے گا۔“ وہ دونوں کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ رنج و غم سے بھرا دل اور بھیگی بھیگی آنکھیں لیے چپ چاپ لوٹ گئیں۔

سہرے والیاں جوانیاں۔

”تالیوں کی مال کے ساتھ ساتھ بڑے زور شور سے سہرا گایا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ پاؤں کی دھپ دھپ کی آواز بھی مٹی۔ جیسے رقص بھی ہو رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد ہنسی قہقہوں کی آواز بھی ابھراٹھتی۔

دونوں نے ایک دوسرے کی جانب انتہائی پریشانی سے دیکھا۔

”انہیں پورا یقین تھا کہ آج ہم بات پہنچی کر کے ہی لوٹیں گی۔“ رفو خالہ

دھیرے سے بولیں۔

”میرا تو اندر جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ بچوں کی خوشی کو کیسے پاؤں لڑوں۔؟“ رقیہ خاتم پرس کھولتے ہوئے بہت دُکھی لہجے میں کہنے لگیں۔

”بہر حال ٹیکسی میں ہی تو نہیں بیٹھے رہنا۔“ خالہ اپنی سمت والا دروازہ

کھول کر باہر نکلیں۔  
”چھپے چھپے وہ بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتیں چل پڑیں۔ گاڑی کا دروازہ بند ہوا تو اس کی آواز بڑی بلند مٹی۔ اندر یکدم خاموشی چھا گئی۔ لمحہ بھر کے لیے اور پھر شور مچاتے ہوئے سب باہر بھاگ آئے۔

امی اور خالہ برآمدے میں ہی پہنچی تھیں کہ جتنے کے جتنے نے انھیں گھیر لیا۔ سب سے آگے سیں اور نازی تھیں۔ نہ سر پر دوپٹے نہ پاؤں میں جوتے۔ پھر ندیم، اظفر، صاعقہ اور جبین۔

ان سے نگاہ چسپاتی ہوتی سامنے والے کمرے کے دروازے پر جاٹھی۔ عاطف تیلون کی جیسوں میں ہاتھ ڈالے، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے، دروازے کے ساتھ ٹیک لگاتے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کتنی خوبصورت مٹی اس کی مسکراہٹ۔ با رقیہ خاتم تو وہیں دل ختام کر رہ گئیں۔ کہنی سے بہن کو ٹھوکا دیا کہ ایکدم ہی کچھ نہ بول پڑے۔

”یہ آپ دونوں خالی ہاتھ ہی چلی آ رہی ہیں۔ کہا بھی تھا کہ مٹھائی لے کر آئیے گا۔“ بیسں اور نازی ان کے راستے میں کھڑی ہو گئیں۔ صاعقہ، ندیم، اظفر اور جبین نے بھی قریب آ کر انھیں گھیر لیا۔

”کونسی تاریخ مقرر ہوتی خالہ امی۔؟“ نازی نے پوچھا۔

”بھئی سانس تو لینے دو۔ پھر بتاتے ہیں سب کچھ۔“ رفو خالہ بڑی

”کیوں؟“ اب اس کا نام بدل گیا ہے کیا؟“

” ————— ”

”اب کیا ہو گیا ہے۔“ عاتق نے

”اب سپہر، مانڈھ کی مٹھی کھینچ لیتے۔ یا امی! آپ کی مہر کی یہ بات یا

”نہیں، تمہارے لیے اس کے قریب

پھر یہی کہ ہم نے اس کے لئے کیا کیا ہے۔

ہیں۔ کے کے کے۔ ان کی آواز

ندیم — اے بیہ حاکم کی ادار میں اس

خاموش ہو گئے۔

” چلو آرام سے بیٹھو سب “

”آپ تو امی! ابھی سے لالہ بھامبھی کی

مذہب سہ کو کھیلواتے ہوتے وہیپ کہہ

” اے خوشی کے مواقع روز روز تو“

”ختم شد۔ تکتہ ہونے کا واسطہ ہو نہ“

۱۰۰

یادرو۔ جو کہ میں ان کے پاس پہنچا

سب ہم کو پورے پورے ہوتا

”امی۔ اے یہیں بروہی پیر۔“

ہوے ان کے قریب اسی

نے تو ایسی کوئی بات نہیں لی۔

”اوہ۔۔۔!“ امی کچھ شرمندہ سی ہو

بولیں۔ ”انسان پریشان ہو تو یونہی پلاسوچے سمجھے جانے کیا کیا کچھ کہہ بیٹھا ہے۔“

”پریشان۔ ایکسی پریشانی۔“ نازی، صاعقہ اور جین ان کے صوفے کے پیچ سامنے قالین پر آ بیٹھیں۔

”امی! آپ ہی کچھ بتائیے کہ بات کیا ہے۔“ نازی نے اپنی ماں کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”بیٹی! انھیں یہ رشتہ منظور نہیں۔“

”یہ رشتہ۔“ جین عاطف کی جانب دیکھ کر بچ پڑی۔

”ہمارے عاطف بھائی کا۔“ پھر وہ لوگ اندھے ہونگے امی۔

بدقسمت ہیں وہ۔ ان سے بہتر رشتہ اور انھیں کہاں ملے گا۔“

”کمال ہے۔“ اظفر غصے سے بولا۔ ”لالہ کی امی کو میں اتنا بیوقوف

نہیں سمجھتا تھا۔ میرا خیال ہے اس عورت کا وماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”چپ کرو اظفر۔! اسے کچھ نہ کہو۔“ رقیہ خانم بڑے ڈکھ سے بولیں

”کیسے نہ کہوں۔ میرے بھائی کے ادنانوں کو اس کے آگ لگا دی اور

میں خاموش رہوں۔ میرے بھائی کی خوشیوں کو اس نے روند ڈالا میں آرام

سے بیٹھا دیکھتا رہوں۔“

اس کی نگاہ عاطف پر پڑی تھی۔ ابھی جس چہرے پر مسکراہٹوں کی شفق

پھول رہی تھی۔ اب زرد تھا۔ ماں کی بات سنتے ہی کس بلے بسی سے

وہ سب کو دیکھتے ہوئے چپ چاپ قریبی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

کانپتے ہاتھ میں پکڑا سگریٹ لہڑ رہا تھا۔ اس جیلے کا، جو توپوں

کی گرج، گولیوں کی دھمک اور تلواروں کی چھاؤں میں بھی کبھی لہڑا نہیں تھا۔

اس دل کے معاملے نے اسے اتنا بے دل کر دیا تھا کہ سر ہی جھک گیا۔

”سنو اظفر! یوں جوش میں نہیں آجا یا کرتے۔ ہر انسان کی کوئی نہ کوئی

مجبوری ہوتی ہے۔“

”آخر ایسی کونسی مجبوری آن پڑی انھیں۔“

”انسان کا اپنا دل و وماغ ہی سب سے بڑی مجبوری ہوتا ہے۔ اور ہر

انسان اپنے وماغ سے سوچتا ہے اور اپنے جذبات کو پیش نظر رکھ کر سب

فیصلے کرتا ہے۔“

”لیکن انھیں ہمارا بھی کچھ خیال کرنا چاہیے تھا کہ ہم سب کن حسرتوں اور

ارمانوں سے یہ رشتہ لینے چلے تھے۔“

”اس بیچارے مجبور محرومت کا کسی نے خیال نہ کیا تو آج وہ ہمارا خیال کیوں

کرے۔ اس کو بھی تو اپنے دل و وماغ پر کوئی حق ہے۔“

”واہ خالہ امی! آپ بھی عجیب ہیں۔“ نازی بولی۔

”انہوں نے ہی ہمیں پال دیا اور آپ طرفدار ہی بھی انھیں کی کیسے جا

رہی ہیں۔ آپ کو تو ہم سے، اپنے آپ سے اور بھائی جان سے ہمدردی ہونا

چاہیے تھی۔ یہاں تو الٹی بات ہو گئی۔“

”میرا خیال ہے ہم سب وہاں جاتے ہیں۔ امی اور خالہ امی نے تو ایک

سے دوسری بات نہیں کی ہوگی۔ ہم انھیں کونفس کریں گے۔ وہ یقیناً مان جائیں

گی۔“ اظفر نے سیمیں، نازی وغیرہ کو اشارہ کیا۔

”نہیں۔“ امی بلند آواز میں سختی سے بولیں۔ ”اب ہمارے ہاں سے کوئی

انہیں تنگ کرنے نہیں جاتے گا۔

”واہ! ہم کوئی تنگ کرتے ہیں انہیں۔ بلکہ ان کی لڑکی کے لیے اتنا اچھا رشتہ پیش کر رہے ہیں۔“ صافحہ اپنی بساط مطابق بڑبڑاتی۔

”انہیں تو ہمارا احسان مند ہونا چاہیے۔“

بتائیے نامی! آخر بات کیا ہے۔؟“ سیہیں منت سے بولی۔

”کیوں آپ نے یوں ہتھیار ڈال دیئے۔؟“

”اس لیے ٹیٹی! کہ کل تک مجھے اپنے عاطف پر اور اس کی محبت پر اور وفا پر بڑا اعتماد تھا۔ بڑا مجھ پر دھڑکاؤ تھا۔ مگر مروت کی وفات کے لیے اب میرے پاس وہ یقین نہیں رہا جس کے بل پر میں انہیں مجبور کروں۔“ وہ سوچوں میں کھوئی کھوئی بڑبڑاتی۔

”کیا کہہ سکتی ہوں کہ کل عاطف بھی وہی کہ بیٹھے جو عثمان نے کیا۔ نہیں نہیں۔ میں مروت کی وفا جیسے کچے دھاگے پر لالہ کی زندگی کی یہ گرہ لگانے کو انہیں مجبور نہیں کروں گی۔“

”خالہ! آپ ہی کچھ بتائیے کہ بات کیا ہوئی۔ امی تو پیلیاں بوجھوا رہی ہیں۔“

دو خالہ انہیں عائشہ کی داستان سنانے لگیں۔ سب ہی آہستہ آہستہ کھسک کھسک کر ان کے قریب آتے گئے۔ عاطف کی نگاہ کھڑکی کے باہر دو درختوں میں کہیں گم تھی مگر کان دو خالہ کی طرف متوجہ تھے۔

عائشہ کی کہانی ختم ہوئی تو رقیہ خاں نے سب بچوں کی طرف دیکھا۔ سب کے سب سر جھکاتے خاموش بیٹھے تھے۔ صافحہ دل کی اتنی نرم تھی کہ عائشہ کی

دونوں ہانگوں، اور اس کی بدستہ جبری تنہا زندگی کا خیال کر کے ہچکیاں لے لے روئے جا رہی تھی۔

عاطف چپ چاپ اٹھا۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”عاطف۔! ماں نے چیخے سے پکارا۔“

”کہاں جا رہے ہو۔؟“ ماں پریشان ہو گئی۔ جانتی تھیں وہ نادان زندگی موت کا سوال بنا بیٹھا تھا۔ کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھالے۔! ”کہیں بھی نہیں۔“ برآمدے سے اس کی آواز آئی۔

”سیہیں! وہ باہر جا رہا ہے۔ جاؤ اسے بلالو۔“

”سیہیں سچے بھالگی۔“ بھیا! رُک جاتیے۔ سینے تو۔“

”بات کیا ہے۔؟ چلا کیوں رہی ہو۔؟“ عاطف گردن موڑ کر بڑی گھمبیر آواز میں بولا۔

”میں فرار پرنسپل صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔“

”وہاں کیا کرنے۔؟“

”پہلے کیا کرنے جایا کرتا تھا۔؟“ عاطف تکیے انداز میں بولا۔

”وہ۔ امی پریشان ہو گئی تھیں۔“

”سیہیں گم بڑا گئی۔“

”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ عاطف کو اپنے بچے کا شاید احساس ہو گیا تھا۔ اب نرمی سے بولا۔

”ابھی ایک آدھ گھنٹے تک یہاں آ جاؤ لگا۔ بہت دن ہوئے ان سے



ایف۔ اے کے عاطف پی۔ ایم۔ اے میں چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ہی ان کا تقرر اس کالج میں ہوا تھا۔

نذیم کو کالج داخل کرانے کے سلسلے میں پہلی بار اس کی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور پہلی ہی ملاقات میں وہ ان کی شخصیت سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ جب بھی چھٹی پر آتا ان سے ضرور ملتا۔

اور پھر۔ چار چھ ملاقاتوں کے بعد جانے کیا ہوا۔ اس بوڑھے اور اس جوان کی دوستی ہو گئی۔ عجیب قسم کی دوستی تھی۔ جب بھی گھر آتا۔ خواہ دو دن کے لیے ہی۔ انھیں ملے بغیر چین ہی نہ پڑتا۔ زیادہ دن رہنا تو تقریباً ہر شام انھیں کے پاس گزرتی۔

ڈیوٹی پر چلا جاتا تو گھر والوں سے زیادہ باقاعدگی کے ساتھ ان سے خط و کتابت ہوتا۔ ”صاب۔“ ملازم کی آواز نے عاطف کو چونکا دیا۔

”آپ ادھر ہی آجائیے۔“

”کہاں۔۔۔؟“

”ان کی خواب گاہ میں۔“

”ان کی خواب گاہ میں۔؟“ عاطف نے حیرت سے پوچھا۔

”آج تک کبھی بھی تو وہ ان کی خواب گاہ میں نہیں گیا تھا۔ سینکڑوں بار وہ یہاں آیا تھا۔ پرنسپل صاحب بیمار ہوں۔ آرام کر رہے ہوں۔ کچھ بھی ہو۔ وہ اسے وہاں کبھی نہیں بلاتے تھے۔ ہمارے باہر لان میں اور یا اسی کمرے میں ملا کرتے تھے۔“

”بخار کی وجہ سے کمزور ہو رہے ہیں۔ یہاں آنے میں انھیں تکلیف ہوگی۔“

”انھیں میرے آنے کی اطلاع کی۔؟“

”نہیں۔۔۔“

”سو رہے ہیں کیا۔۔۔؟“

”جاگ رہے ہیں۔۔۔“

”پھر بتا یا کیوں نہیں۔۔۔؟“

”خواہ عذاہ اٹھ کر ادھر آنے کی کوشش کریں گے اور ڈاکٹر نے ایک قدم بھی چلنے کو منع کیا ہوا ہے۔“

عاطف نے تائیدی نگاہ سے اسے دیکھا۔ کتنا خیر خواہ تھا وہ اپنے مالک کا۔ عاطف پر وہ ہٹا کر ان کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

”کون۔۔۔؟“ پرنسپل صاحب کی آواز میں کچھ گھبراہٹ تھی۔

”میں ہوں عاطف۔ سلام عرض کرتا ہوں۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ رہے تھے۔ عاطف نے جلدی سے انھیں شانوں سے پکڑ کر پھر ٹا دیا۔

”آپ لیٹے رہیے۔ اٹھنے کی تکلیف نہ کیجیے۔“

”وہ۔ وہ۔ میں نے سوچا تھا ادھر گول کمرے میں چلتے ہیں۔“

وہ گھبرا گھبرا کر کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

”کوئی تکلف تو ہے نہیں۔“ عاطف نے ان کی مسہری کے قریب کرسی کھینچ لی۔

”لیکن۔ لیکن۔ یہاں بیٹھنے سے تمہیں بے آرامی ہوگی بیٹے۔!“

”میری بے آرامی کا خیال نہ کیجئے۔ آرام کی مجھ سے زیادہ آپ کو ضرورت





کچھ بھی نہیں چھپایا۔ پرنسپل صاحب دم بخود بیٹھے تھے۔ ہوں ہاں تک نہیں کر رہے تھے۔

عاطف نے لالہ کی ماں والا سارا قصہ بھی سنا ڈالا۔ کہ کیوں وہ اپنی بیٹی کا رشتہ اس کے ساتھ کرنے کو تیار نہیں تھی۔

ادھر معاملہ ایسا تھا۔ اس کے مستقبل کا۔ باہر جانے سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی ترقیوں کا انحصار اسی کو رہتا تھا۔ ادھر اس کی ماں کے تلخ تجربات۔ قصور وار وہ بھی نہیں تھی۔

مگر۔ زندگی ان دونوں کی تباہ ہوتی جا رہی تھی۔ ویران اور ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ عاطف کو غصہ آگیا۔ عاتشہ پر بھی نہیں۔ وہ بیچارہ تو خود ہاتھوں آتی ہوئی ہستی تھی۔ ان حالات پر، جو اس پر بیت گئے تھے اور اس انسان پر، جس کے ہاتھوں اسے یہ دکھ ملے تھے اور جو ایسی مثال پیش کر کے دوسروں کی راہوں میں کانٹے بکھیر گیا تھا۔ تمام دنیا کے مردوں پر سے اعتماد اٹھالے گیا تھا۔ کتنا ظالم تھا وہ۔! کتنا بے درد تھا۔!!

اور کچھ نہ سہی کاش! وہ اتنا ہی سوچ لیتا کہ اس کی اولاد باپ کی محبت نہ ملنے کی وجہ سے مگر ایسی کی طرف بھی جاسکتی تھی۔ اگر اسے کوئی غلط قسم کا انسان مل جاتا تو محبتیں تلاش کرتے کرتے وہ تباہیوں کے گڑھوں میں بھی گر سکتی تھی۔

”وہ تو پرنسپل صاحب! عاطف بے حد سنجیدہ تھا۔“  
”یہ اس کی راہ میں آگیا۔ میں، جو بہنوں والا ہوں اور مجھے پورا احساس ہے کہ ایک عورت کی عزت و عصمت کی حفاظت کرنا قوم کے ہر فرد کا

ہے۔ اور اگر میری بجائے کوئی اور غلط قسم کا شخص اس کے حضور اپنی نیت پیش کرتا تو وہ اس کی طرف بھی اسی طرح لپکتی۔ اس لیے کہ وہ بچپن سے مخالف جنس کی محبت سے محروم ہی تھی۔ باپ اور بھائی کی محبت سے۔

ہائے! لا شعوری طور پر ان محبتوں کو تلاش کرنا تھا۔ اور پھر۔۔۔ وہ ہی کے گڑھوں میں گر سکتی تھی۔“

پرنسپل صاحب سر جھکاتے چپ چاپ بیٹھے تھے اور عاطف دکھی سا بہرہ لے جا رہا تھا۔  
پچھلے باپ نے اس کا خیال نہ کیا اور اب اس پر ظلم کر رہی ہے۔ اپنے بچپن کے تحت وہ صحیح قدم اٹھا رہی ہے مگر یہ نہیں جانتی کہ اس کا یہ بالی بہتری کے لیے اٹھایا گیا قدم اور بھی مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ہمارے اساتذوں پر چل پڑے گی پرنسپل صاحب! اور مجھے اپنے دل کی ویرانی کے ساتھ اس معصوم کی تباہیوں کا خیال بھی آ رہا ہے۔ سوچتا ہوں کیا کروں۔  
”اروں۔؟ آپ ہی کچھ بتائیے۔ مجھے یہ دھارا سستہ دکھائیے۔“

عاطف نے پرنسپل صاحب کی جانب بغور دیکھا۔ جانے یہ واقعہ ہی کچھ بتا دیا اتنی دیر بیٹھے رہنے کی وجہ سے ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے اور ہاتھ یوں لرز رہے تھے جیسے رشتہ کوئی مریض ہو۔

”کیا ہوا۔؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟“ عاطف گھبرا گیا۔  
”ہاں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے جلدی لے لے کر بچش لہجے میں بولے۔ ”تم فکر نہ کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔“

سب کچھ —  
”کیسے؟“

”میں اس لڑکی کی ماں سے ملونگا۔“

”آپ —؟“ عاطف ششدر سا رہ گیا۔ ”کیا آپ اسے جانتے ہیں؟“  
عاطف نے سادگی سے یہ سوال کیا تھا مگر وہ بری طرح گھبرا گئے۔

”ہیں — ہیں — نہیں نہیں —“ پھر جلدی سے آنکھیں جھکاتے  
ہوئے بولے۔

”تم مجھے بہت عزیز ہو بیٹے۔ اودھ شاید تمہارے ہی توسط سے۔ مجھے  
اس لڑکی سے بھی انس سا ہو گیا ہے۔ میں اس کی ماں کو سب کچھ سمجھانے کی کوشش  
کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے سمجھانے سے اسے سمجھ آ جائے گی۔“

”سچ —“ عاطف نے بڑی عقیدت سے ان کی طرف دیکھا۔ واقعی  
ان کا وجود بڑی رحمتوں اور برکتوں والا تھا۔ وہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایک  
ایسا چشمہ تھے کہ ان کے پاس آکر کوئی پیاسا نہیں لوٹتا تھا۔

عاطف کی پریشانیوں جیسے ایک دم ہی آدھی ہو گئیں۔ پھر پرنسپل صاحب نے  
بھی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ اودھ اودھ کی باتیں ہونے لگیں۔ ملازم چائے  
بنا کر لے آیا۔ پرنسپل صاحب کو باتیں کرتے دیکھا تو خوش ہو کر بولا۔

”صاحب! میں نہ کہتا تھا کہ آپ کے آنے سے میرے بانک کا دل بہل  
جائے گا۔ آپ روز آجایا کیجئے گا۔“

عاطف اور پرنسپل صاحب ہنسنے لگے۔

پھر بہت دیر عاطف ان کے پاس بیٹھا رہا۔ گھر سے بڑا پریشان آیا تھا مگر

یہاں آکر عجیب قسم کا سکون و اطمینان نصیب ہوا تھا۔ دل ہی دل میں پرنسپل  
صاحب کی درازنی عمر کی دعائیں مانگتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

سلام وغیرہ کر کے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ  
ماننے دیوار پر نگاہ جا پڑی۔ ایک دم چونکا۔ گھبرا کر دوسری اور پھر تیسری  
دیوار کو دیکھا۔

ایک عورت اور ایک ڈیڑھ دو سالہ بچی کی بے شمار تصویریں ہر طرف  
دیزائل تھیں۔ کسی تصویر میں دونوں اکٹھی تھیں۔ کوئی علیحدہ علیحدہ۔

پرنسپل صاحب نے توساری زندگی محروم کر گزار دی تھی۔ مگر — مگر —  
غیر ارادی طور پر عاطف کے قدم اٹھ گئے۔ قریب جا کر بڑے غور اور  
پہی سے دیکھنے لگا۔ چھوٹی سی گول مٹول سی بچی پیاری تھی اور وہ عورت  
عجب قسم کا وقار اور کشش سی اس کے چہرے پر تھی۔ عاطف بڑی دیر  
بٹھا رہا۔ نگاہ بٹانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

پرنسپل صاحب! یہ عورت اور یہ بچی آپ کی کون ہیں —؟ آپ نے  
ہی بھی ان کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

عاطف کی نگاہ تصویروں پر ہی تھی۔ بات کا کوئی جواب نہ ملا تو مڑ کر انھیں  
دیکھا۔ وہ نیکی سے ٹیک لگاتے، آنکھیں بند کیے چپ چاپ بیٹھے تھے۔

دیر اسے انھیں بے آرام نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ عاطف کو کچھ احساس ہوا۔

”اچھا — آپ آرام کیجئے۔ میں کل شام کو پھر حاضر ہوں گا۔“

اور ایک بار پھر ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔

لئے عجیب ہوتے ہیں۔ اپنی جاں پر دکھوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بڑی  
مت اور حوصلہ سے سب کا مقابلہ کیا۔ مگر یہ اولاد کی تکلیفیں!۔

وہ یوں چپ چاپ سی کالج چلی گئی تھی۔ پریشان سی۔ اور مال اتنے  
سے ہی دکھی ہو رہی تھی۔ اس کے دل کو تکلیف پہنچی تھی اور مال کو یوں محسوس  
ہو رہا تھا جیسے خود اس کے اپنے سینے میں ٹیسس سی اٹھ رہی تھیں۔

انھیں الجھی الجھی سوچوں میں کھوئی تھیں کہ میرونی دروازے پر دستک  
ہوتی۔ ذرا سی آواز آئی تھی مگر دھیان نہیں دیا۔ ملازمہ گھر میں موجود تھی۔

سوچا۔ خود ہی جا کر معلوم کر لے گی۔ دوسرے ہی لمحے ذہن بھرا دھڑکیا۔ الجھ گیا۔  
مگر۔ چند لمحوں بعد ہی بھاری بھاری قدموں کی آہٹ نے چونکادیا۔

جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ ملازمہ کے پیچھے کوئی اور بھی کھڑا تھا۔

”بی بی! یہ صاحب آپ سے ملنے آتے ہیں۔ کہتے تھے بہت ضروری

کام ہے۔۔۔“

ملازمہ جانے اور کیا کیا کہہ کرے سے باہر نکل گئی۔ عائشہ کو کچھ سنائی  
نہ دیا۔ کان شائیں شائیں کر رہے تھے اور آنکھیں جھپک جھپک کر آنے والے  
لو دیکھے جا رہی تھیں۔

ماضی کے دھندلے دھندلے، پھیلے پھیلے نقوش نے سمٹ سمٹ کر  
ایک ہوئی سا بنایا۔ اور پھر۔ اس نے عثمان کا روپ دھار لیا۔ اس  
عثمان کا، جس کی یادیں اب بھی اس کے لاشعور میں کہیں چھپی تھیں اور جو،  
جب بھی اس کے پاس آیا، اسے زخم ہی دے کر گیا۔

اور۔ یہ آج پھر آگیا تھا۔ جانے کونسا نیا شتر لے کر اور کونسا زخم

گھر میں بڑی خاموشی سی چھائی ہوئی تھی۔ جانے کیوں عائشہ کا جی بڑا  
اداس ہو رہا تھا۔ خود ہی عاطف کی مال اور خالہ کو اس رشتے سے جواب دیا  
تھا اور اب خود ہی پریشان ہو گئی تھیں۔

کل سے لالہ بڑی چپ چاپ سی تھی۔ کوئی بات نہیں کی۔ رات کو بھی  
جلد ہی سو گئی۔ صبح بہت دیر سے اٹھی۔ بہت ہو لے ہو لے کچھ سوچتے  
سوچتے تیار ہوئی اور پھر جھکے جھکے پھرے اور جھکی جھکی نگاہوں سے مال کو سلام  
کر کے کالج روانہ ہو گئی۔

عائشہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہیں۔ جانتی تھیں کہ اسے عاطف  
کے گھروالوں سے بہت پیار تھا اور اسی لیے یہ رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے  
خاموش سی تھی۔ مگر عائشہ کا خیال تھا کہ چند دن گزرنے پر خود بخود ہی اس  
کے ذہن سے یہ اثر زائل ہو جانا تھا۔ وقت ہر پریشانی کا بہترین دوا ہے۔  
لالہ نے بھی خود ہی راہ پر آ جانا تھا۔ چنانچہ اسے کچھ نہیں کہا۔

لیکن۔ اس کی مال تو تھیں۔ بیٹی کی یہ اداسی دل کے اندر کہیں  
اتر ہی جا رہی تھی۔ کوئی بھی کام کرنے کو جی نہیں چاہا۔ ملازمہ نے چیزیں لا کر  
رکھیں مگر عائشہ نے سب اٹھوا دیں۔ جب ذہن اس طرف نہیں تھا تو پھر کام  
بھی تو غلط سلط ہی ہونا تھا۔

اپنے ہی خیالوں میں کھوئیں خاموشی سے بیٹھی رہیں۔ یہ اولاد کے معاملے!

دینے کے لیے۔

”کیا آج مجھے بیٹھنے کے لیے بھی نہ کہو گی۔“ وہ کھڑا کھڑا کھڑا۔

عائشہ نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔ اتنی بھی زیادہ عمر نہیں ہو گی تھی کہ بڑھاپے کی وجہ سے لڑکھڑانے لگ جاتا۔ چہرہ کیا وجہ تھی۔ کیوں اٹنا کمزور ہو رہا تھا۔ کہیں بیمار تو نہیں رہا تھا۔

دل کے کسی اندرونی گوشے سے ہمدردی کا جذبہ ابھرا۔ غیر ارادی طور پر ہاتھ سامنے والی کرسی کی طرف اٹھ گیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“

وہ دیکھتا ہوا بیٹھ گیا۔ عائشہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”یہ تم سے ایک بہت ضروری بات کہنے آیا ہوں۔“

جانے کیوں دل دھک کر رہ گیا۔ چھٹی جس بیدار ہوئی۔ پیش بندی کے طور پر جلدی سے بولیں۔

”میرے اور تمہارے درمیان ایسا کوئی معاملہ نہیں کہ تمہیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی ضرورت پیش آئے۔“

”یہ تم بھول رہی ہو عائشہ! تمہارے اور میرے درمیان ایسا کوئی معاملہ نہیں۔ میں لالہ کے متعلق تمہیں کچھ کہنے آیا ہوں۔“

”لالہ۔“ عائشہ نے چونکتے ہوئے چھٹی چھٹی آنکھوں سے عثمان کو دیکھا۔

اپنی بچی کا یہ نام تو اس نے عثمان کے بعد رکھا تھا۔

”مگر۔۔۔ یہ اسے کیسے معلوم ہو گیا۔“

”تم۔۔۔ تم اس کا نام کیسے جانتے ہو۔“

”وہ میری اولاد ہے۔ میں کیسے نہیں اسے جانوں گا۔“ عثمان مسکرایا۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ عائشہ کا نہ صرف پورا وجود لرز رہا تھا بلکہ ان کی زبان تک لڑکھڑاتی جا رہی تھی۔ ”تم کہاں سے آئے ہو۔ کہاں رہتے ہو۔“

”اسی شہر میں۔“

”اوہ۔۔۔“ عائشہ نے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔ ”تو وہ تم سے ملتی رہتی ہے۔“

”ہے۔“

”نہیں۔۔۔ میں نے تو اسے آج تک دیکھا بھی نہیں۔“

عائشہ نے جلدی سے آنکھیں کھولیں۔ ”تو پھر تم اسے کیسے جانتے ہو۔“

”یہ منت پوچھو۔ بس اس وقت میں تم سے صرف اتنا کہنے آیا ہوں کہ عاطف سے اس کی شادی کر دو۔ وہ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ ایسا رشتہ پھر تمہیں نہیں ملیگا۔“

”تمہیں کیا۔۔۔ ہٹے نہ ملے۔ یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔“

”کیوں اس معصوم کی زندگی تباہ کر رہی ہو۔ اسے اس لڑکے سے محبت ہے اور وہ اکثر اس سے ملتی رہتی ہے۔“

”یہ محبت و محبت کی باتیں میں نہیں جانتی۔ عورت کو پھانسنے کے لیے مرد ہمیشہ ہی جال بھینکتا ہے۔ ویسے اس کے دل میں ہوتا کچھ نہیں۔ محبت، پیار۔۔۔ سب۔۔۔ ڈھونگ، فریب۔۔۔!“

”چلو مانا یہ سچ ہے۔ مگر عورت تو سنجیدہ ہوتی ہے۔ اور لالہ بھی اس معاملے میں سنجیدہ ہے۔“

”اور وہ مرد بے شک اسے ایک ذمہ داری سونپ کر خود چٹی چڑی والیوں کو سینے سے لگا تا پھرے۔ نہیں۔“ عائشہ چیخ سی پڑی۔

” یہ دُکھ وہ سہلے گی۔ مگر وہ — مجھے دیکھو — آج تک زخم اسی طرح ہرے ہیں۔ اسی طرح رس رہے ہیں — لالہ سامنے آجاتی ہے تو تمہاری صورت دکھائی دے جاتی ہے اور تمہاری صورت لگا ہوں میں آتی ہے تو تمہاری بے وفائیاں یاد آجاتی ہیں اور پھر تمہارے دیئے گئے زخموں میں مرچیں سی بھر جاتی ہیں — یہ عمر بھر کا روگ —“ عائشہ کراہ اٹھیں۔

” میں اسے نہیں لگنے دوں گی۔ اور یہ محبت کا غم تو وہ بہت جلد محسوس ہو جائیگا۔ جب اس کا خاندان اس کے پاس ہوگا۔ اس سے محبت کرے گا۔ اس کی گود میں غمی غمی کلیاں مسکرائیں گی۔ دونوں مل کر اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالیں گے۔ تب — تب میری بچی خوش رہے گی — بہت خوش —!“

” تم یہ کیوں یقین کیے بیٹی ہو کہ عاقل ایسا کرے گا —“  
عائشہ مسکراتے ہوئے بڑے طنز سے بولیں۔

” یہ تم کہہ رہے ہو — تم —؟“  
عثمان کی نگاہیں جھک گئیں اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے۔

” ضروری تو نہیں کہ وہ مجھ ایسا ہی ہو —“  
” ٹھیک ہے۔ ضروری نہیں — لیکن اس دل کا کیا کر دوں —؟“  
اب کسی مرد پر اعتبار نہیں رہا۔

پھر قدرے بیزاری سے بولیں۔  
” تم نے اپنی کہہ لی — میں نے تمہاری سن لی۔ اب تم جاسکتے ہو —“  
” تو تم یہ رشتہ نہیں کر دو گی —؟“  
” میں نے کہا جو کہ یہ خالص میرا اور میری بیٹی کا معاملہ ہے — تمہیں اس

میں دخل دینے کا نہ کوئی حق ہے نہ کوئی ضرورت —“ عائشہ کے لہجے میں بڑی سختی تھی۔

” یہ مت بھولو عائشہ! کہ وہ صرف تمہاری ہی بیٹی ہے۔ وہ میری بھی ہے۔ اور میرا حق اس پر تم سے زیادہ ہے —“ اب عثمان کو بھی طیش آگیا۔  
” میں جب چاہوں اسے اپنی تحویل میں لے سکتا ہوں۔ قانوناً، شرعاً۔ ہر طرح مجھے اس کا حق حاصل ہے۔ اگر تم یوں ضد کر دو گی تو میں قانون کے ذریعے اسے تم سے لے لوں گا۔“

عثمان اُٹھ کھڑا ہوا — عائشہ نے اس کی دھمکی سنی۔ جواب میں کچھ نہیں بولیں۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتا چلا گیا۔ تب بھی وہ خاموش ہی رہیں۔  
” بننے جلنے کی سکت نہیں تھی۔ نہ ہی زبان میں قوت گویائی — البتہ کانوں میں بار بار عثمان کے الفاظ گونج رہے تھے۔“

” میں جب چاہوں اسے اپنی تحویل میں لے سکتا ہوں — میں قانون کے ذریعے اسے تم سے لے لوں گا —“ میرا حق اس پر تم سے زیادہ ہے — میں اسے لوں گا — میں اسے لے لوں گا۔“

” اودہ! اذایا —!“ عائشہ نے چیخ کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔  
” یہ دن بھی آنا تھا — وہ، جسے اس نے اپنے خون سے سینپنا تھا۔ خود کو خزاؤں کے سپرد کر کے جسے اس نے بہاروں سے ہمکنار کیا تھا۔ اسی پر آج اس کا کوئی حق نہیں تھا۔“

عثمان، جو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس وقت، جب وہ بالکل چھوٹی سی تھی۔ جس وقت اسے اس کی ضرورت تھی — وہ اس سے منہ موڑ گیا تھا — اپنی

۴۳۸ ذمہ داری کو قبول کیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ قانوناً اور شرعاً ہر طرح اس سے اسے چھین لینے کا مجاز تھا۔

کوئی بھی قانونی نقطہ ایسا نہیں تھا جس سے وہ لالہ پر صرف اور صرف اپنا حق جتا سکتی۔

باوجود اس کے کہ وہ اپنا حق تھی۔۔۔ بے بس تھی مگر پھر بھی اس نے اپنی ہمت سے بڑھ کر محنتیں کر کر کے، رات دن مشقتیں کر کر کے اپنے خون جگر سے اس پورے کو پروان چڑھایا تھا مگر۔۔۔ مگر۔ یہ اس کا اپنا نہیں تھا۔

یہ کیسا قانون تھا۔۔۔ یہ کیسی بشرع تھی اور یہ کیسی دنیا تھی۔۔۔ جیسے سینے کے اندر سے کوئی اس کا گوشت نوج نوج کر چھین رہا تھا۔ تن بدن میں اک آگ سی لگی ہوئی تھی۔۔۔ شعلوں سے ساری ہستی دھک رہی تھی۔ کسی کل، کسی پہلو چین نہیں آ رہا تھا۔

جانے کتنا وقت بومہی بیت گیا۔ عائشہ کو کچھ ہوش نہ تھا۔۔۔ ملازمہ نے کھانا لانے کے لیے پوچھا مگر گچی ہی نہیں چاہا۔۔۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ لالہ کالج سے آگئی تھی یا ابھی نہیں۔

اس نئے زخم، ٹیسیں مارتی چوٹ ہی کو ہلکا رہیں۔ مگر۔۔۔ دھکن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔۔۔ لالہ بھی شاید ابھی تک کالج سے نہیں آئی تھی۔ اس کی کوئی آواز نہیں تھی۔ اندر باہر چلتے پھرتے قدموں کی مانوس سی آہٹ نہیں تھی۔ شام ہونے والی تھی۔۔۔ لالہ اندر آگئی۔ ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔

”کیا بات ہے امی۔۔۔ آپ نے کھانا نہیں کھایا۔۔۔ لیجئے چائے ہی پی لیجئے۔“

لالہ کی آواز سینے کے اندر کہیں اتر گئی تھی۔ پیالی پکڑنے کی بجائے اس کا ہاتھ خٹا اور بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگیں۔ سب نقوش عثمان کے ہی تھے۔۔۔ وہی رنگ۔۔۔ ویسی ہی آنکھیں چمکی سی۔ اسی طرح خم کھاتے ہونٹ۔۔۔ وہی دیکھنے اور باتیں کرنے کا انداز۔۔۔ سب کچھ ہی عثمان کا تھا۔۔۔

وہ خود تو اس وجود میں کہیں بھی نہیں تھیں۔ بہت ڈھونڈنے پر بھی جب وہ خود کو وہاں تلاش نہ کر پائیں تو۔۔۔ دل کو ٹھاتے ہوئے پچکے سے انھوں نے لالہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

یہ کیا تھا۔۔۔ یہ خدا کی کیسی خدائی تھی۔۔۔ ”کیا ہوا امی۔۔۔؟“ میز پر پیالی رکھتے ہوئے وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔

”آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں۔۔۔؟“ جانے اس کی اس لرزتی آواز میں کونسا جاو تھا۔۔۔ عائشہ یکدم ہوش میں آگئیں۔ نگاہ اٹھا کر بیٹی کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں سوچی سوچی اُدھر چہرہ اتر ا ہوا سا تھا۔

ماقتنا بیتاب ہو گئی۔ عثمان کی کوئی بھی بات ذہن میں نہ رہی۔۔۔ وہ اجنبیت ایکدم ہی رخصت ہو گئی۔ یہ تو اس کا اپنا خون، اپنا گوشت پوست تھا۔ اسے کچلنے کے سینے سے لگایا۔

”کیا بات ہے۔۔۔ یہ تمہاری آنکھیں کیوں سوچ رہی ہیں۔۔۔؟“ یہ تمہارا چہرہ کیوں اتر ا ہوا ہے۔۔۔؟“

لالہ نے کوئی جواب دینے کی بجائے رخ پر لی سمت موڑ لیا۔ مگر۔۔۔

کیا ہو گیا تھا — ؟

اور پھر آج — حالانکہ کل اس نے دل میں پکارا وہ کر لیا تھا کہ وہ اب کبھی عاطف سے نہیں ملے گی — اس لیے — کہ اس کی ماں کو یہ رشتہ منظور نہیں تھا — مگر — مگر —

چھٹی ہونے پر وہ کالج سے نکلی — عاطف کی گاڑی وہیں کھڑی تھی — واپس چلی گئی — پانچ دس منٹ بعد پھر چپکے سے پچانک میں سے جھانکا — وہ اب بھی کھڑی تھی — پھر واپس چلی گئی — تیسری اور پھر چوتھی بار بھی جب اس نے گاڑی وہیں کھڑی دیکھی تو وہ نہ سکی —

خود کو لاکھ روکنے کے باوجود رک ہی نہ سکی — نہ دل اختیار میں تھا نہ پاؤں — قدم اس طرف اٹھ ہی گئے —

عاطف بے حد پریشان تھا — بالکل خاموش — لالہ سے اس نے کوئی بات نہیں کی — گم سم سا اس کا ہاتھ ہاتھ میں لیے مسلتا رہا اور گاڑی اُٹھانے کی دستوں پر جھگٹا رہا — کبھی کبھی نگاہ بھر کر اس کے چہرے کو بھی دیکھ لیتا — لالہ نے نظر ملتی تو عجیب سی پیار کی اور بے بسی بھر آتے ہوئے ہونٹوں پر پھیل جاتا —

نہ اس نے اس کی ماں کے اس فیصلے کے خلاف اس سے کوئی بات کی نہ کوئی شکوہ کیا اور نہ ہی اپنے دل کی اپنی انگلیوں اور آرزوؤں کی تباہی اور بربادی کا حال کہا — ایک لفظ بھی تو منہ سے نہیں نکالا — مگر — اس کے یہ طور — ایہ انداز — !! اس کے دل کی کیفیت کے پورے پورے مظہر تھے —

لالہ خود پر قابو نہ رکھ سکی — اس کی آنکھیں جھلک پڑیں — پھر وہ سسکیاں بھرنے

لے رہی تھی — لالہ کا ہاتھ — اس کے ہاتھ میں بایا کروہ بہت کچھ تھا — گئیں — عثمان نے بتایا تھا کہ لالہ عاطف کو ملتی رہتی تھی — آج بھی شاید وہ اسے آنے کی وجہ یہی تھی —

عائشہ نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی نرمی سے پوچھا — ” کہاں سے آرہی ہو — ؟ “

لالہ چونکی — کئی بار پہلے بھی اسے کالج میں دیر ہو جایا کرتی تھی مگر ماں نے اس انداز میں کبھی نہیں پوچھا تھا — چپ سی ہو گئی — کیا پتہ کسی نے انہیں بتا ہی دیا تھا کہ وہ عاطف کو ملتی رہتی تھی — لرزی — پشیمانی — گھبرائی — ” آج بہت دیر سے چھٹی ہوئی — “ عائشہ اس کے چہرے کو گھورے جارہی تھیں —

دل کے چور نے اسے بالکل ہی بوکھلا دیا — ماں کی بات کا کوئی جواب دینے کی بجائے وہیں فرش پر بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر سر رکھا اور بے اختیار رونے لگی — ماں کو کیسے بتائی کہ وہ بے تصور تھی — یہ جو کچھ ہوا بالکل غیر ارادی اور غیر اختیاری تھا — جانے کیسے چپکے سے عاطف اس کے دل میں آ بیٹھا تھا — اسے پتہ ہی نہیں چلا —

وہ ماں سے چوری چوری اس سے ملنے لگی — اس نے ماں سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتی تھی مگر اس کا اظہار ماں سے کر ہی نہ سکی — یہ دل کے معاملے کچھ ایسے ہی انوکھے اور عجیب ہوتے ہیں —

وہ کیا کرتی — ؟ بس بہک ہی گئی — یہ جاننے کے باوجود کہ بوں چوری چوری عاطف کو ملنا اچھی بات نہیں تھی — مگر وہ ملتی رہی — جانے اسے



لجی۔ عاطف نے گاڑی روک لی۔ زبان سے اس بھی کوئی لفظ نہیں کہا۔  
بہت دھیرے سے اسے قریب کھینچا اور اس کا سر سینے سے لگا کر اس کے بالوں  
کو سہلانے لگا۔

وہ بہت دیر روتی رہی۔ بہت دیر۔ وقت کا اندازہ نہ اسے ہوا نہ  
اسے۔ شام کا وضو لگا چھا۔ لے لگا تو عاطف چونکا۔

”اے! یہ تو شام ہونے کو ہے۔ تمہاری امی پریشان ہو رہی ہونگی۔“  
لالہ نے گھبراہٹ سے چہرہ اونچا کیا۔ عاطف کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ کس  
مشکل سے اس نے ان چپکلتی جھیلوں پر ضبط کے بند باندھے تھے۔ لالہ مکرور  
سی لڑکی۔ پھر رومی۔

”بس۔!“ عاطف نے اس کے آنسو پونچھے۔ پھر ہاتھوں میں اس کا چہرہ  
لے بڑی دیر اسے گھورتا رہا۔ اور۔ اور۔ پھر بہت ہولے سے اس  
نے اس کی آنکھوں کو چوم لیا۔

”اب اگر وہیں تو میں ہمیشہ کے لئے روٹھ جاؤں گا۔“

اتنا کہہ کر اس نے گاڑی چلا دی۔ لالہ کا ایک ہاتھ اب بھی اسی طرح اس  
کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ دور سڑک پر نکلا جس جگہ اسے ملے جا رہا تھا۔

اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر اس نے گاڑی کھڑی کر دی۔ لالہ اترنے لگی تو  
اس کے دونوں ہاتھ تھام کر تسلی دینے کے انداز میں انہیں تھپتھپایا اور اس کی سوجی  
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے حد افسردہ لہجے میں صرف اتنا کہا۔

”خدا حافظ۔!“

لالہ یہ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ بس چپ چاپ اپنے گھر کو چل پڑی۔ چند

۴۴ قدم اٹھانے کے بعد رکی۔ مڑ کر اسے دیکھا مگر آنکھوں کے آگے آنسوؤں کے  
پرے حائل تھے۔ وہ دکھائی نہ دیا۔ البتہ اس کی گاڑی ابھی تک وہیں کھڑی تھی  
لالہ کا سارا وجود لرز رہا تھا اور وہ ہچکیاں لے لے کر روئے جا رہی تھی۔  
ماتر نے اس کے بالوں میں بڑی شفقت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے بہت دیر  
سے پوچھا۔

”تمہیں عاطف بہت پسند ہے۔؟“

لالہ نے چونک کر ماں کی جانب دیکھا۔ آنکھوں میں ندامت تھی۔ تو  
واقعی ماں کو سہرات کا علم ہو گیا تھا۔ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ مگر۔ ماں کی  
آغوش۔ محض خاترین پناہ گاہ۔ جس میں سہا کر سب شرمندگیاں، ٹکڑے اور  
پریشانیں رفع ہو جاتی تھیں۔ پھر وہیں چہرہ چھایا۔ سیکھاں اور تیز ہو گئیں۔  
”تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔ میں تمہاری ماں ہوں لالہ! مجھے سب  
کچھ کہہ دینا تھا۔ میں نے اگر انکار کیا تھا بیٹی! تو صرف تمہارے جھلے کی  
خاطر۔ تمہاری بہتری کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ لیکن۔ لیکن اگر تمہیں  
عاطف پر پورا اعتماد ہے تو۔ تو۔“

عائشہ خاموش سی ہو گئیں۔ لالہ نے جلدی سے سر اٹھا کر مستفسرانہ نگاہ  
سے ماں کو دیکھا۔

”دراصل بیٹی! میں اپنے ہی تجربے کی ڈور پر تمہارے مستقبل کی گرہیں لگاتی  
رہی۔ تمہارے دل کے اندر میں نے جھانکا ہی نہیں۔ میں تمہارے  
لیے خوشیاں مینا کرنے کے متعلق سوچتی رہی اور یہ مجھے خیال ہی نہ آیا کہ خوشیاں  
تو من کے اندر سے ہی چھوٹی ہیں۔ میں تمہارے دل کی خوشی پوری کر دینی

امی۔ "لالہ ماں کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جینج پڑی۔"

عائشہ کی آواز بھرائی جا رہی تھی۔ لالہ کی ہچکیاں یکدم رک گئیں۔  
جلد ہی سے ماں کی جانب دیکھا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔  
نجانے کیوں۔ اپنی بھول، ان کے لیے جیسے چین ہو گئی۔

عائشہ نے محسوس کیا کہ ان کے آنسوؤں نے لالہ کو پریشان کر دیا تھا۔ یہ کیا کیا۔ یہ تو عثمان کی اولاد تھی۔ مگر کیا اس کے دل میں عائشہ کا درد

بھی تھا۔ چند گھنٹے پہلے عثمان کے ساتھ ہونے والی گفتگو ایک بار پھر ذہن میں گھوم گئی۔

”میں قانون کے ذریعے لالہ کو لے لوں گا۔ قانون کے ذریعے۔ قانون کے ذریعے۔“ عائشہ نے بڑے کرب سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

” اہی ایکسا ہوا۔۔۔“ لالہ نے بڑی پریشانی سے ماں کو دیکھا۔

عائشہ کے کانوں میں بیٹی کی آواز اترتی تو وہ چوہ نکلیں۔ یہ وہی آواز تھی جو

پچھلے ایفیس برس سے ہر لمحہ وہ سنتی آرہی تھیں۔ یہ تو اب یوں ان کے ارد گرد

گو کہ جتنی دہشت مٹتی، یلوں روئیں روئیں ہیں رچ بس گئی تھی کہ اب اپنی ہی گتھی تھی۔

اس کے بغیر تو ایک لمحہ بھی ان کا گزارا نہیں تھا۔ — یہ تو ان کی زندگی کی آواز

مختی — روح کی پکار تھی۔

بھپٹ کر عائشہ کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

” لالہ ! اگر تمہیں کوئی مجھ سے چھپیں لے تو —۔۔۔۔۔“

مہتمم اور اعلیٰ زندگی دینے کے لیے اس نے اپنے سہارے بھی چھوڑ دیئے تھے۔

لازمہ سے معلوم ہوا تھا کہ صبح سے انھوں نے کھایا کچھ نہیں تھا۔ لازمہ کو کھانا لانے کے لیے آواز دی۔

وہ کھانا لے آئی۔ عالتشہ بڑی حیرت سے لالہ کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ کل کی ننھی اور معصوم سی بچی۔ آج کیسے ان کی ڈھال بن گئی تھی۔ سینہ فخر سے تن سا گیا۔ اپنا خون۔ اپنا سرمایہ۔!!

کھانے سے فارغ ہو کر لالہ نے ماں کا بستر بچایا اور انھیں سہارا دے کر وہاں لٹا دیا۔

”اب آپ آرام کیجئے۔ سارے دن کی پریشانی نے آپ کے ارمان خلا کر دیے ہیں۔ دیکھتے تو سہی آپ ایک دم سے ہی کتنی کمزوری ہو گئی ہیں۔“

بڑے پیار سے ماں کو تسلیاں دینے لگی۔

”آپ خود کو تنہا اور بے بس کیوں سمجھتی ہیں امی! میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں، جو آپ کے خون اور آپ کی محنت مشقت سے پر دان چڑھی ہوں۔ آپ نے مجھے گھر دیا ہے۔ گھر کا سکون دیا ہے اور ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا ہے۔ میرا باپ بھی آپ ہی ہیں۔ کوئی اور یہ حق نہیں بٹا سکتا۔ اور اگر کسی نے بٹایا تو جواب وہ میں ہونگی۔ ساری دنیا کے سامنے۔ سارے زمانے کے رو برو۔ آپ اپنے ذہن کو سب فکر اور پریشانیوں سے آزاد کر کے سو جائیے۔“

اس نے ماں کو لحاف اڑھایا۔ جھک کر ان کی پیشانی کو چومے اور سونے کی تاکید کرتے ہوئے بتی بجھا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اپنی دانست میں وہ ماں کو سلا گئی تھی مگر۔ جانے کیا ہو گیا تھا۔

اُدرا ب وہ کہتا ہے کہ قانون کے ذریعے تمہیں مجھ سے لے لیکا۔ مجھے میری آنکھوں کی بینائی سے محروم کر دے گا۔ میری زندگی کو مجھ سے چھین لے گا۔ پھر میں کیا کروں گی۔“ عالتشہ سسک رہی تھیں۔ لہر رہی تھیں۔ غم کے مارے ان کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔

لالہ ٹرپ اٹھی۔ ماں۔ کسے سینے میں تو ماترا کا جذبہ تھا۔ وہ جذبہ، جس کے سامنے باقی سب جذبے بے بیج ہوتے ہیں۔ مگر خود لالہ بھی اپنی ماں کو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ انسان، جس کے عالتشہ کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ اس کے پاس، اپنی اتنی عظیم ماں کو چھوڑ کر جانا اسے قطعی گوارا نہ تھا۔

”مجھے آپ سے دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی امی!“ وہ ماں کے سینے سے جھٹ کر بولی۔

”دنیا کی کوئی طاقت نہیں۔ آپ بے فکر رہیئے۔“

پھر سیدھی ہو کر بڑے جوش سے کہنے لگی۔

”مجھے حاصل کرنے کے لیے اسے قانون کا درگھٹکھٹانے دیجیئے۔ میں اس کا جواب دوں گی۔ میں خود۔ میں ایسے قانون کی دھجیاں اڑا دوں گی امی! آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ میں ایسے سب باپوں کو ان کی حیثیت بتا دوں گی جو اپنے فرائض پورے کر نہیں سکتے اور حقوق لینے آجاتے ہیں۔ میں سب کو مزہ چکھا دوں گی۔ سب کو آئینہ دکھا دوں گی۔ سب کو۔“

عالتشہ کی سسکیاں تھم چکی تھیں اور وہ بڑی حیرت سے بیٹھی کو دیکھ رہی تھیں۔

غٹمان اس پر اپنا حق جتا تھا۔ قانون بھی، شریعت بھی، سبھی عثمان کے طرفدار تھے مگر۔ یہ لالہ کیا کہہ رہی تھی۔

پھر لالہ نے ماں کے آنسو پوچھے۔ رات ہو چکی تھی۔ اسے گھراتے ہی

عائشہ کو کسی کل قرار نہیں آ رہا تھا۔

رہا تھا۔ بے چینی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جانے کتنا وقت انہیں سوچوں میں الجھے گزر گیا۔ اور جب پھر بھی اس مسئلہ کا کوئی حل ذہن میں نہ آیا تو بے قراری حدود سے تجاوز کرنے لگی۔

یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے دل کو کوئی مٹھی میں دبا کر مسلے جا رہا تھا۔ تکلیف کی شدت نے اتنا بے چین کیا کہ اس وقت ان سوچوں سے فرار حاصل کرنا ہی بہتر سمجھا۔ اور فرار کی راہ صرف یہی دکھائی دی کہ سو جائیں۔ مگر بہت کوشش کے باوجود نیند نہ آ سکی۔ بے قراری اور بے چینی بدستور تھی۔ پریشان کن خیالات سے رہائی بھی نہ مل سکی۔ بے قراری اور بے چینی بدستور تھی۔ تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر خواب آور گولیوں کی شنیدنی نکالی۔ جب سے عثمان نے انہیں یہ صدمہ دیا تھا۔ نیند کے لیے وہ ان گولیوں کی محتاج ہو کر رہ گئی تھیں۔ چنانچہ اس وقت بھی سکون کی خاطر انہیں کا سہارا لینا پڑا۔

بستر کے ساتھ والی میز پر ہاتھ ڈالا۔ ملازمہ پانی رکھنا بھول گئی تھی۔ بغیر پانی کے ہی نکل لیں اور نیند کے انتظار میں پھر لیٹ گئیں۔ چند لمحوں بعد ذہن پھر صاف ہو گیا۔ انہیں فکروں نے دوبارہ آن گھیرا تھا۔

اسی طرح بے قراری اور بے چینی بڑھنے لگی تو پھر نیند کی پرسکون آغوش یاد آئی۔ دوبارہ تکیے کے نیچے سے شنیدنی نکالی۔ جانے کیا ہو گیا تھا۔ آجکل تو دو اوائل میں بھی کوئی اثر نہیں رہ گیا تھا۔

جھنجھلاتے ہوئے پتیلی پر شنیدنی الٹائی۔ اندھیرے میں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کتنی گولیاں نکلی تھیں۔ فوراً منہ میں رکھیں اور نکل گئیں۔

پانی تھا نہیں۔ پیاس بہت لگی تھی۔ حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔

یہ ان کی کیسی زندگی تھی۔ جو حقیقت سے زیادہ کہانی بنی جا رہی تھی۔ پہلے کیا کم الجھنیں تھیں جواب ایک اور نیا مسئلہ آن چڑھا تھا۔ یہ بھی رسوائیوں اور بدنامیوں کا سامان۔ جن کی خاطر بہت پہلے اپنا شہر چھوڑا تھا۔ وہ پھر سامنے کھڑی منہ پڑا رہی تھیں۔

عثمان ان سے لالہ کو چھین لینے کی دھمکی دے کر گیا تھا اور لالہ اس کا مقابلہ کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ تصویر ہی تصویر میں انھوں نے باپ اور بیٹی کو عزت میں آنے سامنے کھڑے دیکھا۔ ایک باپ اور ایک بیٹی کو۔ گورنر ہوا عثمان سے سب قلعی توڑ بیٹھی تھیں مگر بیٹی۔ وہ تو ان کی اپنی کوکھ سے پیدا کی ہوئی تھی۔ اپنی اولاد۔ اس کی بدنامیاں بھی تو اپنی ہی تھیں۔ تصویر کی نگاہ نے دیکھا۔

اخباروں میں، رسالوں میں، لوگوں کی زبانوں پر۔ غرض ہر جگہ اور ہر زبان پر اسی کی کہانی تھی اور اسی کے چرچے۔ ”نہیں۔ نہیں۔“ عائشہ یکدم حرج پڑیں۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ لالہ کے ویسے گئے حوصلوں نے حوصلہ بخشنے کی بجائے دوسری قسم کی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ نہ لالہ کو اس کے باپ کے پُر و کر دینے کا امنا میں حوصلہ تھا اور نہ ہی یہ برداشت کر سکتی تھیں کہ باپ بیٹی مقابلے میں کھڑے ہوں اور پھر ان کی کہانیاں بنیں۔

اودھ خدا۔ وہ کیسے دور ہے پراکھڑی ہوئی تھیں۔ کچھ بھی سوچھ نہیں

لالہ کو آواز دینا چاہی لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال آگیا کہ ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ شاید سو رہی تھی۔ جگانے سے بے آرام نہ ہو۔

بیٹی ہی کی بے آرامی کا خیال کرتے کرتے نڈھال سی ہو کر پڑ گئیں۔ دل بری طرح ڈوب رہا تھا۔ فکر اور پریشانیوں انسان کو ادھ مو کر چھوڑتے ہیں۔ دل کے ڈوبنے کا یہی جواز ملا۔ دونوں ہاتھوں سے سینے کو دبا کر چپکے سے آنکھیں میچ لیں۔

حواس پر غنودگی سی چھانے لگی۔ شکہ کیا کہ نیند آرہی تھی۔ اور پھر وہ خوشی خوشی چند گھنٹوں کے لیے سکون کی آغوش میں چلی گئیں۔ عجیب سی رات تھی۔ بے حد تاریک اور اداس سی۔ جانے کیا ہو گیا تھا۔ کسی کل۔ کسی پہلو۔ چین سی نہیں آرہا تھا۔

وہ کبھی بستر پر لیٹ جاتے اور کبھی اٹھ کر وہیں تھوڑی سی جگہ پر بڑکھڑاتی ٹانگوں سے ٹہلنے لگ جاتے۔ پھر ٹہلنے ٹہلنے رک کر دیواروں پر آویزاں تصویروں کو دیکھنے لگ جاتے۔

”اوہ! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔“ ہاتھوں میں سر تھام کر پھر مسہری پر بیٹھ جاتے۔ بے چینی سی بے چینی تھی۔

نگاہوں میں بار بار عائشہ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اسے ایسی بات کہنے کو دل تو نہیں چاہتا تھا مگر۔ لالہ، جوان کی اولاد تھی اور جس کے لیے وہ ساری زندگی کچھ نہیں کر سکے تھے اور عاطف، جو بے حد اچھا تھا، انتہائی قابل اعتماد ہستی۔!

ان دونوں کی بہتری کی خاطر انہیں عائشہ کو یہ دھکی دینا ہی پڑی تھی۔ انتہائی مجبوری سے۔ اور پھر۔۔۔ ان کی یہ بات سن کر عائشہ کی جو حالت ہوئی تھی وہ لمحہ بھر کے لیے بھی تو ذہن سے خارج نہیں کر سکے تھے۔ کیسے بڑھال سی ہو کر اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹیک دیا تھا۔

”اوہ! میری عائشہ! مجھے معاف کر دو۔“ انہوں نے سچ مچ تصویر کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”میں نے جان بوجھ کر انا کو الوداع اختیار کیا تھا اور لالہ کو تم سے چین لینے کی اذیت ناک دھکی دی تھی۔ صرف اس لیے۔ کہ لالہ بھی عاطف کو چاہتی ہے۔ اور تم ان دونوں کی شادی پر راضی نہیں ہو رہی تھیں۔ اور میں۔۔۔ میں لالہ کے لیے۔۔۔ اپنی اولاد کے لیے۔ کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ کچھ تو میرے ضمیر کی خلش کم ہو۔ کچھ تو مجھے سکون ملے۔“

ایسی عجیب سی بے چینی ان کے اندر سماتے جا رہی تھی کہ آنکھوں سے آنسو نکل گئے تھے احساس ہے کہ میں نے نہیں ہمیشہ کے لیے دکھوں کی ایک ایسی جلتی

آگ میں ڈال دیا ہوا ہے کہ اب اس میں مزید ایندھن جھونکنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر۔ مجھے معاف کر دو۔ میرے ہاتھوں تمہیں اور دکھ مل گیا۔ میں کیا کروں۔؟ میں کیا کروں۔؟

دل کو کسی طرح بھی قرار نہیں مل رہا تھا۔ نیند بھی نہیں آرہی تھی کہ ذہن کچھ دیر کے لیے ان لکیف وہ خیالات سے چھٹکارا حاصل کر لیتا۔ پھر اٹھ کر

دور دور تک تاریکی ہی تاریکی تھی۔ بڑی دیر یونہی کھڑے تاریک غلاؤں میں گھورتے رہے۔ ماضی بھی تو اس شب کی تاریکی ہی کی طرح تاریک تھا۔ لگا ہوں میں سب کچھ گھوم گیا۔

عائشہ کے ساتھ بے وفائی کر کے ایک دن بھی تو انھیں سکون کا نہیں ملا تھا۔ اسے انہوں نے دکھوں کی آگ میں جلا یا تھا تو قدرت نے انھیں بھی تو ایک لمحہ اطمینان کا نہیں دیا تھا۔

ضمیر کی غلطی کے ہاتھوں وہ ہر ہر لمحہ تڑپتے رہے۔ اولاد والے ہو کر بھی ساری زندگی کیسے تنہائیوں اور دیرانیوں میں گزری۔ کتنی بڑی بد بھیبی تھی۔ اودہ ان کے ذہن میں پئی، بڑھی، جوان ہوئی مگر۔ کیسے کیسے وہ اس کے لمس کو اسے دیکھنے کو اور اسے پیار کرنے کو ترستے رہے۔

اور ابھی۔۔۔ وہ ان گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر پائے تھے کہ ایک اور چرکا۔ ایک اور زخم۔۔۔ نئے نشتر سے۔ دوبارہ عائشہ کو لگنا پڑا۔ اودہ خدا۔! وہ مرغ بسل کی مانند تڑپے۔

جانے وہ اتنا تڑپتی تھی کہ نہیں جتنا خود وہ دکھی ہو گئے تھے اور تڑپ رہے تھے۔ کاش! یہ نہ کرنا پڑتا۔ کاش! یہ نہ کرنا پڑتا۔

انھیں پریشانیوں میں رات بیت گئی۔ لمحہ بھر کے لیے بھی ان کی پلک نہیں جھپکی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے بھی دل کو قرار نہیں آیا تھا۔

دور کسی مسجد سے موزن کی آواز نے انھیں طلوعِ صبح کا احساس دلایا۔

وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ سارے صبح میں نقاہت سی ساقی چلی جا رہی تھی۔

چسپ چاپ سہری پر دراز ہو گئے۔

ملازم چائے لے آیا۔ کوئی بات نہیں کی۔ پیالی پاس والی تپائی پر رکھی۔ اور خود پھر انھیں خیالوں میں کھو گئے۔

”پرنسپل صاحب جاگ رہے ہیں۔“ ”؟“ عاطف کی آواز تھی۔ شاید ان کے ملازم دھمو سے پوچھ رہا تھا۔

گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ اتنی صبح آیا تھا۔ بیت تو تھی۔؟ دل کسی انجانے خدشے سے دستک دھک کرنے لگا۔

”السلام علیکم۔!“ دوسرے ہی ثلثے عاطف پر وہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ چہرے پر مسکراہٹیں بھینیں۔

پرسوں ان کے پاس سے گیا تھا تو بے حد پریشان تھا مگر۔ چہرے پر پھر پھیلے قوس و قزح کے سے یہ حسین رنگ۔ اس کی دلی مسرت کے غماز تھے۔ اس نے کیا پایا تھا۔؟

”آپ حیران ہوں گے کہ میں اتنی صبح کیسے اگیا۔؟“ مہتمم ہونٹوں سے بولا۔ پھر بے تکلفی سے کسی ان کے پاس گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”آپ نے کہا تھا کہ اس سلسلے میں آپ میرے لیے کچھ کریں گے مگر اب۔“ ذرا کہ نہ دھیرے سے کہنے لگا۔ ”میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔“

”ارادہ بدل لیا ہے؟“ پرنسپل صاحب نے چونک کر، گھبرا کر اسے دیکھا۔ کیا ایک اور مدعو رت سے بے وفائی کرنے چلا تھا۔

”اودہ میری بیٹی! میری بچی! اب تیری قسم تیری ماں جیسی نہیں سہونا چاہیے۔“ دل کے اندر عجیب سے دکھ کا احساس ہوا۔

”یہ نہیں! انکھی سی چٹانسی لگی۔“ ”نہیں نہیں۔“ ”یکدم ہی چیخ پڑے۔“ ”تمہیں اس سے شادی کرنا

بولی۔ اور پھر ساری زندگی اس کے ساتھ نباہ بھی کرنا ہوگا۔ تم عثمان نہیں بنو گے۔ تم عثمان نہیں بنو گے۔

”پرنسپل صاحب! عاطف مسکرایا۔ ”یہی تو ہیں تیرے آباؤ اجداد کی عثمان کا یہ کیا جفا کا داغ مٹاؤں گا میری ذات پر جو اس نے دھبہ لگایا ہے وہ دھو دوں گا۔“

”یہ۔۔۔ کس طرح۔۔۔؟“

”میں نے امریکہ جانے سے انکار کر دیا ہے۔“

”کی۔۔۔؟“ پرنسپل صاحب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”جی ہاں۔“ عاطف کے پھر کچھ بڑی خوب صورت سی مسکراہٹ تھی۔

”مگر تمہارا مستقبل۔۔۔ تمہاری ترقی۔۔۔“

”یہ مستقبل، یہ ترقیاں۔۔۔ جیات کے پرمسرت لمحات سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتیں۔ زندگی میں محبت ہو، پیار ہو۔ ایک دوسرے کے لیے ایثار کا جذبہ اور ذمہ داری کا احساس ہو۔ وہی زندگی خوبصورت ہوتی ہے۔

وہی زندگی پرمسرت ہوتی ہے۔ پیٹ میں بے شک اعلیٰ خوراک کی بجائے روکھی سوکھی ہو اور تن پر قیمتی لباس کی بجائے سوت کھدر ہو۔ زندگی حسین

تو دلوں کے سکون اور من کی خوشیوں سے بنتی ہے۔ پس لالہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر وہ مسکرا مسکرا کر بہت ہو لے ہو لے انھیں تباہ لے لگا۔

”وہ مجھے کل پھر ملی تھی۔ بے حد اداس تھی۔ اتنی۔ کہ مجھ سے اس کی

پریشانی دیکھی نہ گئی۔ اور۔۔۔ میں نے اپنے دل کا بھی محاسبہ کیا۔ میں

خود بھی تو اس کے بغیر سکون نہیں پاسکتا۔ پھر۔۔۔ اسی لیے میں نے اپنے

مستقبل اور ترقیوں کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اگر اس کی ماں کے دل میں یہ

خیال بالکل بچہ ہے تو میں وہ راستہ ہی اختیار نہیں کروں گا جہاں جھٹک جانے

کا خدشہ ہے۔ میں کسی انسان پر اس کا دل توڑنے کا ظلم نہیں ڈھاسکتا۔ عثمان نجانے کیسا بے حس انسان تھا جس نے اتنا بڑا ظلم چپ چپاتے اس بیچاری پر ڈھادیا۔“

عاطف پرنسپل صاحب کے جھکے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بڑے

چوڑے سے کھتا رہا۔ ”لالہ سے شادی کر دوں گا۔ پھر ہم دونوں مل کر

اپنی ذمہ داریوں کو نبھائیں گے۔ اس کی ماں ہمارے پاس رہے گی۔ اپنی

بیٹی کو خوش دیکھے گی تو پھر۔۔۔ پھر شاید اسی طرح اس دکھوں کی ماری کو بھی سکون

کے کچھ لمحات میسر آجائیں اور مرو کی ذات کی طرف سے جو بے اعتمادی کے

زخم اسے ملے ہیں شاید اسی طرح ان پر سکون کی مرہم لگ جائے۔“

”اوہ۔۔۔!“ پرنسپل صاحب کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے اور ہاتھ کانپ رہے۔

عاطف کے خیالات قابلِ تائید ہی تو تھے۔ پرنسپل صاحب نے عیب

سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی خوبصورت سی

چمک تھی اور کسی کے لیے کوئی ایثار کیا جائے تو دل کے اندر سے جو سکون و

اطمینان کی لہریں اٹھتی ہیں، انھیں کے ساتھ اس کے چہرے پر لہرا رہے تھے۔

پوری رات انھوں نے جس بے چینی اور بے قراری میں گزار دی تھی اس

کی صبح بے حد حسین اور پرمسرت ہوتی تھی۔ جلدی سے بڑھ کر عاطف کو گلے سے

بہت اچھا کیا میرے بیٹے۔! بہت اچھا ارادہ ہے۔ تمہارے اس

فیصلے نے تو جیسے مجھے سرخرو کر دیا۔“

”آپ کو۔۔۔؟“ عاطف حیرت سے انھیں دیکھنے لگا۔

”اوہ۔۔۔!“ وہ یکدم کھڑکھڑا اٹھ اٹھا۔ ”میرا مطلب تھا کہ عثمان کی اس





بہت دن بیمار رہے تھے۔ نقاہت سے کانپ رہے تھے۔ تیز تیز  
 آئے تھے بیڈ کو ہانپتے لگے۔ مگر۔ چہرے پر مسرت کی چمک تھی۔ عاطف  
 نے آج تک انہیں بچوں کی مانند یوں خوشی میں بے قرار کبھی نہیں دیکھا  
 تھا۔ ان کی عجلت نے اسے بھی گاڑی کی رفتار تیز کرنے پر مجبور کر دیا۔  
 ”وہ۔ وہ۔ روک لو۔ یہی ہے اس کا گھر۔“ پرنسپل صاحب کچھ  
 ہدایتی سے انداز میں چلاتے۔ عاطف نے بریک لگاتے۔ مگر۔  
 گاڑی ابھی پوری طرح رکی بھی نہیں تھی کہ وہ جلدی سے دروازہ کھول  
 کر باہر نکلے اور پھاگ کہ عاطف کی سمت آتے ہوئے بے قراری سے بولے۔  
 ”جلدی کرو نا۔“

ان کی عجلت اور بے تابی اب عاطف کو پریشان کرنے لگی تھی۔ پچھلے  
 دنوں کی بیماری نے کہیں دماغ میں کوئی خرابی تو نہیں پیدا کر دی تھی۔ ان  
 کی یہ حرکات تو بالکل دیوانوں جیسی تھیں۔ ورنہ عاطف سے ان کا رشتہ  
 یا تعلق ایسا بھی نہیں تھا کہ اتنے جذباتی ہو جاتے۔

عاطف سوچ ہی رہا تھا کہ پرنسپل صاحب نے اس کا بازو پکڑ کر باہر نکلا  
 ”تم شاید اس کا سامنا کرنے سے جھجک رہے ہو۔ فکر نہ کرو ایسی کوئی  
 بات نہیں۔ وہ بہت اچھی ہے۔ تمہیں بہت پیار کرے گی۔ تم اسے  
 مل کر نو دیکھو۔ وہ بڑی نیک دل ہے۔“

عاطف مسرور سا ان کے ساتھ چل پڑا۔ کچھ کہنے سننے کی پرنسپل  
 صاحب نے نہ کوئی گنجائش چھوڑی تھی اور نہ ہی کوئی موقع دے رہے تھے۔  
 بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ ایک دوبارہ صوبہ کی اور  
 جواب کا انتظار کیے بغیر اسی طرح عاطف کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتے۔

عائشہ کے کمرے کا دروازہ بھی چوہٹ کھلا تھا۔ اندر قدم رکھا تو وہیں  
 ٹھنک گئے۔  
 عائشہ شاید ابھی تک سوئی پڑی تھی۔ پلنگ کی پٹی کے بالکل ساتھ کسی  
 اے دروازے کی سمت پشت کیے کوئی لمبی سی چوٹی والی خاتون جھکے بیٹھی تھی  
 عاطف ان کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے بھی دیکھا۔ لمبی چوٹی والی  
 زور پہچان لیا۔ وہ لالہ تھی۔ مگر یہ انداز۔ ایہ پرہیز سناٹا اور یہ موت  
 سی خاموشی۔ دل کے اندر کہیں ویرانیاں سی اترتی چلی گئیں۔  
 پرنسپل صاحب سے بازو چھڑا کر جلدی سے آگے بڑھا اور بہت  
 دیر سے لالہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”کون۔؟“ وہ چونکتے ہوئے جلدی سے کھڑی ہو گئی۔  
 ”ارے آپ۔؟ آپ یہاں کیوں آئے۔؟“ وہ گھبرا گھبرا کر کبھی  
 عاطف کو اور کبھی لحاف میں سوئی ہوئی ماں کو دیکھنے لگی۔  
 ”کیا بات ہے۔؟ تم یوں چپ چاپ سی کیوں بیٹھی ہو۔؟“

عاطف نے اس کی بات کا کوئی جواب دینے کی بجائے بڑی بے چینی سے پوچھا  
 ”بات لالہ سے کر رہا تھا مگر نگاہ سونے والی پر ٹکی تھی۔ لحاف  
 یوں ساکت تھا جیسے اس کے نیچے کوئی جاندار وجود نہیں تھا۔ سانس  
 اکا اکا چڑھاؤ کا کوئی اور ذرا سی بھی جنبش نہ تھی۔  
 ”وہ۔ امی کی طبیعت شاید جھجک نہیں۔ اتنی دیر تک کبھی نہیں  
 سوئی تھیں۔ ملازمہ ڈاکٹر کو بلا لے گئی ہے۔“  
 اس کی بات بھی پوری نہیں سی۔ عاطف نے پک کر سونے والی کے  
 چہرے سے لحاف ہٹایا۔  
 ”ارے۔!“ سٹنٹا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یہ چہرہ، یہ صورت۔

یہ کہیں وہی تو نہیں تھی جس کی کئی تصویریں اس نے پرنسپل صاحب کے گھر دیکھی تھیں۔ دوبارہ پھر آگے بڑھا۔ بلاشبہ یہ تو وہی تھی۔

گھبرا کر پرنسپل صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ گم سم سے ابھی تک دروازے میں ہی چوکھٹ کے ساتھ لگے کھڑے تھے اور پچھٹی پچھٹی نگاہوں سے کبھی عاطف کو اور کبھی لالہ کو اور کبھی اس پلنگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ قدموں کی چاپ کے ساتھ سب نے ہی مڑ کر دیکھا۔ ملازمہ ڈاکٹر کو لیے آرہی تھی۔ ادھر ادھر متوجہ ہوتے بنا وہ سیدھی ڈاکٹر کو عائشہ کے پلنگ کی طرف لے گئی۔

ڈاکٹر عائشہ کا معائنہ کرنے لگا۔ اس وقت کسی ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ سب اسی طرف متوجہ تھے۔ پرنسپل صاحب بھی چاپ اس کی پائنٹی جا کھڑے ہوتے تھے۔ سب سے پرے۔ ایک طرف ہٹ کر۔ جانے انہیں کیا ہو گیا تھا۔ ہاتھ بری طرح لہڑ رہے تھے۔ ٹانگیں لڑکھڑاہی مچھلیں اور چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔

اپنی حالت پر قابو پانا مشکل ہو گیا تو دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔ کیسا عجیب مقدار تھا۔ بالکل اپنے ہوتے ہوتے بھی وہ کیسے اس وقت بیگانوں کی مانند لگ تھلک کھڑے تھے۔

اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے سر اٹھایا۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔ نگاہ میں عجیب قسم کی بے چینی تھی۔ عاطف کو شاید کچھ سوچہ گیا تھا۔ ان کا بازو ختم کر ایک دم پرے لے گیا۔ لالہ سے کچھ فاصلے پر۔ دیوار کے پاس۔ جہاں پرنسپل صاحب کھڑے تھے۔

کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب۔ عاطف نے بہت ہولے سے پوچھا۔

انہیں تو انتقال کیے کم از کم چار گھنٹے ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب۔! بیچ کی آواز بلند ہوئی۔ جانے کب لالہ پاس کھڑی ہوئی تھی۔ عاطف نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

میری امی۔ میری امی۔“ مزید کچھ کہہ نہ سکی۔ لڑکھڑائی۔

طاف اسے ختم نہ لیتا تو وہ پختہ فرش پر گر پڑتی۔ اور پھر۔ وہ اس کے بازو دل میں جھولتی رہ گئی۔

وہ بیدار ہوئی۔ دائیں طرف سے بائیں جانب کروٹ بدلی۔

میں ابھی تک بند ہی تھیں۔ عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا۔

”اوہ! کتنا بھیاں خواب تھا۔“ منہ ہی منہ میں کلے کا ورد کرتے۔

پھر۔ یکدم ہی ذہن بھی بیدار ہو اٹھا۔

وہ خواب تھا یا حقیقت۔؟ گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور ارد گرد دیکھنے لگی۔ کمرے میں مدھم روشنی والابوں روشن تو تھا مگر ساتھ ہی علی البسح لگیا سا اجالا بھی بکھیر رہا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دوسرے طرف دیکھنے لگی۔ کوئی سر نہ لیٹ پڑا تھا۔

تو واقعی وہ خواب ہی تھا۔ اس کی ماں تو یہ اس کے پاس رہی تھی۔ ہڑ بڑا کر جلدی سے اٹھی اور اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

کے کہیں اندر سے یہ صدا بھی اٹھ رہی تھی کہ وہ اس کی ماں نہیں مگر پھر بھی اس ہی کہہ رہی تھی کہ کاش! وہ اس کی ماں ہی ہو۔

یہ اس نے دیکھا تھا وہ خواب ہی ثابت ہو۔

”میری تنہائی کا بندوبست؟“ لالہ نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر  
شیر نگاہ سے رقیہ خانم کی جانب دیکھا۔ وہ یہ کیا کہہ رہی تھیں؟  
”ہاں۔۔۔ تمہاری تنہائی کا خدا نے یہ انتظام کر دیا کہ تمہارے آبا  
گئے۔“ ”آبا۔۔۔“ لالہ چونکی۔ ”میرے آبا۔۔۔“

اور پھر۔۔۔ اس کے ذہن کے دریا بہہ گئے۔ ہاں  
وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ اس کا باپ زندہ تھا۔ ماں کے  
رنے سے ایک دن پہلے وہ اس کے پاس آیا تھا۔ اپنی بیٹی کو لینے  
کے لئے۔ خود لالہ کو لینے کے لئے۔

اور ماں۔۔۔ اُن تو یہ! اس دن کتنی بے چینی تھی بے چاری  
رقیہ خانم نے جلد ہی سے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے اسے اپنے سینے  
پر نہیں ہو رہے تھے۔ اتنا دکھی اس نے اسے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا  
ہا۔۔۔ کیسی بے بسی تھی۔۔۔ کیسی بے چارگی تھی۔!!  
ایک دم سے ہی بڑی بوڑھی اور کھردری ہو گئی تھی۔

پھر۔۔۔ اس نے ماں کو بہت ساری لتیاں اور دلا سے دیئے تھے  
اس کی بڑی دھارس بندھائی تھی۔

مگر جانے خود اسے کیا ہو گیا تھا۔؟ جیسے کسی نے بہت بزدلی  
سے نیچے پھینک دیا تھا۔ ایک دم ہی کہیں گہرائیوں میں ڈوبتی  
چلی گئی تھی۔ ماں کو آرام کرنے کے لئے لٹاتے ہوئے خود یہ سوچ  
کر دوسرے کمرے میں گئی تھی کہ کچھ دیر مطالعہ کرے گی۔ مگر دماغ اتنا  
پرالندہ سا ہو رہا تھا کہ کچھ بھی نہ کیا گیا۔ کتاب سامنے رکھے چپ چاپ

پھر نہ جانے کیا ہوا۔؟ ایک ایک دل کے اندر راک ہو کر سی اُٹھی  
وحشیانہ انداز میں جھپٹ کر اس نے سونے والے کے چہرے سے  
کمبل علیحدہ کر دیا۔ مگر۔۔۔ وہ تو رقیہ خانم تھیں جس کی کھٹی سی آواز ابھری  
”اُئی۔!“ سسکی کے سے انداز میں اس کے خلق سے کھٹی سی آواز ابھری  
اور وہ وہیں پلنگ کی پیٹی پر پڑتی بیٹھتے ہوئے بلکتے لگی۔

اس کی ماں سرگئی تھی۔ اس کا واحد سہارا اس سے جھپٹ گیا تھا  
اور وہ دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ بالکل تنہا۔!  
یہ حقیقت اتنی تلخ تھی کہ اس کی تلخی ساری ہستی میں سرایت کر گئی  
چلی گئی۔ وہ سسک رہی تھی۔

رقیہ خانم نے جلد ہی سے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے اسے اپنے سینے  
”صبر کر میری بچی! صبر۔!“  
”ہائے میں کیا کروں گی۔ میں کہاں جاؤں گی۔ میں تو یوں تنہا  
ایک پل کے لئے نہیں رہ سکوں گی۔ آبا۔۔۔ لمحہ کے لئے بھی نہیں“  
لالہ کا رور و کر بڑا حالی ہو رہا تھا۔

”رو نہیں بیٹی۔!“ اس کے غم نے رقیہ خانم کو بھی غمگین کر دیا۔  
آنسو رخساروں پر بہنے لگے مگر جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ انہیں تو لالہ  
کو تسلی دینا تھی۔ پھر۔۔۔ وہ خود یہ کیا کر رہی تھیں۔؟ جلد ہی سے  
اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

دیکھ تو تجھ پر خدا کتنا مہربان ہے۔ اس نے کس انوکھے طریقے  
سے تمہاری تنہائی کا بندوبست کر دیا۔“

بیٹھی رہی — عجیب قسم کی بے چینی نے اسے اکھیرا تھا۔ بار بار باپ ہی کا خیال آئے جا رہا تھا — آج تک اس کی عظمت و بلندی کے اس نے کبھی کس طرح گن نہیں گائے تھے — جب بھی کبھی اس کا خیال آیا، تصور ہی تصور میں اس نے بڑی عقیدت سے اس کے آگے سر جھکا دیا — اور پھر خود بھی ہمیشہ اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی — مگر —

یہ کیا ہو گیا —؟ یہ سب کیا تھا —؟ اس کے اپنے باپ ہی نے اس کا تصور کس بے دردی سے پاش پاش کر دیا تھا — کاش ایسا نہ ہوتا — کاش ایسے نہ ہوتا —

اس کے سینے کے اندر سے جیسے بہت کچھ ٹوٹ چھوٹ گیا تھا — چنکا چور ہو کر بکھر گیا تھا — ہائے ایہ بدم آنا قریب رہنے والے — اندر کہیں سانسوں میں بسنے والے — کیوں سب ماں

سب مجھ سے توڑ پھوڑ دیتے ہیں —؟ کیوں —؟ دیکھ روح کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے — کسی میلہ کسی کل چین ہی نہیں آ رہا تھا — ساری رات عجیب سی تڑپ اور

بے چینی میں کٹی — اور پھر صبح ہو گئی — اور وہ صبح — کتنی منہوس تھی — جو اس کی باقی ساری زندگی میں شب کی تاریکیاں اور ویرانیاں بکھیر گئی —

اسے بس اتنا یاد تھا کہ — اس دن ماں حسب معمول علی البسم بیدار نہیں ہوئی تھی — ملازمہ ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی تھی اور وہ ماں کے پاس

بیٹھی باپ ہی کے ٹوٹے پھوٹے بٹ سے باتیں کئے جا رہی تھی کہ عاطف اس کا وہ عاطف جس سے وہ ماں سے چوری چھپے ملا کر رہی تھی — مگر اس وقت — کیسے ویدہ دلیری سے ان کے گھر آ گیا تھا — وہ گھبرا کر بیٹھا کہ اس سے ابھی اس کے یوں چلے آنے کا مقصد بھی نہ پوچھ پائی تھی کہ ملازمہ ڈاکٹر کو لے آ گئی اور پھر —

لالہ نے دونوں ہاتھوں میں اپنے گھومتے پکراتے سر کو تھام لیا — اس کی اتنی پیاری اور عظیم ماں کی دائمی جدائی کی خبر اس نے دی تھی — اس کے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی —

ایک ہی رات میں دو موتیں واقع ہو گئیں — ایک ماں کی موت اور ایک تصوراتی باپ کی موت — دونوں عزیز ترین ہستیاں اس سے چھن گئیں — ان دونوں ہی کے سہارے تو اس کی زندگی گزر رہی تھی —

دونوں ہی سہارے چھوٹ گئے اور اب —

اب وہ اس مجھری پری دنیا میں یکدہ تھا تھی — نہ کوئی مادی سہارا —

نہ کوئی اخلاقی سہارا — نہ تصوراتی سہارا — !! ہائے!

ایک دم ہی سے وہ کیسے تنہا دامن ہو گئی تھی — صدمے کی کوئی انتہا

نہیں تھی —

”بیٹی —“ رقیہ خانم بڑی شفقت سے کہہ رہی تھیں —

”تم بہت خوش قسمت ہو — تمہیں ماں بھی اللہ میاں نے بڑی

اچھی دی تھی اور تمہارے آبا بھی بے حد اچھے ہیں — جانتی ہو وہ کون

ہیں —؟“

پیاری عادات دل میں گھر کر گئی تھیں۔ —

بہر حال۔۔۔ وجہ کچھ بھی تھی۔۔۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھیں کہ اس کی ماں کے انتقال کی خبر جب انہیں ملی تھی تو وہ دکھی ہو کر اسی وقت چل آئی تھیں اور دودن سے وہیں تھیں۔

لالہ کی تنہائی کا خیال کر کے ان کے دل کے اندر کہیں میسٹری اٹھتی تھیں اور پھر۔۔۔ جب انہیں عاطف سے معلوم ہوا کہ پرنسلی صاحب اس کے باپ تھے تو ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔۔۔ وہ بڑے اچھے انسان تھے کلچ کے سب طلباء میں وہ بے حد مددگار بن گئے۔۔۔ سبھی ان کے اخلاق اور نیک عادات کے معترف تھے اور۔۔۔ اور سب سے بڑی اور خوشی کی بات تو یہ تھی کہ خود وہ بھی لالا کے لئے ٹرپ رہے تھے۔۔۔ اس کی جدائی میں بے چین تھے۔

یہ سب کچھ انہیں عاطف نے ہی بتایا تھا۔۔۔ ماں کی موت کے صدمے نے دودن تک لالہ کو ہوش و حواس سے بیگانہ رکھا۔۔۔ ہوش میں ہوتی تو اسے اس کے باپ کے لئے کاغذ و جالفر اٹھایا جاتا۔۔۔ ماں کی موت کے زخم پر اسی خبر نے تسلی کی مرہم کا کام دینا تھا

اور اب۔۔۔ اب وہ ہوش و حواس میں تھی۔۔۔ رقیہ خانم نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔۔۔ اور وہ باپ کی تصویر کو بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھ رہی تھی، اس کے دل میں تو بیشتر ہی سے باپ کا پیار موجزن تھا۔۔۔ اسے تو کچھ بھی سمجھانے بھجانے کی ضرورت نہ تھی۔

عاطف اور سیمیں دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔۔۔ لالہ کے ہوش

لالہ خالی خالی نگاہوں سے انہیں گھورے جا رہی تھی۔۔۔ دماغ میں جانے کیا کیا سوچیں سما گئی تھیں۔۔۔ آئینہ بیکم ہی ٹم سے گئے۔ وہ ندیم کے کالج کے پرنسپل ہیں۔۔۔ عاطف انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہے اور بہت عرصہ سے۔۔۔ ان کی تعریفیں کرتے کرتے اس کی تو زبان نہیں ٹھکتی تھی۔۔۔ اور اب ہم بھی ملے تو واقعی انہیں ویسا ہی پایا لالہ چپ چاپ انہیں دیکھ جا رہی تھی اور کچھ سوچے جا رہی تھی۔

”انہیں تم نے محبت بھی بہت ہے۔۔۔ ساری رات انہوں نے نہا سہ سہانے بیٹھ کر کاٹی ہے۔۔۔ اب بھی تمہارے پاس سے اٹھنے کو ان کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا مگر صرف کالج کی مجبوری کی وجہ سے گئے ہیں۔۔۔ شام کو پھر آجائیں گے۔۔۔ اور اب جو آئے تو پھر کبھی نہیں جائیں گے۔۔۔ ہمیشہ تمہارے پاس رہیں گے۔۔۔“

رقیہ خانم جانے کیا کیا کہے جا رہی تھیں۔۔۔ لالہ چپکے سے اُمٹھی۔۔۔ کارنس پر باپ کی خوب صورت تصویر خود اسی نے سجائی تھی۔۔۔ عین اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔۔۔

”جیسے جوانی میں شاندار تھے اور اب بھی ویسے ہی ہیں۔۔۔ اچھے گتے ہیں نا تمہیں۔۔۔“ بھس محویت سے وہ باپ کی تصویر کو دیکھ رہی تھی اس سے رقیہ خانم نے یہی اندازہ لگایا۔۔۔

خود اولاد والی تھیں۔۔۔ دوسرے کی اولاد کے لئے بھی دل میں ویسے ہی مانتا بھرے جذبات رکھتی تھیں۔۔۔ کچھ یوں بھی لالہ سے پیار سا کر گیا تھا۔۔۔ شاید اس لئے کہ بیٹے کو اس سے محبت تھی۔۔۔ یا اس کی پیاری

لگی۔

”لالہ! رقیہ خانم اسے بازوؤں میں بھر کر پٹنگ کی طرف لے گئیں  
 ”بیٹی! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں — آؤ یہاں لیٹ جاؤ۔“  
 مگر لالہ پٹنگ پر بیٹھنے کی بجائے نیچے ان کے پاؤں میں بیٹھ گئی۔ ان  
 کے گھٹنوں کو تنہا سے پہلے تو کچھ دیر ان کے چہرے کو بہت غور سے دیکھتی رہی  
 پھر بہت ہولے سے بولی۔

”آپ کے گھر میں ایک ناخاندہ مہمان کے لئے جگہ ہوگی۔؟“  
 ”کیا مطلب۔؟“ وہ انتہائی پریشانی سے اس کی حرکات دیکھ رہی تھیں  
 ”مجھے آپ اپنے گھر لے چلے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔“ لالہ  
 جلتی لہجے میں کہنے لگی۔

”بیٹی! تم فکر کیوں کرتی ہو۔ تم اب یہاں تنہا نہیں ہوگی۔ تمہارے  
 ابا تمہارے پاس ہی رہیں گے۔“

”نہیں نہیں۔ میں ان کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔“  
 ”کیوں نہیں رہنا چاہتیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ وہ تم سے  
 بے حد پیار کریں گے۔“

”نہیں خالہ جان! انہیں۔ مجھے کسی کے پیار کی ضرورت نہیں  
 کسی کے بھی پیار کی اب ضرورت نہیں۔“

نہیں بیٹی! ایسے نہ کہو۔ والدین کے پیار کی تو اولاد کو سدا ضرورت  
 رہتی ہے۔“

”والدین ہی کے پیار کی نا۔؟ اور میرے والدین تو ختم ہو گئے

میں آنے کی اطلاع انہیں دینے کے لئے چلی گئیں۔ لالہ کی طرف سے بھی  
 بڑے متفکر تھے۔ آنکھیں ملنے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے ہی چلے آئے۔  
 لالہ ابھی تک باپ کی تصویر کے سامنے کھڑی تھی۔ ان کے پاؤں  
 کی چاپ نے بھی اس کی عمریت کو نہیں چھوڑا۔ سیمیں وہ بے قدموں سے  
 اس کے قریب چلی گئی۔ پیچھے سے گردن ہٹھا کر دیکھا۔ وہ رو رہی تھی  
 پوری تصویر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

سیمیں اس کے ہاتھ سے تصویر لیٹے ہی لگی تھی کہ لالہ نے اس کا فریم  
 کھولا۔ سیمیں بڑی حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی فریم کھول کر لالہ  
 نے باپ کی تصویر نکالی۔ بھر دھیرے سے کچھ بڑبڑائی اور۔ اسے  
 پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

”لالہ! لالہ!“ ماں کے غم نے کہیں اسے پاگل تو نہیں کر ڈالا تھا۔ سیمیں  
 چھٹی۔ رقیہ خانم بھی لپکیں  
 ”یہ کیا کر رہی ہو۔؟“ سیمیں نے اس کے ہاتھوں سے وہ ٹکڑے  
 چھین لئے۔

لالہ نے جیسے اس کی سنی ہی نہیں۔ بڑے گھبریلے لہجے میں بولی  
 ”یہ تصویر یہاں میں نے لگائی تھی مگر یہ تو مجھے اب ہی معلوم ہوا کہ میں آج  
 تک ایک لفظ انسان کی پرستش کرتی رہی ہوں۔ ایک غلط انسان کو  
 میں نے اپنا آئیڈیل بنائے رکھا۔“ پاگل ہی ہوں نا۔!“

اور پھر اس نے اسی جگہ ماں کی ایک چھوٹی مٹی فریم شدہ تصویر رکھ دی

خانم تو دراصل اس کا تھا اچھا۔۔۔ اساتذہ، دو ملک ملک کر رہے

ایک رات میں ہی دونوں کا انتقال ہو گیا۔ اب میرا دنیا میں کوئی نہیں  
رقیق خانم کے گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ سسکیاں بھر رہے تھے۔ سیمیں اور  
عاطف چپ چاپ پاس کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

”نہیں۔۔۔ خالہ جان! میں کیا کروں۔۔۔؟ آپ کہتی ہیں میں اپنے باپ  
کے پاس رہوں۔۔۔ اس کے پاس۔۔۔ جس نے مجھے جنم ضرور دیا تھا مگر پھر  
اپنے عیش کی خاطر اس نے میری پوری زندگی حرمیوں کے سپرد کر دی۔۔۔  
میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے بغیر کس  
تکلیف میں گزرا ہے۔“

دوسروں کے باپ اور اولاد کے لئے ان کے دلہانہ انداز دیکھتی تھی تو دل  
میں کیا کیا حسرتیں نہیں چلتی تھیں۔۔۔ جب بھی میری کوئی سہیلی امتحان میں  
کامیابی پر اپنے باپ سے انعام لیتی اور پھر میری نگاہوں سے بھی یہ سب گزرتا تو  
دل پر کیا کیا نہ صیبت جاتا۔۔۔“

اور پھر۔۔۔ جب باپ جیسا مضبوط و مستحکم حصار بیٹی کی حفاظت کو موجود  
نہیں تھا تو اس احساس نے مجھے ہر عرصہ جو اذیت پہنچائی وہ کچھ مجھے ہی معلوم  
ہے۔۔۔ کتنی محرومیاں مجھے ملی ہیں۔۔۔ یہ آپ سب کیا جانیں۔۔۔  
کیا جانیں۔۔۔

والدین اولاد کو محرومیاں نہیں دیا کرتے۔۔۔ وہ تو اولاد کے لئے  
تپتے ریگستانوں میں ٹھنڈا ٹھنڈا سایہ ہوتے ہیں۔ بے برگ و گیاہ صحراؤں  
میں ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ ہوتے ہیں۔ طوفانِ باد و باران میں پر سکون  
منازلہ گاہ ہوتے ہیں۔

دھیرا باپ نہیں۔۔۔ میں اس کے پاس نہیں رہوں گی۔۔۔ ”دورو  
کر لالہ کی بچکی بندھی جا رہی تھی۔“

”اور میں اس کے پاس رہ بھی کس طرح سکوں گی۔۔۔ جبکہ میرے کانوں  
میں اب بھی میری ماں کی سسکیاں گونجتی ہیں۔ جو اس شخص کی بے وفائی  
نے اُسے سوچنی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں، جب سب سو جاتے  
تھے تو وہ چپکے چپکے رویا کرتی تھی۔۔۔“

اس وقت میں نہیں جانتی تھی۔ بچکی تھی۔ نا سمجھ تھی۔ مگر اب  
مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ اُنسا اسے میرے باپ نے دیئے تھے۔ وہ  
سسکیاں میرے باپ کا دیا گیا تحفہ تھیں۔۔۔

پھر۔۔۔ میں وہ دن بھی نہیں بھلا سکتی۔ جب میری ماں اپنی اپانجی  
کے باوجود سارا سارا دن محنت کیا کرتی تھی۔ وہ میری بہتر زندگی کی خاطر  
اکثر راتیں جاگ جاگ کر گزارتی تھی۔۔۔ اور۔۔۔ جسے آپ میرا باپ کہتی  
ہیں۔۔۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ہم دونوں ہی کو اس کے سہارے کی ضرورت  
تھی، کسی اور کو بازوؤں میں لئے بیٹھا تھا۔

اور پھر۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس دن۔۔۔ جو میری ماں کی زندگی کا  
آخری دن تھا۔۔۔ وہ اس کے پاس آیا تھا۔ اور اس نے اس سے مجھے  
چھین لینے کو کہا تھا۔۔۔ مجھے چھین لینے کو۔۔۔ جو اس کی زندگی کی آخری  
اُس تھی۔۔۔ جو اس کے ناتواں جسم میں روح کا مقام حاصل کر چکی تھی۔۔۔  
اور اگر جسم سے روح جدا کر دی جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ایک لاش ہی  
نا۔۔۔ اور میری جیتی جاگتی ماں پر سچ بچ کی لاش بن گئی۔ وہ یہ صدمہ سہار

نرسکی۔ وہ مرگئی۔ وہ میری ماں کا قاتل بھی ہے۔ میں اپنی ماں کے قاتل کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی تو اس کی سرپرستی میں رہنا کس طرح گوارہ کروں گی۔

مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔  
 ”لیکن بیٹی! بھول انسان۔ یہ ہو چکی جاتی ہے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آجاتے۔ اسے بھولا نہیں سمجھتے۔ تم یہ دیکھو کہ اب وہ بچپتا رہا ہے۔“  
 ”مگر اب ان بچپتاؤں کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے تو جو خردیاں بنائیں مل گئیں۔ میری ماں زندگی کی تنہائیوں اور دل کی دیرانیوں کو گلے سے لگائے بسک بسک کر مرگئی۔ گھر ہی اجڑ گیا تو صبح کا بھولا واپس کہاں آئے گا۔“

نہیں میری بچی! تم یہ سب کچھ مت سوچو۔ ”رفیقہ خاتم بڑی جہانگیرہ خاتون تھیں۔ ان کے خیال میں اس کا باپ اکے پاس ہی رہنا مناسب تھا۔ انتہائی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے سمجھانے لگیں۔

”کچھ بھی ہو وہ تمہارا باپ ہے۔ اس کا تم پر حق ہے۔ دل کو دوسرے انداز میں سمجھانے کی کوشش کرو بیٹی! جہد بانی ہو کر مت سوچو۔“  
 ”آپ مجھے بس اتنا بتا دیجئے کہ کیا آپ مجھے اپنے گھر میں پناہ دے سکتی ہیں؟“  
 ”گھر میں پناہ کی کیا بات ہے۔ میرا سارا گھر تمہارا ہے۔ تم میرے پاس رہو۔ یہ میری عین خوش قسمتی ہوگی۔“ انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”مگر لالہ! تم یہ غلط سوچ رہی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ زمانہ بانی بنائے گا۔ میرے گھر میں جوان بیٹے ہیں۔ تمہاری بدنامی ہوگی اور مجھے اپنی محنت زیادہ تمہاری عزت پر بیٹھے۔“

”تو۔ تو۔“ لالہ نے انتہائی بے بسی سے رفیقہ خاتم، سیمیں اور پھر عاطف کی طرف دیکھا۔

”اس کا مطلب ہے مجھے کوئی اور انتظام کرنا ہوگا۔ شام سے پہلے پہلے بہر حال مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔ جس شخص نے میری ماں کی زندگی کے چمن میں خزاںیں اور ویرانیاں بکھیر دیں ہیں اس کی ہمارے کبھی نہیں بنوگی جس نے میرے بچپن کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو پا کال کر دیا اور جو میری جوانی کا محافظ نہ بنا اسے اب میں یہ خوشی بھی نہیں دوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔“  
 لالہ ایک پر عزم جوش کے عالم میں اٹھی۔

عاطف چپ چاپ ٹھٹھک رہا تھا۔ لالہ کی ایک ایک بات اس نے سنی تھی۔

اسے پرنسپل صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ اس کی نگاہ میں ان کے لئے بڑا احترام تھا مگر۔۔۔ لالہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ بھی غلط نہ تھا۔ اسے جو گھاؤ لگے تھے ان کا درد کچھ وہی جانتی تھی۔ دوسرے کسی کو اس کا احساس ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

عاطف نے سوچا۔ آخر ہر انسان کچھ عزت، کچھ خودداری اور انار رکھتا ہے۔ وہ اگر باپ کے پاس نہیں رہنا چاہتی، بھئی تو اسے مجبور نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ اگر اپنی خودداری کو قائم رکھنا چاہتی تھی تو دوسروں کو اسے مجبور



کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ پھر۔ پھر اس کی مدد کی کیا صورت ہو سکتی تھی۔ وہ اسے اپنے گھر لے جاتا۔ مگر ابھی ابھی ماں نے جو بات کہی تھی وہ بھی مناسب تھی۔ اس میں لالہ ہی کی رسوائی اور بدنامی تھی اور اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ صد کی بڑی بچی تھی۔ اس نے اکیلے ہی گھر سے نکل پڑنا تھا۔

خو نصورت اور جوان لڑکی۔! یہ دنیا انسان مٹا دینے والی ہے۔ اس کا تباہ ہو جانا یقینی تھا۔ اور۔ اور عاطف نے اسے کہا تھا کہ وہ اس کی عزت کا محافظ تھا۔ یوں بھی کیا وہ اسے ٹھوکرین کھانے کے لئے بے سہارا اور پئے بارود کا چھوڑ سکتا تھا۔ اسے جس کے لئے اس نے اپنے مستقبل کی بھی پروا نہیں کی تھی۔

لالہ اپنے کپڑے ایک چھوٹے سے بکس میں رکھ رہی تھی۔ رقیہ خانم اور سہیلی چھٹی چھٹی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ کس میں بھی اسے روک لینے کی بہت نہ تھی۔

عاطف آگے بڑھا۔ بہت ہولے سے لالہ کے کندھوں کو تھام لیا۔

”مٹھ کر جاؤ۔“

”کیوں؟“ اس کی کیوں کا جواب دینے کی بجائے ماں کی جانب دیکھا۔

”ای! یوں اسے اپنے گھر لے جاتے ہوئے آپ کو بدنامی اور رسوائی کا خوف ہے۔ ہو جانا کہے جانے میں کوئی خطرہ نہیں نا۔“

”بیٹا! اسے ہو جانے کا تو میں دل میں ارمان لئے بیٹھی ہوں۔“

”خوشی پھر ٹھیک ہے۔ ابھی ابھی۔ اپنے بیٹے کی شادی کا انتظام ۵۰ چمے۔ لالہ کی خواہش پوری ہو کر رہے گی۔“

”کیا؟“ سمیں کے چہرے پر حیرت ابھری۔ ”سچ مچ؟“

”ہاں۔“ عاطف بے حد سنجیدہ تھا۔ ”لیکن۔ لیکن۔“ لالہ سٹیٹائی۔

”بس اب تم کچھ نہیں بولو گی۔“ عاطف نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈالا۔

”امی! آپ تیار کیسیجئے۔ لالہ بہو بن کر ابھی آپ کے ساتھ آپ کے گھر جائے گی۔ ابھی۔“

اور یہ حکم صادر کرتے ہوئے عاطف تینوں کو ہٹا لیا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکلا۔

تینوں ایک دوسرے کو عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

ایک ایک سمیں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی۔ وہ ہنسکی۔ اور لالہ کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر بہت ہولے سے سرگوشی کی۔

”دیکھا۔ میرا بھائی ہے ناول کے اندر بسا لینے والی ہستی۔ بے باک بہادر اور۔ اور محفوظ ترین پناہ گاہ۔ چلو اور تمہیں اسکی دلہن بناؤں۔“

رحمہ اندر باہر مچا مچا گا پھر رہا تھا۔ سامان سیٹے سیٹے اس کی کمر کھنے لگی تھی۔ مگر وہ پھر بھی خوش تھا۔ آج اس نے اپنے مالک کے ہونٹوں پر بڑی خوبصورت سی مسکراہٹیں رقصاں دیکھی تھیں۔

دو دن گھر سے غائب رہنے کے بعد آج علی الصبح وہ اجانک ہی آگئے۔

تھے۔ خود بخود ہی۔۔۔ ورنہ اس نے کہاں کہاں انہیں نہیں ڈھونڈا تھا۔ کس کس طرح ان کے لئے پریشیاں نہیں ہوا تھا۔

پچھلے دو دن ایک لمحہ کے لئے بھی اس نے آرام نہیں کیا تھا اور اس وقت ساری رات جاں کران کا منتظر کرتے رہنے کے بعد وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ وہ ٹیکسی میں سے نکلے۔

جب سب سے پہلی اور اضطراب ان کی حرکات میں تھا۔ جلد جلد تیار ہوئے اور اسے سامان باندھنے کا کہہ کر خود کالج چلے گئے۔ اتنی چھٹیوں کے بعد گئے تھے مگر پھر بھی جلد ہی کام ناکر واپس آگئے۔

خواب گاہ کی سب چیزیں اسی طرح تھیں۔ البتہ باقی سارا سامان ان کی ہدایت کے مطابق رجموں نے باندھ چھوڑا تھا۔

وہاں کی چیزیں وہ خود سیٹنے لگے۔ دیواروں پر سے سب تصویریں انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اتاریں۔ رجموں نے اپنی خدمات پیش بھی کیں مگر وہ سب کچھ خود ہی کرنے پر مصر رہے۔ ساتھ ساتھ تصویریں اتارتے جاتے تھے اور رجموں سے باتیں کئے جاتے تھے۔ ایسی باتیں انہوں نے کبھی اس سے نہیں کی تھیں۔ جانے آج انھیں کیا ہو گیا تھا۔؟

”یہ میری بہو کی تصویر ہے۔ بڑی اچھی تھی۔ بے شک۔۔۔ بچہ محبت کرنے والی۔ مگر میں ہی اس کے قابل نہ تھا۔ اس لئے۔۔۔ وہ بہت دور چلی گئی۔“

رجموں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں کوئی انجانا سا دکھ تھا اور بہت سارے آنسو۔۔۔ جو انہوں نے اپنی دانست میں اس سے چھپا کر چپکے سے قمیض

کی آستین سے پونچھ لئے تھے۔

پھر دوسری تصویر اُٹا،

رمو یا یہ میری بیٹی ہے۔۔۔ بسنی پیاری ہے۔۔۔ وہ بڑی وارفتگی سے اسے دیکھ جاتا ہے تھے۔

”دو تین سال کی تھی جب میں نے اسے کھو دیا تھا۔ اب انیس بیس سال کی ہے۔ اچانک ہی مل گئی۔ اور اب تو۔۔۔ اب تو۔۔۔ اس پر نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ بہت بڑی ہو گئی ہے۔ بڑی پیاری ہے۔“

عجب دلغریب سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بکھری۔

”پچھلے دو دن میں نے اس کے پاس ہی گزارے ہیں۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ مجھے کیا محسوس ہوتا رہا۔۔۔ یہ اولاد نوالہ اللہ میاں کی بڑی انوکھی سی نعمت ہے۔ اسے دیکھ کر آنکھوں میں تو رساتر آتا ہے۔ دل میں عجیب سا سوز اور مسرت لہریں لینے لگتی ہے۔ ابھی تو میں نے اسے سینے سے نہیں لگایا۔ مجھے یقین ہے۔ اٹھارہ سال کی جدائی کے جو شطے میرے اندر بھڑک رہے ہیں۔ ایک دم ان میں ٹھنڈک پڑ جائے گی۔ جلدی کرو رجمو۔۔۔“

پھر وہ جلد جلد صندوق میں اپنے کپڑے رکھنے لگے۔ ایک بکس مسہری کے نیچے پڑا تھا۔ رجموں نے باہر کھینچا۔

”اس میں کیا ہے مالک۔۔۔؟“

وہ بڑے عجیب انداز میں مسکراتے اور پھر جیب سے چابی نکال کر اسے کھولا۔ اس میں میری بیٹی کی چیزیں ہیں۔ یہ دیکھو۔۔۔ وہ رجمو کو دکھانے

لگے۔۔۔ بڑے چاؤ سے۔۔۔ بڑی خوشی سے۔۔۔ ایک ایک چیز۔۔۔  
 کچھ کپڑے تھے۔۔۔ سٹے سٹائے۔۔۔ پہننے کے لئے تیار۔۔۔ تین چار بڑی  
 خوبصورت ساڑھیاں تھیں۔۔۔ کچھ زیورات تھے۔۔۔ سونے کے۔۔۔ کچھ چاندی  
 کے۔۔۔ یہی خوبصورت۔۔۔ پہلے حد نفیس۔۔۔

یہ سب کچھ میں بڑے عرصے سے اکٹھا کر رہا ہوں۔ جب بھی کوئی اچھی  
 چیز دکھائی دے گی۔۔۔ میں نے لے کر رکھ لی۔۔۔ وہ مجھ سے دور بے شک  
 جتنی تکر میری نگاہ میں ہمیشہ رہی۔۔۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے تصورات  
 میں وہ اسی طرح بڑھتی رہی۔۔۔ میرے تصور میں اس کا قہقہہ تھا۔۔۔ یقین  
 کرو جو وہ اتنی ہی لمبی ہے۔۔۔ سب کپڑے اسے بالکل پورے آئیں گے۔  
 اور ہر ساڑھیاں۔۔۔

یکلخت ہی ان کے ہاتھ کانپ گئے۔۔۔ جاتے کیا بات تھی۔۔۔ نگاہ  
 جھکانے سے جلدی سے آدھ بھر کر بولے۔۔۔  
 اب تو یہ بھی وہی پہنے گی۔۔۔ وہی پہنے گی۔۔۔ رجوان کی طرت ہی دیکھ  
 رہا تھا اس سے نگاہ ملی تو سپٹا کر جلدی سے بات کا موضوع بدل ڈالا۔۔۔

اس کی شادی ہونے والی ہے نا۔۔۔ یہ خود اپنے ہاتھوں سے اسے دواغ  
 لڑنے کے اس کی شادی کروں گا۔۔۔ آہ! کتنی خوش ہو گیا۔۔۔  
 اب ان کے چہرے پر مسرتوں کے عکس تھے۔  
 جانتے ہو جو کس کے ساتھ اس کی شادی کروں گا۔۔۔

اپنے عارف کے ساتھ۔۔۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔۔۔ خدا سے سدا نیک راہ پر  
 چلائے۔۔۔ سدا نیک راہ پر۔۔۔

پھر جلد جلد سب کچھ سمیٹ کر یکس میں رکھنے لگے۔۔۔ شام ہونے والی تھی۔۔۔  
 انہیں اب تک اس کے پاس پہنچ جانا چاہئے تھا۔۔۔ رجوان کو ٹیکسی لانے کیلئے بھیجا۔  
 ٹیکسی جلد ہی آگئی۔۔۔ مگر ان کی بے قراری یہ کہہ رہی تھی کہ بڑی دیر کر دی۔  
 سارا راستہ اسے رفتار تیز، نیز اور تیز کرنے کے لئے کہتے رہے۔  
 اور پھر۔۔۔ ان کی منزل آگئی۔۔۔ دور سے ہی اشارہ کر کے رجوان کو بتانے  
 لگے۔۔۔ وافر جذبات سے ہاتھ پکپکا رہے تھے اور زبان میں لکنت سی تھی۔  
 ساتھ ہی ہونٹوں پر مسکراہٹیں بھی بکھر رہی تھیں۔

ٹیکسی رکی۔۔۔ جلدی سے باہر نکلے۔۔۔ رجوان نے سامان اُتارا۔۔۔ لرزتے ہاتھوں  
 سے جلد جلد کرایہ ادا کیا۔۔۔ پانچ کا نوٹ نکھا۔۔۔ اس سے باقی پیسے بھی نہیں  
 "ارے! یہاں تو نالا لگا ہوا ہے۔۔۔ کہیں غلط جگہ تو نہیں آگئے۔۔۔" رجوان  
 آواز پر انہوں نے چونک کر دیکھا۔

دل کی دھڑکنیں ایک دم سے ہی ختم گئیں۔۔۔ "نہیں نہیں۔۔۔ یہی  
 ہے میری چچی کا گھر۔۔۔ میری منزل۔۔۔" وہ حیرت سے بڑبڑاتے۔  
 ہاں گئے سب۔۔۔

قریب ہی ساتھ والے گھر کے سامنے کچھ بچے کھیل رہے تھے۔۔۔ رجوان نے اشارہ کر  
 لے ان کو پاس بلایا۔

"اس گھر کے لوگ کہاں گئے۔۔۔"

انہوں نے بڑی بے قراری سے پوچھا۔۔۔ ایک معصوم سے بچے نے مسکراتے  
 ہوئے کہا۔۔۔  
 "وہ اپنے سران چلی گئیں۔۔۔"

دوسرا ذرا اس سے بڑا بچہ بولا —

”آج ہی ان کی شادی ہو گئی — میری امی آئی تھیں — کہتی تھیں وہ دلہن بنی بڑی اچھی لگ رہی تھیں اور ان کا دولہا تو میں نے خود دیکھا تھا — وہ بھی بڑا اچھا ہے“ —

وہ لڑکھڑاتے — رہو تے انہیں سہارا دیا —

”نہیں تو میں نے اپنے ہاتھوں سے وداع کرنا تھا مہیسی بچی —! اوہ! مجھے یہ مسرت بھی نہ ملی — عائدتہ! عائدتہ! میں نے تمہارا سکون چھینا تھا اور خود ساری زندگی کے لئے — ساری زندگی کے لئے — ماتے! میں کن ویرانیوں اور تنہائیوں کو گئے لگا بیٹھا“ —

جانے اور کیا کیا وہ ہونٹوں میں بڑبڑاتے رہے — ان کی آنکھوں میں آنسو تھے — اور پھر — جھکے سر اور جھکی جھکی کمر سے وہ اپنی ہی حیات کے بیا بانوں میں لوٹ گئے۔